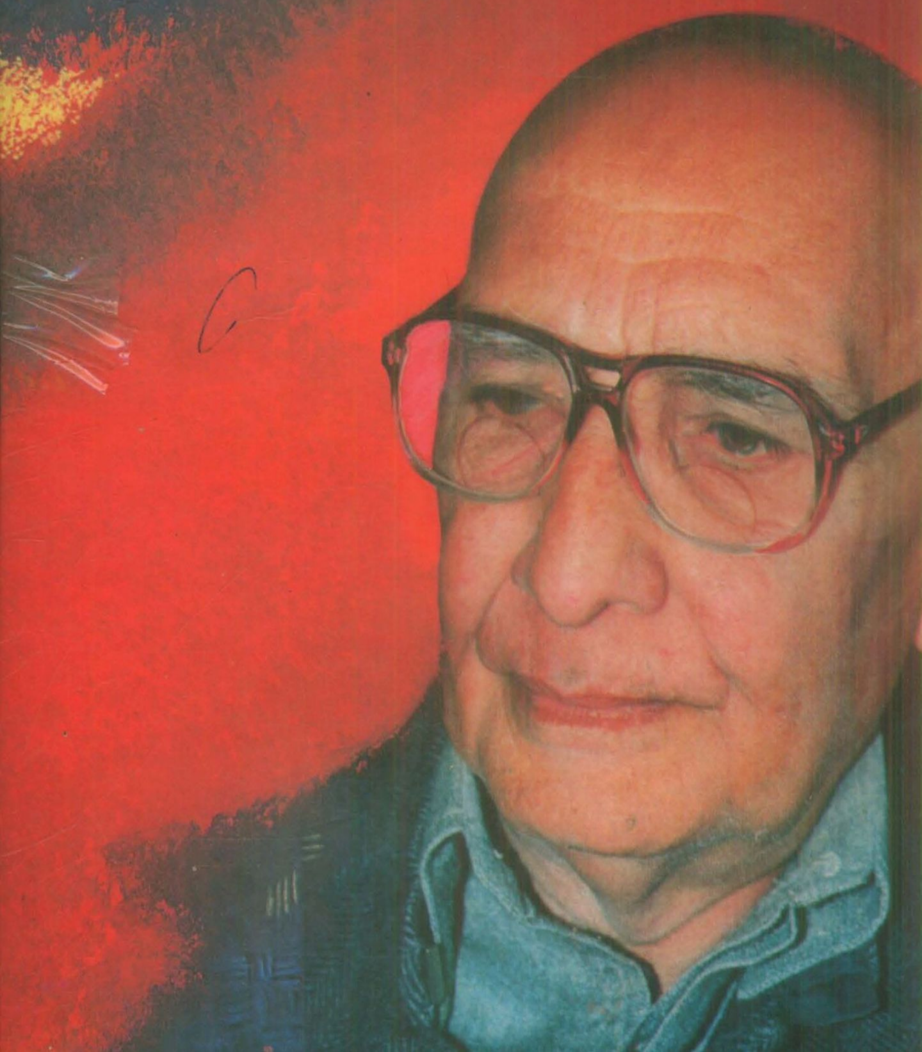
پرانی محفلیں یاد آ رہی ہیں

(آپ بیتی)

عبداللہ ملک



پرانی محفلیں یاد آ رہی ہیں

مصنف

عبداللہ ملک



تخلیقات

علی پلازہ، 3- مزنگ روڈ لاہور، فون: 7238014

E-mail: takhleeqat@yahoo.com



ناشر	تخلیقات' لاہور
اہتمام	لیاقت علی
اشاعت دوم	ستمبر 2002
کمپوزنگ	آزاد کمپوزنگ سنٹر
مطبع	حاجی حنیف پرنٹرز
سرورق	آغا نثار
قیمت	250روپے

اپنے بیٹوں : ڈاکٹر کوثر عبداللہ ملک، ڈاکٹر سرمد عبداللہ ملک

اپنی بہوؤں : تسنیم کوثر ملک، عائشہ سرمد ملک

اپنے پوتوں : عمر ملک، سمیر ملک، جنید ملک اور پوتی میرا (مہرالنساء)

کے نام

فہرست

باب 2

باب 3

باب 7

باب 8

باب 9

باب 10

باب 11



ابتدائیہ

میری داستان زیست کی یہ ایک جلد آپ کے ہاتھ میں ہے جو 1920ء سے 1947ء تک کے دور پر محیط ہے۔

ویسے تو یہ کل ستائیس برس کی داستان ہے لیکن سچ ہے کہ یہ کہانی ایک بحر بیکراں کی ہے' جو اپنے اندر ہزار ہا مدوجزر لیے ہوئے ہے۔

میری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہروماہ وانجم
میری پستیوں سے خائف کبھی اوج خسروانہ

جذبی

میں نے یہ ستائیس برس بھرپور طور پر گزارے اور علمائے دین سے بے پناہ شیفتگی اور عقیدتوں کے جلو میں مجلس احرار کے قائدین کی شعلہ بیانیوں کا اسیر ہوا اور پھر انہی شعلہ بیانیوں اور 1930ء اور اکتیس کے عالم گیر اقتصادی بحران نے بھی متاثر کرنا شروع کیا' چنانچہ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پہنچا تو اس وقت جواہر لال نہرو کے سوشلزم کے نعروں اور غریبوں کی مسیحائی اور پھر کمیونسٹ طلباء کا سیاست کے میدان میں نمودار ہونے سے لے کر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونا اور پھر کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بن کر زندگی کے ایک بالکل ہی نئے اسلوب کا تجربہ' یہ سب کچھ ان صفحات میں آپ کو ملے گا اور ساتھ ہی اپنے دور کے نامور ادیبوں اور صحافیوں کی محبتوں کا ذکر بھی

دل عجب شہر تھا خیالوں کا
لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

اب میں اکیاسی برس کا ہو گیا ہوں' تو یہ کہتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی تمام عمر ایک آدرش اور ایک Comitment کے ساتھ گزاری ہے اور آج بھی میں اس آدرش کو سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ یہ آدرش ہے ایک جمہوری' سوشلسٹ پاکستان کا' یہ آدرش نہ کسی مذہب کی' نہ کسی دین کی نفی ہے' نہ خدا سے بغاوت ہے بلکہ یہ تمام انسانوں سے محبت کا پیغام ہے۔ یہ محبت تمام مذاہب' تمام ادیان اور تمام مسالک سے ماوراء انسان سے محبت ہے اور آرا و افکار میں اختلاف جمہوریت کا تقاضا ہے۔

آپ کا سودائی ہے' کافر ہو یا دیندار ہو
بات اتنی ہے اب اس کا جس قدر طومار ہو

بے تاب عظیم آبادی

ستائیس برس کی یہ داستان جو ایک پورے دور کی کہانی ہے۔ اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت میں شروع میں ہی کر دینا چاہتا ہوں' اولاً یہ تاریخ نہیں ہے' یہ میری یادداشتیں ہیں۔ یہ واقعات کی تفصیل نہیں بلکہ ان واقعات کے بارے میں اشارے ہیں۔ میں جب ان اوراق کو ایک دور کی داستان کہتا ہوں تو یہ داستان بھی اس دور کی فقط جھلکیاں ہیں اور یہ بات یاد رہے کہ ان یادداشتوں کا ماخذ میری ڈائریاں اور اس دور کے کاغذات و دستاویزات ہیں جن کو میں سنبھال پایا' کنول مشتاق کا کریڈٹ یہ ہے کہ اس نے میری اکیاسی برس پر محیط زندگی کے بارے میں ان جمع شدہ دستاویزات' خطوط اور ڈائریوں کو ڈھونڈ نکالا اور ان کو ترتیب سے یکجا کر کے مجھے اس قابل بنایا کہ میں دور کی کڑیاں جوڑ کر یہ کہانی بیان کر سکوں۔ اس لیے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کنول مشتاق کا قرض میں کبھی چکا نہیں پاؤں گا' اللہ تعالیٰ اُس کو جزا دے' سو سچ یہ ہے بقول شاد عظیم آبادی'

سنی حکایت ہستی تو درمیان سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

عبداللہ ملک
134- ٹیپو بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور
فون: 5833112,5883534
HOTMAIL.amalik@HOTMAIL.COM

باب 1

فصیل شہر لاہور

میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری برسوں میں یعنی 10 اکتوبر 1920ء کو لاہور کے کوچہ چابکسواراں میں پیدا ہوا۔ میرا نام محمد عبداللہ رکھا گیا۔

کوچہ چابکسواراں فصیل شہر کے وسط میں واقع ہے۔ جب میرے شعور نے آنکھیں کھولیں تو کوچہ چابکسواراں ہو یا اس کے اردگرد کی گلیاں محلے، کوچے اور بازار، یہاں کی مسجدیں، تکیے اور حمام، یہ سب حویلی میاں خان کا حصہ تھے۔

حویلی میاں خان

حویلی میاں خان کی بنیاد عہد شاہجہانی میں ان کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان نے رکھی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب میاں خان حاکم لاہور نے اسے عہدِ عالمگیری میں مکمل کیا۔ یہ وسیع و عریض عالیشان حویلی جو میلوں پھیلی ہوئی تھی اس کے تین حصے تھے۔ "پہلا زنان خانہ، دوسرا مردان خانہ جو رنگ محل کہلاتا تھا اور پھر تیسرا قلعی خانہ جس کی دیواریں مسجد چینیاں والی کو چھوتی تھیں۔"

محلہ چابکسواراں نے اتنے نشیب و فراز دیکھے، یہاں ایسی ایسی قد آور ہستیوں نے جنم لیا اور اس محلے کے گلی کوچوں سے اہم تحریکیں اٹھیں، جنہوں نے لاہور کے سیاسی، ثقافتی مزاج پر گہرے نقوش مرتب کیے، اگر ان کا تفصیل کے ساتھ تاریخی حوالوں سے ذکر نہ کیا جائے تو بے ادبی ہوگی اور ناانصافی بھی، اپنے آباء و اجداد کے ذکر سے پہلے میں قدیم لاہور کے اس قدیم محلے کے قدیم آثار کی بات کرنا چاہوں گا۔

مسجد چینیاں والی

مسجد چینیاں والی کی بنیاد فوجدار سرافراز خان نے حویلی میاں خان سے منسلک اپنی رہائش گاہ کے ایک حصے پر رکھی۔ سرافراز خان عہد شاہجہانی میں ولی عہد شہزادہ داراشکوہ کا دست راست تھا۔ داراشکوہ نے اسے صوبہ لاہور کی فوجداری سونپ کر پانچ ہزاری کا منصب دے رکھا تھا۔ شاہجہان کی بیماری اور پیرانہ سالی کے پیش نظر شہزادہ اورنگ زیب نے اپنے باپ کو تخت و تاج سے محروم کر کے انہیں آگرہ میں نظربند کر دیا اور خود عالمگیر کے لقب سے ہندوستان کا شہنشاہ بنا تو سرافراز خان کے متعلق مخبری ہوئی کہ وہ داراشکوہ کا جاں نثار ہے لیکن ابھی تک اس کی فوجداری اور منصب داری برقرار ہے۔ درپردہ وہ آپ کی جان اور مال کا دشمن ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے فوراً سرافراز خان کو عہدے سے موقوف کرنے اور اس کی جائیداد کی ضبطی کا شاہی فرمان جاری کیا۔ لاہور کے صوبیدار تک اس شاہی فرمان کے پہنچنے سے پہلے سرافراز خان کو اطلاع مل چکی تھی۔ اس لیے اس نے فوراً اپنی تمام غیر منقولہ جائیداد مسجد کے لیے وقف کر کے اپنی حویلی کو گرا کر مسجد کی بنیاد رکھ دی اور اس کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کشمیر جانے کے لیے جب لاہور ٹھہرے اور انہیں سرافراز خان کے اس عمل کا علم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے نہ صرف سرافراز خان کو اپنے عہدے اور منصب پر بحال کیا بلکہ مسجد کے لیے وقف کی گئی غیر منقولہ جائیداد کے عوض بعض امراء کی حویلیوں اور محلات کے گرانے سے حاصل کی گئی زمینوں اور جائیدادوں میں سے بھی حصہ دینے کا حکم دیا۔ اس طرح فوجدار سرافراز خان نے نہایت توجہ اور کثیر رقم سے اس مسجد کو تعمیر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ عہدِ عالمگیری میں بننے والی یہ مسجد شاہجہان کے عہد میں لاہور کے صوبیدار نواب وزیر خان کی مسجد کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ مسجد چینیاں والی کانسی کاری اور منقش کاری کا شاہکار تھی۔ تمام فرش سنگ مرمر سے مُرصع تھے۔ مسجد کے مرکزی دروازے کی پیشانی پر شعر تحریر تھا:

طرفہ معمار خرد تاریخ سال
گفت زیبا مسجد از سرافراز

کوچہ چابکسواراں میں کٹڑی عزیزالدین تھی جس کا ایک راستہ مسجد چینیاں والی کے قریب سے گزرتا تھا۔ یہاں نواب میاں خاں کا حمام تھا جو ترکی حماموں کی طرز پر مغلیہ عہد میں بنایا گیا تھا۔ اس وقت عمارت بڑی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ لاہور پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد اندرون شہر لاہور میں سب سے پہلے پادری فارمسن نے یہاں مشن اسکول قائم کیا جس نے بعد میں رنگ محل مشن سکول کے نام پر شہرت حاصل کی۔ اس کے متصل مسجد محمد حفیظ چابکسوار تھی۔ چونکہ مسجد محمد حفیظ چابکسوار بھی حویلی میاں خان کے اس حصہ میں واقع تھی اس لیے وہ مسجد بھی بعد میں مسجد رنگ محل کہلوانے لگی۔

کوچہ چابکسواراں

کوچہ چابکسواراں بالخصوص چابکسوار خاندان پر مشتمل تھا جو پیشہ کے لحاظ سے گھوڑوں کے دلال کہلواتے تھے۔ ان چابکسواروں کا تعلق ککے زئی قبیلے سے تھا جو افغانستانی پٹھانوں کی ایک شاخ ہے۔

کوچہ چابکسواراں اور کوچہ ککے زئیاں--- ان کا تہذیبی تشخص اگرچہ قدرے الگ الگ رہا لیکن چابکسواروں اور ککے زئیوں کے خاندانی رشتے ناتے ہمیشہ سے گہرے اور مضبوط ہیں۔ کوچہ چابکسواراں میں آسودہ حال چابکسوار رہتے تھے۔ کیونکہ چابکسواری یعنی گھوڑوں کی دلالی ایک منافع بخش کاروبار تھا تو دوسری طرف اس پیشے سے منسلک لوگ راجوں مہاراجوں بلکہ شہنشاہوں تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکتے تھے جیسا کہ حفیظ چابکسوار مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں بااختیار سندھانوالیہ سرداروں کے ذاتی چابکسوار تھے۔ کوچہ چابکسواراں کی بنیاد ایران کے شہنشاہ نادر شاہ کے ہندوستان پر حملوں کے بعد پڑی۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد دربار میں ایرانی اور تورانی یعنی شیعہ اور سنی امراء کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے صدیوں پر محیط مغلیہ سلطنت کو دنوں میں زوال کے قریب تر کر دیا۔ کہا جاتا ہے جب دربار دہلی پر

تورانی وزیر اعلیٰ قمرالدین' جو بادشاہ محمد شاہ کا رشتہ دار تھا' تخت نشین تھا تو ایرانی امیر برہان الملک کے ارشاد پر ایران کے شہنشاہ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

نادر شاہ کے حملے کے پیش نظر جب لاہور کے صوبیدار نواب ذکریا خان نے "دربار دہلی" سے رجوع کیا تو انہیں زبردست مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مقدور بھر فوج کے ساتھ دفاعی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ نادر شاہ کے ایک ہی ہلے کے بعد نواب ذکریا خان نے محسوس کر لیا کہ وہ زیادہ دیر یہ جنگ جاری نہ رکھ سکیں گے اس لیے نواب نے ہتھیار ڈال کر جان کی امان پانے کی درخواست کی۔ نادر شاہ نے بیس لاکھ روپے کے تاوان کے بدلے نہ صرف نواب ذکریا خان کو صوبیدار لاہور کے عہدے پر بحال رکھا بلکہ ان کے دونوں بیٹوں یحییٰ خان اور حیات اللہ خان کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ نادر شاہ نے لاہور میں اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا جس کی ایک سمت "نادر السلطان" اور دوسری سمت "ضرب دارالسلطنت لاہور 1151 ہجری خلد اللہ ملکہ" کندہ کیا۔ لاہور سے فارغ ہو کر نادر شاہ اپنے لشکر جرار کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا' کرنال میں شہنشاہ دہلی محمد شاہ نے تین لاکھ پیدل اور گھوڑ سوار فوج' دو ہزار ہاتھیوں کے علاوہ بھاری توپ خانے کے ساتھ اس کا راستہ روکا' اس لڑائی میں دس ہزار ہندوستانیوں کے مقابل ڈھائی ہزار ایرانی ہلاک ہوئے۔ ایرانی سپاہی آسانی سے دہلی شہر میں داخل ہو گئے' یکدم نادر شاہ کے قتل کی افواہ شہر میں پھیل گئی جس پر تین ہزار ایرانی بے موت مارے گئے' اس پر نادر شاہ نے غصہ سے آگ بگولا ہو کر دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا جس کے نتیجے میں بیس ہزار باشندوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ نادر شاہ نے دہلی میں ایک بڑا دربار منعقد کر کے زرنقد کے علاوہ ہیرے موتی جواہرات کے ساتھ کوہ نور ہیرا' اور تخت طاؤس کے بدلے محمد شاہ کو ہندوستان کا تاج و تخت لوٹا دیا۔

دہلی سے واپسی پر بھی نادر شاہ نے اپنے نادر شاہی حکم کے ذریعے نواب ذکریا خان سے ایک کروڑ روپے ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ نواب نے عمائدین شہر کو بلا کر نادر شاہ کی اس زر طلبی کے متعلق بتایا' شہر کو تباہی اور بربادی سے بچانے کے لیے مجبوراً انہیں ایک کروڑ روپے کا بندوبست کرنا پڑا۔ حیات اللہ خان جو اس وقت ملتان کا حاکم تھا اس نے بھی اپنی طرف سے پانچ لاکھ روپے نادر شاہ کے حضور نذرانے کے طور پر پیش کیے اور

نادر شاہ نے حیات اللہ خان کو "شاہنواز خان" کا خطاب دیا۔

نادر شاہ کی ہندوستان سے واپسی پر ذکریا خان نے پھر سے پنجاب میں تنظیم نو کا کام شروع کیا' خاص کر سکھوں کو متعدد جگہوں سے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتارا تو سکھ باری دوآبہ (راوی اور بیاس) سے نکل کر بست دوآبہ (بیاس اور ستلج) میں چلے گئے جہاں جاٹوں کی اکثریت تھی۔ سکھوں کی سرکوبی کے لیے نواب ذکریا خان نے آدینہ بیگ کو بست دوآبہ کا فوجدار مقرر کیا۔

ذکریا خان کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا یحییٰ خان لاہور کا ناظم بنا تو اسکے چھوٹے بھائی شاہنواز خان میں اقتدار کی ہوس جاگی' یہاں تک کہ یحییٰ خان کے انتہائی معتمد اور اہم امراء آدینہ بیگ اور کوڑامل بھی شاہنواز کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح جب شاہنواز خان لاہور پر قابض ہوا تو انہوں نے کوڑامل کو دیوان اور آدینہ بیگ کو بست دوآبہ کا صوبیدار بنادیا۔

شاہنواز خان نے مسجد چینیاں والی کے ساتھ فیل خانہ اور آدینہ بیگ نے رہائش کے لیے ایک عالیشان حویلی تعمیر کی۔ ان دنوں عبدالرحیم خان گگے زئی اور آدینہ بیگ کے درمیان دوستی اور وفاشعاری کا آغاز ہوا۔ شاہنواز نے جس مکاری اور ہوشیاری سے لاہور پر قبضہ کیا تھا' اس سے اسے ایک طرف تو دربار دہلی کا دھڑکا لگا ہوا تھا' تو دوسری جانب شہنشاہ ایران نادر شاہ کا کھٹکا۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ صرف تین ماہ کے بعد نادر شاہ اپنے ایک سپاہی کے ہاتھوں قتل ہوگیا' تو احمد شاہ ابدالی نے افغان پٹھانوں کو اکٹھا کر کے قندھار پر قبضہ کر کے سلطنت افغانستان کا اعلان کرتے ہوئے اپنے لیے بادشاہ دوراں کا لقب پسند کیا۔

شاہنواز نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تو وہ فوراً کابل سے ہوتا ہوا پشاور پہنچ گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی اس نقل و حرکت کے پیش نظر "دربار دہلی" نے شاہنواز کی لاہور پر حاکیت کو تسلیم کرلیا' تو شاہنواز نے دربار دہلی کی طرف سے سکھ کا سانس لیتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کو مزید پیش قدمی روکنے کی درخواست کی۔ لیکن احمد شاہ ابدالی نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ افغان فوج نے راستے میں لوٹ مار اور تاخت و تاراج کا بازار گرم رکھا۔ آخر اس لشکر افغاناں نے قلعہ رہتاس پر قبضہ کر

کے چند روز کے لیے پڑاؤ ڈال دیا اور سودھرہ کے مقام پر دریائے چناب عبور کر کے شاہدرہ پہنچا اور مقبرہ جہانگیر کے احاطے میں خیمہ زن ہوا' اور پھر دریائے راوی کو عبور کر کے شالیمار باغ کا رخ کیا۔ شاہنواز نے قصور کے ممتاز سردار جملہ خان کو مقابلے کے لیے بھیجا لیکن وہ اپنے تمام سپاہیوں کے ہمراہ احمد شاہ ابدالی سے مل گیا۔ ابدالی کے گھوڑ سوار دستوں اور لاہوری فوج کے قزلباشوں کے درمیان معرکے ہوئے۔ آدینہ بیگ نے صرف تماشائی کا کردار ادا کیا۔ شاہنواز فرار ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ دن اہل لاہور پر بہت بھاری تھا۔ لاہور سے احمد شاہ ابدالی کو بے پناہ مال غنیمت حاصل ہوا۔ خراج کے علاوہ ناظم اور امراء کے خزانوں اور جائیدادوں پر ہاتھ صاف کیا اور لاہور کے دارالضرب میں اپنے نام کا یہ سکہ ڈھالا:

دردران احمد شاہ بادشاہ--- ضرب دارالسلطنت لاہور--- جلوس میمنت مانوس!

احمد شاہ ابدالی نے جملہ خان کو لاہور کا سربراہ اور مومن خان کو نائب اور لکھپت رائے کو دیوان مقرر کیا اور دہلی کا رُخ کیا۔

شہزادہ احمد شاہ اور وزیراعلیٰ قمرالدین دو لاکھ شاہی فوج کے ساتھ سرہند کے میدان میں صف آراء ہوئے۔ وزیراعلیٰ قمرالدین توپ کے گولے کی زد میں آکر مارا گیا لیکن اس کے بیٹے معین الملک نے احمد شاہ ابدالی کو میدان جنگ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ شاہی فوج نے بھی اس کا تعاقب نہیں کیا۔ اس طرح احمد شاہ ابدالی نے لاہور میں اپنا تمام مال و اسباب لے کر افغانستان کی راہ لی۔

دربار دہلی کے شاہی فرمان کے مطابق معین الملک پنجاب کا ناظم بنا تو اس نے "میرمنو" کا لقب اختیار کیا۔ چند دنوں بعد دربار دہلی کی طرف سے قصور کے سید بھکاری خان کو اس کا نائب مقرر کیا گیا۔ افتاد یہ پڑی کہ شاہ دہلی محمد شاہ کے انتقال کے بعد شہزادہ احمد شاہ تخت نشین ہوا تو اس کے وزیراعلیٰ صفدر جنگ بنے۔ صفدر جنگ کی قمرالدین سے پرانی رقابت تھی۔ اس طرح ایک نئی صورتحال نے جنم لیا۔

اب اس نے قمرالدین کے بیٹے معین الملک ناظم پنجاب کو انتقام کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ دراصل وہ معین الملک کی قابلیت اور بہادری سے ہراساں تھا۔ پنجاب میں سکھ بھی سرکشی پر مائل تھے۔ احمد شاہ ابدالی بھی جو معین الملک کے ہاتھوں شکست کھا چکا

تھا' بدلہ لینے کے لیے کابل میں تیار بیٹھا تھا۔ جونہی اسے پشاور اور نواحی علاقے کے قبائل کی حمایت حاصل ہوئی' اس نے لاہور کا رخ کیا۔ معین الملک کو افغان فوج کی اطلاع ملی تو وہ زبردست دفاعی تیاریوں کے ساتھ دریائے چناب کے کنارے سودھرہ کے مقام پر پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی دہلی دربار کو فوری کمک ارسال کرنے کو لکھا لیکن "دربار دہلی" کی طرف سے خاموشی اختیار کی گئی۔ دونوں فوجیں معمولی جھڑپوں تک محدود رہیں۔ کوئی فیصلہ کن معرکہ نہ ہوا کیونکہ احمد شاہ ابدالی نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا تھا۔ ایک حصہ اپنے زیرکمان تھا کہ معین الملک کو جنگ میں مصروف رکھے۔ دوسرے حصے کے سردار جہان خان کو حکم دیا کہ وہ لاہور کے گردونواح کو تباہ و برباد کردے۔ اس طرح جہان خان نے آگ اور لوہے کا وہ کھیل کھیلا کہ سارا علاقہ خاکستر ہوگیا۔ دو ماہ تک یہ تباہی اور غارت گری ہوتی رہی لیکن شہر پر قبضے کی سب کوششیں ناکام رہیں۔ یہ دیکھ کر دو ماہ کے بعد احمد شاہ ابدالی بھی سپہ سالار جہان خان کے ساتھ آملا۔ دربار دہلی کو پل پل کی خبر تھی۔ لیکن صفدر جنگ پرامن رہا۔ آخر معین الملک احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مشروط صلح کے لیے درخواست گزار ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے مطالبے پر چار محالہ' پسرور' گجرات' سیالکوٹ اور اورنگ آباد کا سالانہ محصول جو تقریباً چودہ لاکھ بنتا تھا' ادا کرنا طے پایا۔ یہ فتح یابی احمد شاہ ابدالی کی انا کی تسکین کے لیے بہت تھی' اس لیے اس نے فوراً افغانستان کی راہ لی۔

مولانا شہریار

معین الملک کے عہد حکومت میں مسجد چینیاں والی میں مولانا شہریار نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا جہاں پر پنجاب ہی نہیں ہند اور سندھ کے طالبان علم شرکت کرتے تھے۔ مولانا شہریار کے شاگرد مولانا محمد صدیق مسجد وزیر خان میں درس دیا کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے عید کی نماز مسجد وزیر خان میں ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی' چنانچہ امراء' وزراء اور علماء کے علاوہ معززین شہر جوق در جوق نماز میں شریک ہوئے۔ نماز کے بعد مولانا محمد صدیق نے خطبہ پڑھنا شروع کیا تو خطبے کے دوران احمد شاہ ابدالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے "سلطان العادل" کہا۔

خطبے اور عید ملن کے بعد جب مولانا شہریار سے کہا گیا کہ آپ کے شاگرد نے محض خوشامد کی خاطر احمد شاہ ابدالی کو "عادل سلطان" کہا ہے حالانکہ افغانوں کے ظلم و ستم سے سارا شہر نالاں ہے' تو مولانا شہریار اپنے شاگرد کی طرف بڑھے جو اس وقت احمد شاہ ابدالی کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ یہ دیکھ کر مولانا احتراماً اپنے استاد کی طرف بڑھے اور ہاتھ چومے۔

احمد شاہ ابدالی نے پوچھا۔

"یہ مولانا کون ہیں؟"

"استاد محترم شہریار!"

مولانا شہریار کی شہرت سے احمد شاہ ابدلی واقف تھے' اس لیے فوراً آداب و تسلیمات بجالائے۔ لیکن مولانا شہریار نے شاگرد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کون سا ظلم ہے جو افغانوں نے اس شہر پر روا نہیں رکھا۔ انہوں نے تو جبر و تشدد کی انتہا کر دی ہے۔ کئی بار ان سے فریاد کی گئی لیکن انہوں نے کوئی بھی تدارک نہ کیا۔ نہ سپاہیوں نے ہاتھ روکا اور نہ سرداروں اور نہ عہدیداروں کی سرزنش کی گئی۔ اسلام ایسے بادشاہ کو "عادل" کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

مولانا شہریار کی اس گفتگو سے گرد و پیش کھڑے سب لوگ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے مولانا کو خاموش کرنا چاہا مگر آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ آخر احمد شاہ ابدالی نے کہا۔

"حضرت آپ کو معلوم ہے آپ کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں' میں خوب جانتا ہوں' میرا مخاطب احمد شاہ ابدالی ہے۔"

"پھر ایسی گفتگو کے انجام کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"کیا؟"

"شہادت یا جلاوطنی!"

"تو پھر؟"

"میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔"

یہ سنتے ہی احمد شاہ ابدالی نے طیش میں آ کر مولانا کو جلاوطنی کا حکم دے دیا' چنانچہ آپ دوآبہ بست میں چلے گئے جہاں آدینہ بیگ صوبیدار تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے لاہور سے لوٹنے کے بعد معین الملک المعروف میر منو کے خلاف صفدر جنگ نے نئی جنگ کا آغاز کیا۔ ایک طرف تو انہوں نے بادشاہ سلامت سے یہ کہا کہ چار محالہ کا معاہدہ دربار دہلی کی منظوری کے بغیر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے شاہنواز خان کو ملتان کا گورنر نامزد کر کے بھیجا' لیکن معین الملک کی ایما پر ملتان کے ناظم کوڑامل نے شاہنواز خان کو نہ صرف شکست دی بلکہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل بھی کر دیا۔ مغلیہ مرکزی حکومت کے پاس اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ وہ معین الملک سے اس قتل کی باز پرس بھی کرتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معین الملک کی مشاورت میں بھکاری خان' کوڑامل اور آدینہ بیگ ایسے امراء شامل تھے۔

مسلمان حملہ آوروں کے علاوہ سکھوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کی گوریلا جنگ شروع کر رکھی تھی۔ میر منو نے سکھوں کی سرکوبی کے لیے ایسی حکمت عملی اپنائی کہ دنوں میں سکھوں کے سروں کے ڈھیر لگ گئے کیونکہ میر منو نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص کسی سکھ کا سر کاٹ کر لائے گا' اسے ایک سر کے بدلے پانچ روپے بطور انعام دیا جائے گا۔ لوگوں نے انعام کی خاطر اور لاہور دربار تک رسائی کے لیے اس معرکے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ میر منو نے جس کثرت سے سکھوں کو قتل کیا' اس سے سکھوں میں ایک ضرب المثل عام ہوئی۔

منو ساڈی داتری' اسیں منو دے سوئے
جوں جوں ساہنوں وڈدا' اسیں دون سوئے ہوئے

(منو ہماری درانتی ہے اور ہم اس کی وہ فصل ہیں کہ جیسے جیسے یہ ہمیں کاٹتا ہے' ہماری افزائش دگنی ہوتی چلی جاتی ہے۔)

مسجد طلائی

شاہنواز کے خیل خانے اور آدینہ بیگ کی حویلی کے مقابل' بھکاری خان کے دل

میں "خانہ خدا" بنانے کی امنگ جاگی۔ انہوں نے معین الملک سے درخواست کی کہ کشمیری بازار اور ڈبی بازار کے چوک کے ساتھ جو زمین خالی پڑی ہے' اس پر انہیں ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ معین الملک نے جب اس زمین کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مسجد کی تعمیر سے چوک میں آمدورفت میں رکاوٹ پڑے گی جس سے لوگوں کو پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ معین الملک' بھکاری خان کی کوئی درخواست رد کرنے کے قابل نہ تھے' اس لیے انہوں نے علمائے دین سے فتویٰ حاصل کیا تو سب نے یہ کہہ کر مسجد کی تعمیر کی اجازت دے دی کہ زمین خدا کی ملک ہے۔ خانہ خدا کی تعمیر میں جس قدر بھی دی جائے مناسب ہے' چاہے اس سے کتنا بڑا ہرج ہی کیوں نہ ہو۔

اس طرح پر رونق بازاروں کے بیچ میں بھکاری خان نے مسجد کے نہایت خوبصورت تین بڑے گنبد اور چھوٹی گنبدیاں اور بڑے برج برجیاں سونے چاندی اور تانبے کے بنائے۔ اس مسجد کا واسطہ چاروں طرف بازاروں کے ساتھ رکھا گیا۔ آنکھوں کو خیرہ اور دل کو سرور دینے والی یہ عبادت گاہ "مسجد طلائی" کے نام سے موسوم ہوئی۔

"دربار دہلی" میں موجود صفدر جنگ کے دل میں "دربار لاہور" کا سیاسی استحکام کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا' کیونکہ دو آبہ بست میں سکھ سردار آدینہ بیگ کی فوجی ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے' دیوان کوڑامل سکھوں کے لیے قابل احترام ہوا۔ معین الملک اس قدر اپنے آپ کو طاقتور اور مضبوط سمجھنے لگا کہ اس نے احمد شاہ ابدالی کے چار محالہ کے سالانہ محصول کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ نئی صورتحال کے پیش نظر ابدالی نے راجہ سکھ جیون کو لاہور بھیجا تو معین الملک نے اسے معمولی رقم دے کر لوٹا دیا' چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے اپنے تیسرے حملے کی تیاری شروع کر دی۔

معین الملک نے بھاری تعداد میں نئی فوجی بھرتی کی۔ مقامی فوجداروں اور امراء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' یہاں تک کہ کوڑامل کے توسط سے سکھ مسلح جتھے بھی معین الملک کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ "دربار دہلی" سے صفدر جنگ کو معین الملک کی مدد کرنے کو کہا گیا لیکن صفدر جنگ تو معین الملک کو تباہ ہوتے دیکھنا چاہتا تھا اس لیے وہ

روہیلوں اور مرہٹوں کے خلاف لڑنے کے بہانے اپنے صوبے اودھ کی طرف نکل گیا۔۔۔ معین الملک نے "دہلی دربار" سے مایوس ہو کر ایک جنگی مشاورت طلب کی جس میں راجہ کوڑامل' آدینہ بیگ' بھکاری خان اور میر منو شریک ہوئے۔ معین کے امراء میں خاصا اختلاف پایا جاتا تھا۔ بھکاری خان اور کوڑامل امن چاہتے تھے جبکہ مومن خان امن اور جنگ کے بین بین تھا جبکہ آدینہ بیگ جنگ پر آمادہ تھا اور یہ جنگ شہرپناہ یا قلعہ بند ہو کر نہیں بلکہ کھلے میدان میں لڑنا چاہتا تھا۔ آخر فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دائیں طرف آدینہ بیگ' بائیں طرف بھکاری خان' درمیان میں معین الملک اور پیچھے کوڑامل نے ان دستوں کی کمان سنبھالی۔ احمد شاہ ابدالی راوی دریا کے کنارے کنارے ہوتا محمود بوٹی کے میدانوں میں خیمہ زن ہوا۔

میدان جنگ میں جب کوڑامل کے ہاتھی کا پاؤں ایک خستہ قبر میں دھنس گیا' عین اس وقت ایک توپ کا گولہ لگنے سے کوڑامل ہلاک ہو گیا۔ اس طرح لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔

بھکاری خان' معین الملک تو لڑتے رہے لیکن آدینہ بیگ پسپا ہو کر شہر کی طرف آ گیا۔ رات کو دونوں فوجیں اپنے اپنے مورچوں میں چلی گئیں۔ معین الملک اور بھکاری خان کو دہلی کی طرف بھاگ جانے یا پہاڑی علاقے میں پناہ لینے کا مشورہ دیا گیا لیکن انہوں نے اسے مسترد کر کے شہر میں قلعہ بند ہو کر جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح راتوں رات معین الملک شہرپناہ میں بند ہو گیا۔ ابدالی کے لیے یہ صورتحال پریشان کن تھی۔ چار ماہ تک ابدالی نے محاصرہ جاری رکھا۔ آخر مسلمانوں کی مزید ہلاکت کے پیش نظر ابدالی اور معین الملک کے درمیان امن و امان کا معاہدہ ہوا۔ اس دوران بھی لاہور شہر کے اندر خاصی لوٹ مچائی گئی۔ جنگ کے دوران تو صرف دو ہزار افراد مارے گئے جبکہ جنگ کے بعد شہر میں پانچ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔

معین الملک تین روز تک افغان کیمپ میں رہا۔ پانچ روز بعد معین الملک اور بھکاری خان نے چھ لاکھ روپیہ پیش کیا جبکہ معاہدے کی رو سے دس لاکھ جان بخشی' دس لاکھ حکومت پنجاب کی بحالی اور دس لاکھ باقی ہندوستان کو حملے سے بچانے کے لیے ادا کرنا ٹھہرا' چنانچہ بڑی مشکل سے چھبیس لاکھ روپیہ اکٹھا ہو سکا۔ باقی چار لاکھ کا ابدالی نے

دریائے سندھ پہنچنے تک بھیج دینے کا وعدہ لیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنا نمائندہ قلندر بیگ دہلی بھیجا تاکہ اس معاہدے کی "دربار دہلی" سے توثیق ہو جائے' چنانچہ دربار دہلی نے فوراً اس معاہدہ پر شاہی مہر ثبت کر دی۔ اس طرح دہلی دربار کی سازشوں نے صوبہ پنجاب میں طوائف الملوکی کو جنم دیا۔ دربار لاہور اور شہر پناہ کی اینٹ سے اینٹ بج جانے کا سب سے زیادہ فائدہ سکھوں نے اٹھایا' بقول بلھے شاہ۔ ؎

مغلاں زہر پیالے پیتے
بھوریاں والے راجے کیتے

احمد شاہ ابدالی کے لاہور سے جاتے ہی سکھوں نے حسب معمول غارت گری' قتل اور ڈاکہ زنی کا سلسلہ شروع کیا۔ اب ان کا دائرہ باری دوآبہ بست دوآبہ بلکہ اس سے پار تک تھا۔ تھانیسر تک کا علاقہ خراب ہوا تو معین الملک نے امن عامہ کی بحالی کا کام اپنے ذمہ لے کر تمام علاقوں کا دورہ کیا۔ ان کے ساتھ بخشی غازی بیگ خان اور خواجہ مرزا خان اور بھکاری خان ہم سفر رہے۔ کسی بھی سکھ کی خبر دیئے یا ان کے سر قلم کر کے لانے یا ان کے گھوڑے چھین کر لانے والے کو ڈھیروں انعامات سے نوازا جاتا' یہاں تک کہ اگر کسی مسلمان سپاہی کا گھوڑا زخمی یا ضائع ہو جاتا تو اُسے اس کے بدلے میں شاہی اصطبل سے اعلیٰ گھوڑا دیا جاتا۔ لاہور میں آدینہ بیگ کی حویلی کے ساتھ شاہنواز خان کا فیل خانہ شاہی اصطبل میں تبدیل ہو گیا۔ آدینہ بیگ کا دست راست عبدالرحیم گگے زئی جس کی بھکاری خان سے بھی عزیزداری تھی' اس نے شاہی اصطبل کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ایک روز اطلاع ملی کہ سکھ نواح لاہور میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ معین الملک میر منوان کے تعاقب میں دریائے راوی کے کنارے کنارے سات کوس دور تک پہنچا اور وہاں خیمہ زن ہوا' سکھ یہ سنتے ہی گھنے جنگلوں میں جا گھسے جسے ماجھا کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ اسی اثناء میں خواجہ مرزا خان گھوڑ سوار سپاہیوں کے ساتھ مقتول سکھوں کے سر لایا۔ سپاہیوں کو انعامات دینے کے بعد اپنے گھوڑے پر سوار لشکر گاہ کی طرف تیزی سے جانے کے لیے گھوڑا دوڑایا کہ رکاب سے پاؤں پھسل گیا اور وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا جس سے وہ گھوڑے کے ساتھ دور تک زمین پر گھسٹتا رہا۔ اس طرح وہ زخموں کی تاب

نہ لاتے ہوئے موت کے منہ میں چلا گیا۔

مغلانی بیگم

معین الملک کی موت نے کہرام مچادیا۔

نائب ناظم بھکاری خان معین الملک کی بیوہ مغلانی بیگم اور اہل و عیال کو دہلی پہنچانا چاہتے تھے' لیکن مغلانی بیگم معین الملک کو لاہور میں دفن کرکے اپنے دودھ پیتے بچے محمد امین خان کو پنجاب کا ناظم اعلیٰ دیکھنا چاہتی تھی۔ تمام ہندوستانی فوجی سردار' مغلانی بیگم کے ساتھ تھے جبکہ تمام تورانی سپاہ اور مغل سردار بھکاری خان کے ہمنوا تھے۔ آخرکار سوائے خواجہ مرزا خان کے سب مغلانی بیگم کے طرفدار بن گئے۔ اس طرح مغلانی بیگم نے نواب معین الملک کی میت کو بیگم پورہ میں حضرت الیشاں کے مزار کے قریب نواب عبدالصمد کے تعمیر کردہ احاطہ قبور خاندان ناظماں میں دفن کردیا۔

میر معین الملک کی موت کی خبر جب "دہلی دربار" پہنچی تو مغل بادشاہ احمد شاہ نے شاہی فرمان کے ذریعے پنجاب کی نظامت کے لیے اپنے تین سالہ شہزادہ محمود شاہ اور نائب ناظم کے لیے معین الملک کے دو سالہ بچے محمد امین خان کو نامزد کیا جسے تسلیم نہ کیا گیا کیونکہ معاہدہ کی رو سے پنجاب اب انتظامی طور پر افغان مملکت کا حصہ تھا' اس لیے مغلانی بیگم نے احمد شاہ ابدالی سے رابطہ کرکے اپنے بیٹے محمد امین خان کو پنجاب کے ناظم اور میر مومن خاں کو نائب کے عہدے پر تقرر کی توثیق کرالی۔ اس طرح مغلانی بیگم نے شیرخوار ناظم اعلیٰ کے مشیر کی حیثیت سے انتظامی امور سنبھال لیے۔

"لاہور دربار" کی نئی انتظامیہ کے پیش نظر میر سید بھکاری خان نے "دربار دہلی" کے وزیر نظام الدین انتظام الدولہ سے رابطہ کیا جو معین الملک کا بھائی تھا۔ اسے اپنی بھابی کا یہ سیاسی کردار اچھا نہ لگا۔ اس نے شاہی فرمان کے ذریعے میر سید بھکاری خان کو پنجاب کا نائب ناظم مقرر کیا' لیکن مغلانی بیگم نے اس فرمان کو سختی سے رد کردیا جسے دیکھ کر میر سید بھکاری خان کو مغلانی بیگم کے عزائم کا پتا چل گیا۔ اس نے "دربار لاہور" کی حاضری ترک کرکے اپنی مستقل رہائش گاہ قصور میں افغان سپاہیوں کی فوجی بھرتی شروع کردی جس کا مقصد مغلانی بیگم کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ تھا۔

مغلانی بیگم کے لیے یہ صورتحال باعث تشویش ہوئی تو اس نے امراء اور اہم منصبداروں کو نئے انعامات اور اعزازات سے نوازنا شروع کیا جس سے بہت سے لالچی اور حاسد مغلانی بیگم کے ساتھ مل گئے یہاں تک کہ بھکاری خان کا دست راست خواجہ مرزا خان بھی مغلانی بیگم سے مل گیا اور اس نے بھکاری خان کو گرفتار کر کے مغلانی بیگم کے حضور پیش کر دیا جس کے صلہ میں مغلانی بیگم نے خواجہ مرزا کو "خان" کا خطاب دے کر ایمن آباد کا فوجدار بنا دیا۔

مغلانی بیگم تمام کاروبار حکومت خواجہ سراؤں کے توسط سے سرانجام دے رہی تھی۔ تین خواجہ سرا میاں خوش فہم' میاں ارجمند اور میاں محبت اس کے خاص معتمد تھے جس پر کئی ترک اور افغان سردار باغی ہو گئے۔ شیر خوار ناظم پنجاب محمد امین خاں کی موت کے بعد پنجاب کی نظامت کے مکمل اختیارات مغلانی بیگم نے اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے اپنے ایلچی قندھار اور دہلی روانہ کیے لیکن "دربار دہلی" نے نائب مومن خان کو پنجاب کا نیا ناظم مقرر کر دیا۔ مغلانی بیگم نے اس شاہی حکم کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ خواجہ مرزا خان کے بھائی خواجہ سعید خان کو بھکاری خان نے معین الملک کی عزت و ناموس کا حوالہ دیتے ہوئے مغلانی بیگم کے خلاف اکساتے ہوئے کہا۔ "مغلیہ سلطنت کے وقار کو بچانے کا واحد حل یہ ہے کہ مغلانی بیگم سے زبردستی اقتدار چھین لیا جائے اور اس وقت خواجہ مرزا خان سے بہتر کوئی شخص نہیں۔"

خواجہ سعید خان نے تمام ترک اور افغان سرداروں سے مشورہ کیا اور ان کو اپنے ساتھ ملا کر خواجہ مرزا خان تک یہ بات پہنچا دی۔ خواجہ مرزا خان کے دل کو یہ بات لگی اور وہ اپنی پوری عسکری طاقت کے ساتھ لاہور آیا اور قلعہ پر قبضہ کر کے مغلانی بیگم کو اس کی ماں کے گھر نظر بند کر دیا۔ مغلانی بیگم نے نہ صرف "قندھار" بلکہ "دہلی دربار" سے بھی خفیہ رابطہ قائم کیا۔ چونکہ وزیر دہلی غازی الدین عماد الملک سے مغلانی بیگم کی بیٹی عمدہ بیگم کی نسبت طے پا چکی تھی۔ اس کے باوجود "دربار دہلی" کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ جبکہ قندھار میں یہ اطلاع ملتے ہی احمد شاہ ابدالی نے امان خان کو دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مغلانی بیگم کی مدد کے لیے بھیجا۔

افغانی فوج دریائے راوی کے کنارے شاہدرہ میں خیمہ زن ہوئی تو خواجہ مرزا

خان نے افغان سپاہ سالار امان خان کو پیغام بھیجا کہ "میں نے تو یہ ساری کارروائی خاندان مغلیہ کے خلاف کی ہے۔ اب آپ آگئے ہیں تو میں اس فرض سے سبکدوش ہوتا ہوں۔" یہ سن کر امان خان خوش ہوا اور کسی مداخلت کے بغیر افغان فوجیں لاہور میں داخل ہوگئیں اور انہوں نے شہر کو جی بھر کر لوٹا۔

امان خان نے احمد شاہ ابدالی کے حکم کے مطابق مغلانی بیگم کو پنجاب کی ناظم اور اس کے ماموں خواجہ عبداللہ خان کو نائب ناظم مقرر کیا۔ معین الملک کی موت کے بعد مغلانی بیگم کے اقتدار کے بڑے دشمن بھکاری خان اور خواجہ مرزا خان تھے جن کی وجہ سے اسے یہ دن دیکھنے پڑے' اس لیے مغلانی بیگم نے ان دونوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ دیکھتے ہوئے خواجہ مرزا خان کو تو امان خان گرفتار کر کے قندھار لے گیا۔

بھکاری خان پر الزام تھا کہ اس نے خواجہ سرا زمرد کے ذریعے شیرخوار ناظم پنجاب محمد امین خان کو زہر دیا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

مغلانی بیگم نے نواب میر بھکاری خان کا جو انجام کیا وہ باعث عبرت ہے۔ مغلانی بیگم نے بھکاری خان کی مشکیں کسوا کر اپنے حضور طلب کیا۔ جب ایسا کیا گیا تو اس نے سب سے پہلے محل کی کنیزوں اور پھر خواجہ سراؤں سے بھکاری خان کو اس قدر جوتے لگوائے کہ وہ نیم بے ہوش ہوگیا پھر اپنے ہاتھوں سے خنجر کے دو ایسے کاری زخم لگائے کہ وہ ان کی تاب نہ لاتے ہوئے مرگیا۔ یہ دیکھ کر مغلانی بیگم نے حقارت سے اس کی لاش کو فصیل شہر سے باہر پھنکوا دیا۔

ناظم پنجاب مغلانی بیگم کے نائب ناظم خواجہ عبداللہ سے اختلافات دنوں میں اس قدر بڑھے کہ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی فوج جمع کرنی شروع کر دی۔ اس طرح دونوں حامی دستوں میں جھڑپیں بھی ہوئیں۔ آخر خواجہ عبداللہ کی فوج مغلانی بیگم کی حامی فوج پر غالب ہوئی اور خواجہ عبداللہ نے پھر سے مغلانی بیگم کو اس کی والدہ اور اپنی بہن کے گھر نظربند کر دیا۔ شاہی خزانہ خالی ہونے کی وجہ سے عوام سے رقم اکٹھی کرنے کے لیے جبر و تشدد کے حربے آزمائے گئے' لاہور میں اشیائے خورد ونوش کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں' ہر طرف قحط کا عالم ہوگیا' ہر سو بھوک پھیل گئی جس سے لاہور میں یہ ضرب المثل مشہور ہوئی:

حکومت نواب عبداللہ
نہ رہی چکی نہ رہیا چلھا
(نواب عبداللہ کے دور حکومت نے عوام کو چکی اور چولہے سے بھی محروم کردیا)

مغلانی بیگم نے پھر سے "دربار دہلی" سے خفیہ رابطہ کیا تو عمادالملک نے اپنی مسلح افواج سے مغلانی بیگم کی مدد کا فیصلہ کیا--- اس لشکر میں بست دو آبہ کا فوجدار آدینہ بیگ بھی شامل ہوا--- عمادالملک تک مغلانی بیگم کے تمام قصے اور کہانیاں پہنچ چکی تھیں اس لیے انہوں نے جمیل الدین کو ایک خاص ہدایت کے ساتھ لاہور بھیجا۔ لاہور پر شاہی لشکر کی چڑھائی دیکھ کر خواجہ عبداللہ شہر چھوڑ کر جموں کی طرف بھاگ گیا اور پھر وہاں سے قندھار پہنچا۔ لاہور پر قبضہ کے بعد سید جمیل الدین نے مغلانی بیگم کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ لاہور سے سرہند پہنچا دیا۔ اس پر مغلانی بیگم بڑی سیخ پا ہوئی اور دھمکی دی کہ احمد شاہ ابدالی اس توہین کا بدلہ لاہور کو مسمار کر کے اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لے گا' لیکن اس کی پروا نہ کرتے ہوئے عمادالملک نے آدینہ بیگ کو لاہور اور ملتان کا صوبیدار بنا دیا جبکہ جمیل الدین کو اس کا نائب مقرر کیا۔

خواجہ مرزا خان

قندھار میں خواجہ عبداللہ نے احمد شاہ ابدالی کو تمام روداد سناتے ہوئے اس کی مملکت پنجاب کو "دربار دہلی" کی جانب سے بزور شمشیر چھیننے کی سازش کو بے نقاب کیا۔ یہ سنتے ہی احمد شاہ ابدالی نے ہراول دستے کے طور پر خواجہ عبداللہ کے ہمراہ خواجہ مرزا خان کو بھاری پیادہ اور سوار فوج کے ساتھ روانہ کیا اور انہوں نے بڑی آسانی سے لاہور پر قابض ہو کر اس شہر کو وسیع پیمانے پر لوٹا جبکہ آدینہ بیگ اور سید جمیل الدین نے اپنے فوجی دستوں کے ہمراہ بٹالہ کی راہ لی۔

یہ خبر سنتے ہی احمد شاہ ابدالی "دہلی دربار" کو سزا دینے کے لیے لاہور پہنچا--- اور جہان خان کی زیر کمان ایک فوجی دستہ آدینہ بیگ کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ آدینہ بیگ اور سید جمیل الدین اپنی گھوڑ سوار فوج کے ساتھ ہانسی اور حصار کے بے آب و گیاہ صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ اس پر جہاں خان نے باری اور رچنا دو آبہ میں خوب قتل و

غارت گری کی۔

احمد شاہ ابدالی نے خواجہ مرزا خان کو لاہور کا ناظم مقرر کرنے کے لیے خود دہلی کا رخ کیا۔ دہلی کی طرف بڑھتے ہوئے راستہ کے ہر گاؤں اور بستی کو اپنی لوٹ مار اور قتل و غارت کا نشانہ بنایا اور نہ صرف "دہلی دربار" کی اینٹ سے اینٹ بجادی بلکہ محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم کو بھی اپنے نکاح میں لے لیا۔ ساتھ ہی اپنے بیٹے شہزادہ تیمور شاہ کا عقد عالم گیر ثانی کی بیٹی سے کردیا۔

دہلی سے واپسی کے بعد احمد شاہ ابدالی نے لاہور پہنچ کر دوآبہ بست' لاہور' کشمیر' ٹھٹہ اور ملتان کے علاقے کو پنجاب میں شامل کر کے شہزادہ تیمور شاہ کو اس کا ناظم اور جہان خان کو نائب مقرر کیا... سکھوں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی نے شہر اور اس کی تمام مقدس عمارتوں کو زمین بوس کردیا' یہاں تک کہ ہرمندر امرتسر کے تالاب کو بھی مٹی سے بھردیا۔

شہزادہ تیمور شاہ

شہزادہ تیمور شاہ کے پنجاب کا ناظم بنتے ہی لاہور کا عبدالرحیم گگے زئی قلعہ لاہور میں اپنے لیے ایک ذمہ دار عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ دراصل وہ "دربار لاہور" کے امراء کی کمزوریوں اور ریشہ دوانیوں سے آدینہ بیگ کو آگاہ رکھنا چاہتا تھا۔

تیمور شاہ بھی آدینہ بیگ کی سیاسی بصیرت اور فوجی قوت سے اچھی طرح آگاہ تھا' اس لیے وہ بھی عبدالرحیم گگے زئی کے ذریعے آدینہ بیگ تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہت جلد جب اسے معلوم ہوا کہ آدینہ بیگ سکھوں سے گٹھ جوڑ کررہا ہے تو اس نے آدینہ بیگ کو دربار میں حاضری کے لیے طلب کیا' لیکن آدینہ بیگ نہ تو دربار میں حاضر ہوا' اور نہ ہی کوئی خاطر خواہ جواب دیا' سوائے اس بہانہ تراشی کے کہ اس کے لیے دوآبہ میں رہنا بہت ضروری ہے۔ یہ سنتے ہی تیمور شاہ نے جہان خان کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ جہان خان نے آدینہ بیگ کو جا پکڑا اور 56 لاکھ سالانہ محاصل پر بست دوآبہ حاصل کرلیا اور شرط یہ رکھی کہ مجھے "لاہور دربار" کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اس کی یہ شرط مان لی گئی اور اس طرح آدینہ بیگ نے "دلارام" کو

"دربار لاہور" میں اپنا وکیل مقرر کیا۔ یہ دیکھتے ہوئے عبدالرحیم گگے زئی نے خواجہ مرزا خان کی طرف رجوع کیا۔ اس طرح وہ دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ آدینہ بیگ کی حویلی اب دلا رام کے تصرف میں آ گئی' البتہ حویلی کے ساتھ شاہی فیل خانہ جو مستقل اصطبل خانہ میں تبدیل ہو چکا تھا' اس پر گگے زئیوں کا اثر رسوخ بڑھ رہا تھا۔ وہ گھوڑوں کی خرید و فروخت میں خاصی دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس وقت یہ کاروبار بہت بڑھ گیا جب سپہ سالار جہان خان نے حکم جاری کر دیا کہ ہر اس شخص کو جس کے پاس گھوڑا ہو گا وہ شاہی فوج میں شمار کیا جائے گا۔ اس طرح دو ہزار گھوڑ سوار لے کر جہان خان نے سکھوں کو تہ تیغ کیا۔ اس کارروائی سے جہاں کہیں کوئی سکھ تھا' وہ افغانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا' یہاں تک کہ بہت سے سکھ سردار آدینہ بیگ سے مل گئے۔ یہ دیکھتے ہوئے "لاہور دربار" کے امراء نے تیمور شاہ کو آدینہ بیگ کے خلاف بھڑکایا تو انہوں نے خواجہ مرزا خان کی کمان میں گھوڑ سواروں کی ایک بھاری فوج دو آبہ بست آدینہ بیگ کے خلاف مہم پر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

عبدالرحیم گگے زئی جس نے تیمور شاہ کا بڑا اعتماد حاصل کر لیا تھا' "لاہور دربار" کی طرف سے سفیر بن کر دو آبہ بست آدینہ بیگ کے پاس پہنچا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خواجہ مرزا خان مع فوج آدینہ بیگ سے مل گیا۔ آدینہ بیگ نے بہت جلد اسے اپنی فرزندی میں لے لیا۔

سکھوں اور افغانوں سے فوجی قوت حاصل کرنے کے بعد آدینہ بیگ دہلی پر قابض "مرہٹوں" کی طرف راغب ہوا اور انہیں "لاہور دربار" کی کمزور صورتحال کا بتا کر اس پر قبضہ جمانے کے لیے کہا' تو مرہٹوں نے ملہار راؤ اور جنکو راؤ کی کمان میں کثیر تعداد میں سوار اور پیادہ فوج جو بھاری توپ خانے اور آتش بازی سے لیس تھی' آدینہ بیگ کے ہمراہ لاہور کی طرف روانہ کر دی۔ یہ اطلاع ملتے ہی شہزادہ تیمور شاہ اور جہان خان تمام شاہی خزانہ سمیٹ کر مع اہل و عیال دریائے راوی کے پار شاہدرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ لاہور پر مرہٹوں کا قبضہ ہوتے ہی تیمور شاہ کابل کی طرف بھاگ گیا۔

رگھو ناتھ نے آدینہ بیگ کو نواب کا خطاب دے کر پچھتر ہزار کے عوض "پنجاب" اس کے نام کر دیا اور خود دہلی کی راہ لی۔ آدینہ بیگ نے اپنے داماد اور سپہ سالار خواجہ

مرزا خان کو لاہور کا ناظم اور اس کے بھائی خواجہ سعید خان کو نائب مقرر کیا اور خود بٹالہ میں چلا آیا اور اسے پنجاب کا صدر مقام بنا دیا۔ اس طرح آدینہ بیگ بست دو آبہ میں شرق پور کے پٹواری سے ترقی کرتے ہوئے دو آبہ کا فوجدار اور پھر پنجاب کا ناظم بنا۔ آدینہ بیگ کے پنجاب کا حاکم بنتے ہی سکھوں نے اس سے اقتدار میں اپنا حصہ طلب کیا جس سے سکھوں اور آدینہ بیگ کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ نے بہت جلد آگ پکڑ لی' لیکن وہ صرف چھ ماہ پنجاب کا ناظم رہنے کے بعد اچانک فوت ہو گیا۔

شہزادہ تیمور کے کابل پہنچتے ہی احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں اور سکھوں کی سرکوبی کے لیے پھر سے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آندھی کی طرح چل کر لاہور پر قبضہ کر لیا اور پھر مرہٹوں کو پانی پت کے میدان میں بھاری شکست دے کر ڈھیروں مال غنیمت لے کر کابل کی طرف چل دیا۔ راستے میں سکھوں نے گوریلا لڑائی کے ساتھ خاصی دھن اور دولت چھینی' بلکہ سردار چڑھت سنگھ نے بائیس سو کے قریب قیدی جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی آزاد کرائے۔ واپسی پر چڑھت سنگھ نے گوجرانوالہ قلعے پر قبضہ کر لیا۔ یہ سنتے ہی خواجہ عبداللہ جو کہ احمد شاہ کا نائب تھا' وہ گوجرانوالہ پر چڑھ دوڑا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا' لیکن جسا سنگھ آہلو والیہ اور ہری سنگھ بھنگی نے پیچھے سے حملہ کر کے اسے میدان جنگ میں بہت سے گھوڑے اور بھاری توپ خانہ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح خواجہ عبداللہ اپنی جان بچا کر لاہور پہنچا۔

جسا سنگھ آہلو والیہ سردار کپور تھلہ کی قیادت میں سکھوں نے لاہور شہر کا محاصرہ کر لیا اور پھر شہر میں داخل ہونے کے بعد قلعہ میں خواجہ عبداللہ کو قتل کر کے اپنے حاکم ہونے کا اعلان کر دیا۔ جسا سنگھ آہلو والیہ اپنی ہٹ دھرمی اور لڑائی فساد کی وجہ سے کل کل بلکہ کلال مشہور تھا۔ لاہور پر قبضہ ہوتے ہی سکھوں کے مذہبی مرکز سے اکال تخت کے دل خالصہ نے جسا سنگھ کو سکھ قوم کے سلطان کا خطاب دے دیا۔ اس طرح جسا سنگھ نے لاہور کے ٹکسال پر اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔

سکہ زر در جہان بفضل اکال
ملک احمد گرفت جسا کلال

جسا کلال نے شاہی فیل خانے میں جو شاہی اصطبل میں تبدیل ہو گیا تھا' اپنے لیے اس جگہ خاص طویلے بنائے۔ جسا سنگھ آہلووالیہ نے صرف لاہور پر ہی قبضہ نہ کیا تھا بلکہ سکھ سرداروں نے سرہند کے زین خان اور جالندھر دو آبہ کے صادق خان آفریدی سے یہ شہر چھین لیے بلکہ چار محالہ کے حاکم خواجہ مرزا خان کو بھی بھگا دیا۔

پنجاب کی اس نئی صورتحال کے پیش نظر احمد شاہ ابدالی پھر ایک بھاری لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ یہ دیکھتے ہوئے جسا سنگھ آہلووالیہ مالوہ کی طرف چلا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کا عظیم قتل عام کیا جسے سکھ "وڈا گلو گھارا" کا نام دیتے ہیں۔

سہ حاکمان لاہور

احمد شاہ ابدالی نے پہلی بار لاہور کی نظامت ایک ہندو کابلی مل کو سونپی اور کابل کی راہ لی۔ کابلی مل جب تک لاہور رہا' اس نے سکھوں کو شہر کے قریب پھٹکنے نہ دیا۔ اگرچہ سکھوں نے ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ آخر امرتسر میں دیوالی کے تہوار پر مسل کے سرداروں نے مل کر لاہور پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اس طرح بھنگی مسل کے تین سرداروں گوجر سنگھ' لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر لیا کیونکہ ان کے پاس آٹھ ہزار کے قریب گھوڑ سوار فوج تھی۔

ان سہ حاکمان لاہور کی خبر نے احمد شاہ ابدالی کو آگ بگولہ کر دیا اور وہ افغان پٹھانوں کے لشکر کے ساتھ سرخ آندھی کی طرح پنجاب کی طرف بڑھا۔ جہلم کے قریب سکھوں کو زبردست شکست دے کر رچنا دو آب کو روندتا ہوا وہ راوی کے کنارے پہنچا تو سہ حاکمان لاہور میں سے گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ قصور چلے گئے جبکہ سوبھا سنگھ پاک پتن کی طرف بھاگ گیا۔ سہ حاکمان لاہور کے لاہور خالی کرنے کے واقعہ کو کسی عوامی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ؎

سوبھے دی سوبھا گئی
گجر دا گیا مال
لہنے نوں دینا آیا
تنوں ہوئے کنگال

سوبھا کے معنی عزت و توقیر کے ہیں' اس لیے نام کی مناسبت سے سوبھا کی عزت گئی' گوجر کا لوٹا ہوا مال غنیمت' جبکہ لہنا سنگھ کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اس طرح یہ تینوں کنگال ہوئے۔

احمد شاہ ابدالی نے جب لاہور میں دربار کیا تو لاہور کے معززین نے جن میں ہندو اور مسلمان شامل تھے' کابلی مل کی طرح لہنا سنگھ کو پنجاب کا ناظم بنانے کی سفارش کی۔ لہنا سنگھ سے رابطہ کیا گیا تو اس نے سکھ سرداروں کی حمایت کی خاطر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے لاہور سے سرہند کی طرف کوچ کیا' تو راستے میں سکر چکیہ مسل کے چڑھت سنگھ اور بھنگی مسل کے لہنا سنگھ نے ان پر بار بار حملہ کر کے انہیں بڑا زچ کیا۔ یہاں تک کہ چڑھت سنگھ' ہیرا سنگھ' لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ نے مل کر امرتسر پر ہلہ بول دیا جہاں سپہ سالار جہان خان قابض تھا۔ یہ خبر سنتے ہی احمد شاہ ابدالی تیزی سے امرتسر پہنچا لیکن سکھ گھوڑے دوڑاتے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔ بہت سے میدان جنگ میں کام بھی آئے۔

احمد شاہ ابدالی لاہور میں پندرہ دن تک آرام کے بعد کابل کی طرف روانہ ہوا تو کابلی مل اسے الوداع کہنے کے لیے چناب تک گیا۔ کابلی مل کی غیر موجودگی کی اطلاع پاتے ہی لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ بھنگی مسل کر دو ہزار گھوڑ سوار سپاہیوں کے ساتھ بیگم پورہ کے نواح میں خیمہ زن ہوئے۔

بھنگی سرداروں نے قلعے کے پورے ملازموں اور باغبانوں کے ساتھ سازباز کر رکھی تھی' چنانچہ باغبانوں نے قلعہ کی بیرونی دیوار میں ایک ایسا شگاف ڈال دیا جس سے گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ کے جان نثار سپاہی قلعہ کے اندر داخل ہو گئے۔ صبح لاہور کے بخشی' امیر سنگھ نے بھاری توپ خانے کے ذریعے قلعہ فتح کرنا چاہا لیکن ناکام ہوا۔ تمام فوج شہر کے اندر داخل ہو چکی تھی اور وہ خفیہ طریقے سے لوٹ مار میں لگی ہوئی تھی۔ لاہور پر لہنا سنگھ اور گوجر سنگھ کے حملے اور قبضے کا سن کر سوبھا سنگھ دوپہر تک شاہ عالمی دروازہ کے اندر دیوان لکھپت کے بھتیجے لیکھ راج کھتری کی حویلی میں اترا اور اس کے سپاہی لاہور کی لوٹ مار میں شامل ہو گئے۔

لاہور کی اس قدر خرابی کو دیکھتے ہوئے ایک وفد گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ سے ملا اور

انہیں کہا۔ "لاہور چونکہ گرو رام داس کا جنم استھان ہے' اس لیے یہ گورو کا کوٹھا (مکان) ہے۔ اس لیے سکھوں کو اپنے گورو کوٹھے کو برباد نہیں کرنا چاہیے۔" یہ سنتے ہی گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ خود گھوڑے پر سوار ہو کے تمام شہر میں گھومے اور سکھوں کو گرو رام داس کے حوالے سے اس شہر میں امن و امان سے رہنے کی تلقین کی۔ اس طرح بہت جلد لاہور سکھوں کے ہاتھوں لٹنے سے بچ گیا۔ لاہور پر پھر سے سہ حاکمان کا قبضہ ہو گیا۔ لاہور کو پھر سے مال غنیمت کی طرح تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ لہنا سنگھ کو شہر کا مرکزی حصہ شاہی قلعہ' شاہی مسجد اور اندرون کشمیری اور شیرانوالہ دروازے کا علاقہ ملا جبکہ گوجر سنگھ کے حصے میں لاہور کا مشرقی حصہ' کابلی مل کی حویلی سے شالامار باغ تک کا علاقہ آیا' اس لیے انہوں نے بیرون موتی دروازہ کے نیا قلعہ گوجر سنگھ تعمیر کرایا اور اسے اپنا مرکز قرار دیا۔ سوبھا سنگھ کو لاہور کا جنوبی حصہ ملا' جس میں نیاز بیگ' مزنگ اور زیب النساء کا باغ تھا۔ وہاں اس نے نواں کوٹ' نیا قلعہ بنا کے اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا اور محکم دین آرائیں کے سپرد یہ باغ کیا۔

بھنگی مسل کے سرداروں کی لاہور کی فتح یابی کا سنتے ہی سکر چکیہ مسل کا سردار چڑھت سنگھ بھی مال غنیمت میں اپنا حصہ لینے کے لیے دو ہزار کی فوج کے ساتھ لاہور پر چڑھ دوڑا۔ بھنگی سردار بھی چڑھت سنگھ کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے' چنانچہ لہنا سنگھ نے قلعہ میں مہمان بنایا اور اسے زمزمہ' توپ کا تحفہ قبول کرنے کو کہا کیونکہ یہ توپ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کے ساتھ لڑنے کے لیے لاہور میں ڈھالی تھی اور اسے پانی پت کی تیسری لڑائی میں استعمال کیا تھا۔ اس وقت یہ توپ قلعہ کے ثمن برج پر رکھی تھی۔ لہنا سنگھ کو یقین تھا کہ چڑھت سنگھ اس تحفے کو قبول کرنے کی بے وقوفی نہیں کرے گا' لیکن چڑھت سنگھ نے جب اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ اسے گھسیٹ کر گوجرانوالہ لے جائیں تو چڑھت سنگھ کی عقل مندی کی داد ہر ایک نے جی بھر کر دی۔ ادھر لاہور دربار کی یہ حالت تھی' ادھر سرہند میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے آٹھویں حملے کے دوران پھولکیاں مسل کے سردار امر سنگھ کو سرہند کی صوبہ داری کا پروانہ دیا اور اس سے کہا کہ وہ سالانہ خراج کی رقم شاہ کو پہنچا دیا کرے۔ یہاں سے احمد شاہ ابدالی واپسی کا راستہ لینے سے پہلے ڈیڑھ ماہ تک ماچھی واڑہ میں مقیم رہا اور سکھوں کے چھوٹے بڑے فوجی دستوں کو منتشر

کرتا رہا۔ یہیں پر اسے خبر ملی کہ سکھوں کے فوجی دستوں نے نجیب الدولہ کے علاقے گنگ و جمن کے دوآبہ پر حملہ کر دیا اور نانوتہ امیہ' میرٹھ اور بار ہا سادات تک لوٹ لیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی نے جہان خان کو ان کے تعاقب میں بھیجا' جس نے انہیں اچانک جا لیا۔ ایک سال بعد احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کی تسخیر کے لیے پھر سے پنجاب کا رخ کیا اور اپنے ہراول فوجی دستے اپنی آمدنی طے کرنے کے لیے بھیجے۔ اس طرح ایک ہراول دستہ باری دوآبہ میں ایمن آباد تک پہنچا۔ احمد شاہ ابدالی چناب کے کنارے تک پہنچ پایا تھا کہ اسے اپنے خلاف فوجی بغاوت کا علم ہوا اور وہ فوراً لوٹ گیا۔

اس طرح پنجاب احمد شاہ ابدالی کی مزید لوٹ مار اور قتل و غارت سے بچ گیا اور یہ ضرب المثل نہ دہرائی گئی جو اس کے متواتر حملوں کے پیش نظر جگہ جگہ سنائی دیتی تھی۔

کھادا پیتا لاہے دا
باقی احمد شاہے دا

لیکن پورے ایک سال بعد احمد شاہ ابدالی اپنی مقبوضات میں سکھوں کو قابو میں لانے کا خیال دل میں لیکر پنجاب کی طرف بڑھا لیکن وہ صرف پشاور تک پہنچ پایا۔ اس کی وجہ بڑھاپا اور جہان خان ایسے سپہ سالار کی موت تھی کہ اس کے بعد وہ صرف ایک سال زندہ رہا۔ اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ بادشاہ بنا۔ گوجر سنگھ کی موت کے بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے صاحب سنگھ نے لے لی۔ ایک سال بعد تیمور شاہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس کا فرزند زمان شاہ تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی باپ کی طرح سکھوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن سوبھا سنگھ اور لہنا سنگھ کی موت کے بعد جب چیت سنگھ اور سوبھا سنگھ کی جگہ اس کے بیٹے مہر سنگھ نے لی تو زمان شاہ اپنے دادا کی مقبوضات کو آزاد کرانے کے لیے ایک بھاری تازہ دم لشکر کے ساتھ پنجاب کی طرف بڑھا۔ یہ سنتے ہی اکثر سکھ سردار جن میں لاہور کے سہ حاکمان بھی تھے شہر چھوڑ کر جنگلوں میں جا چھپے۔ زمان شاہ نے اپنے وزیر شیر احمد خان کی مدد سے سکھ سرداروں کو اطاعت قبول کرنے اور خراج کی ادائیگی کے عوض یہاں پر حکومت کرنے کا اجازت نامہ لینے کو کہا۔ ابھی کوئی سمجھوتہ طے نہ پایا تھا کہ شاہ زمان کے بھائی شاہ محمود نے اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ اطلاع پاتے ہی شاہ زمان نے سر پر پاؤں

رکھ کر واپسی کا سفر طے کیا۔ وہ اس قدر جلدی میں تھا کہ سیلاب کی وجہ سے اس کی چند توپیں جہلم دریا میں دھنس گئیں جنہیں نکالنے کے لیے بھی اس کے پاس وقت نہ تھا اور جب سکر چکیہ مسل کے سردار رنجیت سنگھ نے یہ توپیں نکلوا کر کابل روانہ کیں تو شاہ زمان نے خوش ہو کر رنجیت سنگھ کو لاہور کی حکومت کا پروانہ لکھ بھیجا جس کی سہ حاکمان لاہور نے ذرا بھی پروانہ کی۔

رنجیت سنگھ

سہ حاکمان لاہور چیت سنگھ' صاحب سنگھ اور مہر سنگھ' رنجیت سنگھ کے خلاف سر جوڑ کر نئی حکمت عملی تیار کر رہے تھے کیونکہ "لاہور" کا دفاع تینوں بھنگی سرداروں کے ذمہ تھا۔ صاحب سنگھ جو حاکم گجرات تھا' لاہور کے جڑواں حاکم چیت سنگھ اور مہر سنگھ کو اپنے سے کم سمجھتا تھا۔ رنجیت سنگھ کی فوج کا دائرہ روز بروز تنگ ہو رہا تھا۔ رنجیت سنگھ گوجرانوالہ سے سیدھا لاہور کی طرف نہیں بڑھا تھا بلکہ سب سے پہلے سیدھا بٹالہ کی طرف گیا جہاں کنہیا مل کی سردارنی سدا کور سے صلاح مشورہ کیا۔ اس طرح سدا کور بھی اپنی فوج کے ساتھ اپنے داماد کے ہمراہ لاہور کی طرف بڑھی اور یہ فوج نواب وزیر خان کے باغ میں خیمہ زن ہوئی۔ سہ حاکمان لاہور نے اپنے آپ کو شہرپناہ میں بند کر لیا۔ فصیل شہر کے صرف تین دروازے دہلی' لوہاری اور روشنائی ہی قائم رہے باقی دروازوں کی جگہ دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔

روسائے لاہور جن کو شاہ زمان کے پروانہ حکومت کا علم تھا' سہ حاکمان لاہور کی ہٹ دھرمی سے واقف تھے۔ انہوں نے خفیہ طریقے سے رنجیت سنگھ کو لاہور پر حملہ کرنے میں مدد دینے کا وعدہ بھی کیا تھا' اس لیے رنجیت سنگھ کو بھی اطمینان تھا۔

لاہور کے لوہاری دروازہ کا محافظ مہر محکم دین تھا۔ اس نے خفیہ طور پر رنجیت سنگھ کو اطلاع بھجوائی کہ وہ صبح صادق اپنی فوج کے ساتھ اس دروازے پر پہنچے دروازہ کھول دیا جائے گا۔

رنجیت سنگھ اپنی فوج لے کر لوہاری دروازہ پہنچا۔ مخبر نے سہ حاکمان لاہور کو خبر دی کہ رنجیت سنگھ لوہاری دروازہ توڑ کر شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ ایک بھاری

فوج کے ساتھ اس کا یہ حملہ پسپا کر دیا جائے' چنانچہ حاکمان لاہور بھاری فوج کے ساتھ قلعے سے نکل کر لوہاری دروازہ تک پہنچے۔ مہر محکم دین نے ان سے کہا ہم نے رنجیت سنگھ کا حملہ پسپا کر دیا ہے' اب وہ اپنی فوج کے ساتھ دہلی دروازے سے حملہ کرنے والا ہے' چنانچہ یہ تمام فوج لے جا کر کا اس کا راستہ روکا جائے۔

سہ حاکمان لاہور پلک جھپکتے ہی فوج کے ساتھ دہلی دروازہ کی طرف دوڑے تو محکم دین نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے اطمینان سے دروازہ کھول دیا۔ اس طرح رنجیت سنگھ شہر میں داخل ہو گیا۔ یہ خبر پاتے ہی صاحب سنگھ اور مہر سنگھ دہلی دروازہ سے باہر نکل گئے جبکہ چیت سنگھ نے فوراً قلعے میں پہنچ کر اپنے آپ کو قلعہ بند کر لیا۔ رنجیت سنگھ کی فوج نے شہر میں دست درازی شروع کی لیکن رنجیت سنگھ کے حکم کے مطابق انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

رنجیت سنگھ نے قلعے پر حملہ کرنے کا سوچا تو رانی سدا کور نے صرف قلعہ کا محاصرہ کرنے کی تجویز دی۔ اس طرح صرف دوسرے روز چیت سنگھ نے جان بخشی کی صورت میں قلعہ سے نکل جانے کی التجا کی۔ اس طرح لاہور سہ حاکمان سے خالی ہو گیا۔

راجہ رنجیت سنگھ کی لاہور پر فتح کا سن کر ہر مسل کا سردار حسد و بغض کی آگ میں جل اٹھا' خاص کر بھنگی اور رام گڑھیہ مسل کے سرداروں نے مل کر رنجیت سنگھ سے لاہور چھیننے کا منصوبہ بنایا۔ اس محاذ میں قصور کا نظام الدین بھی شامل تھا۔ سردار جسا سنگھ تو ضعیفی اور بیماری کے سبب اس میں شامل نہ ہو سکا مگر بیٹوں کو امرتسر بھیج دیا۔ لاہور پر سکھوں کے اس بھاری حملے کی اطلاع پاتے ہی رنجیت سنگھ فکر مند ہوا۔ خزانہ خالی تھا۔ فوج نے کسی مہم میں لڑنے سے انکار کر دیا کہ کئی ماہ کی تنخواہیں انہیں نہیں ملی تھیں' حد یہ کہ لاہور پر حملہ آور ہونے کے بعد بھی انہیں لوٹ مار کی کھلی اجازت نہ دی گئی۔ اس پر بھی فوج رنجیت سنگھ سے ناراض تھی۔ رنجیت سنگھ کو سب سے پہلے لاہور کی رعایا سے قرض لینے کی تجویز پیش کی گئی جو رنجیت سنگھ نے رد کر دی کیونکہ اس طرح رعایا کے کسی بھی سازش میں شامل ہونے کا خطرہ لاحق تھا کیونکہ لالچی اور کنجوس بھی شہر میں کم نہ تھے۔ اس اثناء میں ایک بوڑھے شخص نے جان کی امان پانے کی درخواست کے ساتھ معین الملک المعروف میر منو کے عہد میں قلعے کے اندر دفنائے

خزینہ اور چھپائے توپ خانے اور اسلحہ کی نشاندہی کی جس سے لاکھوں روپے کی مالیت کا نقد زر اور بھاری اسلحہ دستیاب ہوا۔ اس طرح رنجیت سنگھ دشمنوں کے مقابلے میں ایک زبردست طاقت کے ساتھ لاہور سے امرتسر کی طرف چلا اور موضع بھسین کے قریب میدان میں فروکش ہوا۔

چند دن دونوں لشکر آمنے سامنے رہے۔ معمولی جھڑپیں ہوئیں کوئی بڑا مقابلہ یا فیصلہ کن لڑائی نہ ہوئی' بس ایک دوسرے کی فوجی طاقت کو آزماتے رہے اچانک ایک رات زیادہ اور تیز شراب نوشی کے سبب گلاب سنگھ بھنگی ایسا سویا کہ صبح جاگ نہ سکا۔

فوج کو جب گلاب سنگھ بھنگی کی ناگہانی موت کا معلوم ہوا تو وہ اس کی نعش چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ گئی اور بعض سکھ سرداروں نے مع فوج رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد مسلمان نوابوں اور سکھ سرداروں کو کبھی متحد ہونے کا موقع نہیں ملا۔

رنجیت سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کا شاہی خطاب اور اپنے شاہی سکہ پر گرونانک و گروگوبند سنگھ کے نام کندہ کرانے کے لیے فارسی شعر تجویز کیا۔ ؎

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بے درنگ
یافت از نانک گرو گوبند سنگ

اس طرح لاہور کے ٹیکسال میں اس نام کا سکہ ڈھال کر رائج کیا۔

لاہور کے قاضی نظام الدین نے پوچھا' عدلیہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا۔ "جس طرح عہد شاہان اسلام نے تمہیں یہ ذمہ داری سونپ رکھی تھی' اب بھی تم ہی اس کے ذمہ دار ہو۔" اس طرح قاضی لاہور کو خلعت فاخرہ دے کر دربار سے رخصت کیا۔

شاہان اسلام کے وقت شہر لاہور میں چار مفتی اور ایک قاضی مقرر تھا۔ مفتی شہر کے چوتھے حصہ کا حاکم تصور کیا جاتا تھا۔ ہر مقدمہ پہلے مفتی کے پاس جاتا۔ شاہجہان کے عہد میں لاہور میں مفتی محمد باقر تھا جس کی یادگار صرف ایک محلہ چوہٹہ مفتی باقر ہی رہ گیا تھا۔ سکھی عہد میں مفتی الٰہی بخش ہوئے اور پھر قاضی خاندانوں میں سے بعض داروغہ تک کے عہد پر پہنچے۔

گگے زئی قوم میں عبدالرحیم گگے زئی آدینہ بیگ کا مشیر بنا' پھر خواجہ مرزا احمد کے چار محالہ میں پسرور رئیس ہوا۔ سکھی عہد میں محمد بخش گگے زئی کوتوال شہر ہوا کرتا تھا۔ سہ حاکمان لاہور کے عہد میں چابکسواروں نے چینیاں والی مسجد کے سامنے ایک الگ گلی اور کوچہ کی بنیاد رکھی۔ اسی دور میں کشمیر کے سادھو قوم کے چند افراد نے خالی جگہ دیکھ کر تکیہ سادھواں قائم کر لیا' کیونکہ حویلی میاں خان کے ایک حصے کے کھنڈرات بھی میدان بن گئے تھے اور وہاں پیپل اور برگد کے گھنی چھاؤں کے پیڑ بکثرت اُگ آئے تھے۔

مسجد چینیاں والی اور طلائی مسجد کے مقابل سکھوں کی باؤلی رنجیت سنگھ کے عہد میں بنائی گئی۔ اس کی تعمیر کا سبب متشدد سکھ تھے۔ سکھوں کی اس باؤلی کے متعلق نئی سکھی دیومالائی دریافت کی گئی۔ کہا جاتا ہے عہد جہانگیر میں گروپنتھ کے کسی سکھ کا رہائشی مکان اس جگہ پر تھا جو اس نے ایک عورت کو بیچ دیا۔ اس عورت نے جب اس مکان کو گرا کر از سر نو اس کی تعمیر کرنا چاہی تو کھدائی کے دوران اسے زمین کے اندر سرد خانے میں ایک چرخہ اور ایک پیڑھا مع پلنگ جو ہیروں اور موتیوں سے مرصع تھا ملا۔ اس نیک خاتون نے فوراً اصل مالک کو بلا کر کہا۔ "میں نے اس مکان کی زمین اور اینٹ پتھر کی قیمت ادا کی ہے۔ اس میں ہیرے اور موتی جڑی چیزیں ملی ہیں جن پر میرا کوئی حق نہیں۔ یہ سب تمہارے آباء واجداد کا دفینہ ہے۔"

یہ سن کر وہ سکھ اس خاتون کی دیانتداری سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے کہا۔ "میں نے مکان اور اس کی ہر ظاہری اور باطنی شے فروخت کر دی ہے اس لیے یہ سب کچھ اب تمہارا ہے۔" لیکن عورت اسے اس کی امانت تصور کرتی رہی' چنانچہ یہ معاملہ قاضی تک پہنچا۔ چونکہ یہ مقدمہ اپنے اندر بڑے معنی رکھتا تھا' اس لیے قاضی نے شہنشاہ جہانگیر کو بھی اس مقدمہ سے مطلع کیا۔ شہنشاہ جہانگیر کے لیے بھی یہ مقدمہ حیران کن دلچسپی کا باعث بنا اور اس نے اس کی پوری تفصیل سنی اور کہا جو کچھ اس مکان میں سے ملا' وہ گرو ارجن کے پاس بھجوا دیا جائے۔

گرو ارجن کے پاس جب یہ قیمتی اشیاء پہنچیں تو انہوں نے اسے فروخت کر کے اس سے حاصل ہونے والی قیمت سے ایک باؤلی تعمیر کرنے کی تجویز دی۔

چنانچہ خاتون نے باؤلی کے لیے اپنا خرید کردہ مکان بھی گرو ارجن کو پیش کر دیا' چنانچہ یہاں ایک باؤلی تعمیر ہوئی اور نگاہیا سنگھ کی سربراہی میں چار اور سکھوں کو اس باؤلی کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔ اس باؤلی کے اس مقام پر کئی بار گرو ارجن دیو نے قیام کیا۔ باؤلی کے ساتھ ایک مکان میں گرو ارجن کے نام کا لنگر جاری کیا گیا۔

گرو ارجن دیو سکھ مت کے پانچویں گرو تھے۔ انہوں نے "آدھ گرنتھ" اور پنجابی کے لیے گورمکھی رسم الخط کو مرتب کیا۔ اس طرح سکھ دھرم کے لیے یہ کتاب اور رسم الخط مقدس ٹھہرا۔

گورو ارجن دیو نے امرتسر میں حضرت میاں میر کے ہاتھوں سنہری مندر کی بنیاد رکھی۔ جب جہانگیر اپنے خلاف بغاوت فرو کر کے پنجاب کی طرف آیا تو گورو ارجن دیو کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی کامیابی کیلئے کہا تو گورو ارجن دیو نے اسے تلک لگایا۔ صوبہ لاہور کے دیوان چند نے ذاتی عناد کی بنا پر شہنشاہ جہانگیر کے سامنے گورو ارجن دیو کے خلاف زہر اگلا اور پھر شہنشاہ کی اجازت سے اسے گرفتار کر کے لاہور لایا۔

کشمیر سے واپسی پر شہنشاہ جہانگیر کو بتایا گیا کہ گورو ارجن دیو بادشاہ کی اطاعت کا عہد نہیں کرتا اگر وہ اس پر بضد ہے تو مجھے اس کے قتل کا حکم دیا جائے۔ شہنشاہ نے ایسا ہی کیا تو دیوان چند نے گرو ارجن دیو کو اس کی موت کا پروانہ دکھایا۔ گرو صاحب نے کہا۔

"آج میری زندگی کا آخری دن ہے اجازت ہو تو میں دریائے راوی میں نہالوں۔"

دیوان چند نے اس خواہش کی پاسداری کی اور چند سپاہیوں اور اپنے ایک معتمد کو ساتھ کیا تاکہ وہ گرو کو سمجھائے کہ کیوں مفت میں جان گنواتے ہو۔ دیوان چند کی بیٹی سے اپنے بیٹے ہرگوبند کی شادی پر رضامند ہو جائے اور اس رشتے سے گرو ارجن دیو زندگی کے ساتھ ساتھ بے بہا دولت اور جاگیر بھی پائے گا۔

قلعہ لاہور سے نکل کر دریا راوی تک معتمد گرو ارجن دیو کو سمجھاتے رہے لیکن گرو صاحب خاموشی سے دریا کی طرف بڑھتے رہے اور پھر دریا کے کنارے کپڑے اتار کر پانی میں غوطہ لگایا پھر پانی سے باہر نہ آئے۔ بہت تلاش کیا لیکن سب لاحاصل رہا۔ کہا جاتا ہے جہاں گورو ارجن دیو دریا میں غوطہ زن ہوئے تھے' وہیں ان کی سادھی بنائی گئی۔ سکھ تاریخ میں یہ بھی درج ہے کہ گورو ارجن کی شہادت دیوان چند کے تشدد

سے ہوئی۔

گورو ارجن دیو کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے ہرگوبند جی جن کی عمر گیارہ سال تھی چھٹے گورو بنے۔ انہوں نے لوہ گڑھ کے ساتھ ایک چھوٹا سا قلعہ بھی بنایا اور سکھوں کے باہم مشورہ سے ہرمندر کے سامنے "اکال تخت" بنایا۔ بعد میں گوروں اور مغل شہنشاہوں کے درمیان کھلی جنگ شروع ہوئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک سیکولر حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور زندگی کے آخری برسوں میں جب وہ سخت بیمار ہوئے تو ایک متشدد مذہبی سکھ نے مہاراجہ سے کہا۔ "گرو ارجن نے میرے خواب میں آ کر کہا ہے کہ جہاں اس وقت مسجد ہے' وہاں ہمارا باؤلی اور لنگر خانہ تھا۔ تم مہاراجہ رنجیت سنگھ سے کہو کہ اس زمین کو کھدوا کر دیکھے۔ اگر وہاں باؤلی دریافت ہو تو اس کے پانی سے غسل فرمائے' صحت پائے گا۔"

اس شخص کی نشاندہی پر جہاں مکانات اور مسجد تعمیر تھی' ان سب کو گرا دیا گیا۔ اس طرح واقعی ایک باؤلی ظاہر ہوئی۔ مہاراجہ نے اس کے پانی سے غسل کیا اور دنوں میں صحت مند ہو گیا۔ اس طرح باؤلی کی تعمیر نئے سرے سے شروع ہوئی۔ تعمیر جاری تھی کہ رنجیت سنگھ کو موت نے آلیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے تیرہ روز بعد شہزادہ کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا' جبکہ راجہ دھیان سنگھ وزیر معظم اور مختار مدار المہام ہوئے۔ یہ سب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کہنے کے مطابق ہوا کیونکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیماری اور ضعیفی بڑھی تو اس نے تمام سرداروں اور فوجی افسروں کو حکم سنایا کہ ان کا جانشین شہزادہ کھڑک سنگھ ہو اور وزیر اعلیٰ راجہ دھیان سنگھ۔ مہاراجہ کے مرنے کے بعد راجہ دھیان سنگھ بھی مہاراجہ کے ساتھ جلنے کے لیے تیار ہوا تو ارکین دربار نے کہا۔ "مہاراجہ نے کاروبار سلطنت تمہارے سپرد کیا ہے۔ تم ولی عہد کا زور بازو ہو' اس لیے اب تم اس کا ساتھ دو۔" لیکن راجہ دھیان سنگھ کسی کی بات پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ولی عہد شہزادہ کھڑک سنگھ نے عرض کی کہ انتظام سلطنت کے مستحکم ہونے تک ہماری سرپرستی کریں۔ اس طرح راجہ دھیان سنگھ مہاراجہ کے ساتھ جلنے سے بچ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی لاش کے ساتھ دو رانیاں اور گیارہ کنیزیں زندہ جل

مریں۔ شہزادہ کھڑک سنگھ نے چتا جلائی۔

کھڑک سنگھ

مہاراجہ کھڑک سنگھ کے تخت نشین ہونے کے صرف چند ماہ بعد کھڑک سنگھ سردار چیت سنگھ سندھانوالیہ کو مدارالمہام بنانا چاہتا تھا۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ اس کے کہنے اور سننے سے انکار نہ کرتا۔ یہ بات راجہ دھیان سنگھ کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی اس لیے اس نے اراکین دربار سے صلاح مشورہ کے بعد سردار چیت سنگھ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یہ کام کنور نونہال سنگھ کو سونپا گیا' چنانچہ کنور نونہال سنگھ نے سردار چیت سنگھ کو قلعہ کے ثمن برج میں قتل کر دیا۔

اس پر مہاراجہ کھڑک سنگھ غمزدہ اور ناراض ہو کر قلعہ کو خیرباد کہہ کر اپنی حویلی چلا آیا اور کاروبار سلطنت سے علیحدہ ہو گیا' چنانچہ کنور نونہال سنگھ نے اپنے باپ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی مسند سنبھالی۔ راجہ دھیان پھر بااختیار مدارالمہام ہوا لیکن دلوں میں دونوں کے درمیان غبار اور کدورت ظاہر ہونے لگا کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی دریائے ستلج کے پار بیٹھی "دربار لاہور" کی ہر حرکت کو بغور دیکھ رہی تھی۔

مہاراجہ کھڑک سنگھ کے مرنے سے ایک روز پہلے کنور نونہال سنگھ باپ سے ملنے اس کی حویلی میں آیا' لیکن مہاراجہ نے حویلی کے دروازے بند کرا دیئے۔ وہ اپنے ناخلف بیٹے کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

کنور نونہال سنگھ کے ہاتھوں چتا جلنے سے پہلے ستی ہونے والی عورتوں نے کنور نونہال سنگھ اور راجہ دھیان سنگھ کو بہت سی بددعائیں دیں جس میں بہت جلد ان کی سلطنت کی بربادی اور ان کے قتل ہونے کی پیشین گوئی کی۔

باپ کی چتا کے راکھ ہونے کے بعد کنور نونہال سنگھ نے دریائے راوی میں غسل کیا اور راجہ اودھم سنگھ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قلعے کی طرف بڑھا۔ قلعے میں سلامی کے لیے توپیں داغی گئیں جس سے قلعے کے در و دیوار کانپ اٹھے۔ اتفاق سے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچتے ہی دیوار کا کچھ حصہ کنور نونہال سنگھ اور راجہ اودھم سنگھ کے سروں پر گرا جس سے دونوں نیم جان ہو گئے۔

کنور نونہال قلعے کے اندر جاتے ہی جان بحق ہو گیا۔ تخت نشینی کے پیش نظر راجہ دھیان سنگھ نے فوری طور پر بٹالہ سے شہزادہ شیر سنگھ کو بلا بھیجا۔

کنور نونہال کی موت سے نہ صرف رعایا بلکہ دربار کے امراء اور فوجی سرداروں میں بھی اضطراب پھیل گیا۔ کچھ لوگ اس کا ذمہ دار راجہ دھیان کو گردانتے تھے۔

دربار لاہور میں راجہ دھیان سنگھ نے شہزادہ شیر سنگھ کو مسند نشین کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہی اس کا صحیح حقدار ہے۔ لیکن دربار لاہور میں سرداران سندھانوالیہ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے رانی جند کور کے ہاتھ میں زمام اقتدار دے دی۔

رانی جند کور نے راجہ دھیان سنگھ کو اپنے روبرو بلا کر کہا۔ "رانی کنور نونہال سنگھ حاملہ ہے' اس لیے بچہ کے پیدا ہونے تک میں نیابت کروں گی۔ اگر خدا نے اس کے گھر بیٹا دیا تو وہ سلطنت کا مالک ہو گا' ورنہ میں تمہارے بیٹے راجہ ہیرا سنگھ کو مالک سلطنت لاہور بنا دوں گی۔" یہ سنتے ہی راجہ دھیان خاموش ہو گیا اور اس طرح کونسل دربار میں طے پایا کہ رانی جند کور وزیر و مدارالمہام پیدا ہونے والے بچے کی ہو۔ راجہ دھیان سنگھ نائب وزیر اور شہزادہ شیر سنگھ اور سردار لہنا سنگھ' سردار اجیت سنگھ و سردار عطر سنگھ سندھانوالیہ مشیران بااختیار ہوں گے۔

شہزادہ شیر سنگھ بٹالہ سے خواہش لے کر آیا تھا' اس نے کونسل میں شامل ہونا منظور نہ کیا اور لوٹ گیا۔ راجہ دھیان سنگھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو لکھا کہ اگرچہ وارثان سلطنت شہزادہ شیر سنگھ اور دلیپ سنگھ موجود تھے مگر اراکین دربار نے اس بچے کو سلطنت سونپ دی جو ابھی پیدا نہیں ہوا' اس لیے تمام اختیارات اور امور سلطنت کونسل کے ہاتھ میں ہیں--- ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت پر برسراقتدار لوگوں کو پسند نہ کیا' لیکن امور سلطنت کے اجرائے کار پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔

سرداران سندھانوالیہ

چند ماہ کے بعد راجہ دھیان سنگھ بھی دربار لاہور سے ناراض ہو کر جموں چلا گیا کیونکہ مدارالمہام و مختار عام سلطنت سرداران سندھانوالیہ تھے اور رانی جند کور تو نام

کی حاکمہ تھی۔

دربار لاہور میں راجہ گلاب سنگھ نے سرداران سندھانوالیہ کے ساتھ دوستی کرلی' چنانچہ رانی جندکور اب راجہ گلاب سنگھ کو بھی اپنے روبرو بلا کر مشورہ کرنے لگی۔ رانی جندکور کے حاکم بنتے ہی دربار لاہور میں امراء اور وزراء ہی نہیں فوجی افسر بھی سازشوں اور جوڑ توڑ میں لگ گئے۔ چونکہ رانی جندکور خود آکر فوجیوں سے نہیں ملتی تھی' اس لیے وہ بھی کسی مرد کو سربراہ سلطنت دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے اس مقصد میں بہت جلد کامیاب ہو گئے۔ اس طرح وہ رانی جندکور مع مشیروں' سرداروں کا ساتھ چھوڑ کر سب شہزادہ شیر سنگھ سے مل گئے۔ دوسری طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے بھی شہزادہ شیر سنگھ کے مقرر ہونے پر رضامندی ظاہر کی تو راجہ دھیان سنگھ بھی شہزادہ شیر سنگھ کا حامی ہو گیا' چنانچہ وقت مقررہ پر شہزادہ شیر سنگھ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ بٹالہ سے چل کر لاہور میں بدھو کے آوا پر پڑاؤ کیا۔ سرداران سندھانوالیہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ اس کی سرکوبی کے لیے شہر سے نکلیں۔ تمام فوج اس مقصد سے لاہور سے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلی لیکن میدان جنگ میں پہنچ کر سب شہزادہ شیر سنگھ سے مل گئے سوائے راجہ گلاب سنگھ اور سرداران سندھانوالیہ کے۔ وہ قلعہ میں آئے اور قلعہ کو فوج اور توپ خانے سے مضبوط کیا۔

رات آٹھ بجے شہزادہ شیر سنگھ کثیر تعداد میں سکھ فوج کے ساتھ دہلی دروازہ کے راستے لاہور میں داخل ہوا اور شہر کو بے دریغ لوٹنا شروع کر دیا' بلکہ دہلی دروازے سے قلعہ تک جس قدر دکانیں' حویلیاں' محلے اور گلیاں کوچے تھے' سکھوں نے لوٹ لیے۔ چھتہ بازار جہاں جوتیاں بکتی ہیں اس بازار کو جلا کر رات بھر چراغاں کیا۔ دوسری طرف قلعہ کے اندر تمام رات بھاری توپ خانے سے قلعہ کا محاصرہ کرنے والی فوج پر آگ برسائی جاتی رہی۔

شہزادہ شیر سنگھ کے سپاہیوں نے شاہی مسجد کے میناروں سے توپوں کے ذریعے بارود کا مینہ برسایا۔ تیسرے روز شام کو راجہ دھیان سنگھ جموں سے لاہور پہنچا اور قلعہ کے اندر راجہ گلاب سنگھ اور سرداران سندھانوالیہ سے صلح کی تجویز پیش کی۔ اس طرح شہزادہ شیر سنگھ کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ فوج نے قلعہ کے

اندر لوٹ مار کے ساتھ قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ قلعہ کے فتح ہوتے ہی سردار عطر سنگھ و اجیت سنگھ سندھانوالیہ دریائے ستلج پار کر گئے۔ مہاراجہ شیر سنگھ کے بادشاہ بنتے ہی راجہ دھیان سنگھ وزیر ہو گئے۔ مسٹر کلارک ایجنٹ گورنر جنرل نے مہاراجہ شیر سنگھ کو لکھ بھیجا کہ اگر چاہو تو انگریزی فوج آکر انتظام سنبھال لے۔

محمد حفیظ چابکسوار

مہاراجہ شیر سنگھ نے سکھ فوج کے ڈر سے اس تجویز کو رد کر دیا۔ دربار لاہور کے لیے سب سے بڑا تشویش کا باعث سندھانوالیہ سردار عطر سنگھ اور اجیت سنگھ تھے۔ مہاراجہ شیر سنگھ نے شہر میں سندھانوالیہ سرداروں کے طرف داروں کا پتہ چلایا تو مخبر نے مہاراجہ کو خبر دی کہ کوچہ چابکسواروں میں محمد حفیظ نامی چابکسوار جس کا شہر بھر میں کوئی ثانی نہیں وہ سرداران سندھانوالیہ کا ذاتی چابکسوار ہے اور اس وقت وہ لاہور میں سرداران سندھانوالیہ کے اس کام پر مامور ہے کہ لاہور کے جن صرافوں کے پاس سرداروں کی امانتیں ہیں ان کی حفاظت کرے۔ اس طرح حفیظ چابکسوار کی معرفت سرداران سندھانوالیہ اور صرافوں کے درمیان لین دین ہو رہا ہے۔

مہاراجہ شیر سنگھ نے فوراً محمد حفیظ چابکسوار کو بلا کر اس کاروبار کے متعلق پوچھا اور کہا۔ "سچ سچ بتاؤ تمہیں نہ صرف اس مال میں سے حصہ ملے گا بلکہ تمہارے چابکسواری کے کاروبار کو بھی فروغ دیا جائے گا۔" لیکن محمد حفیظ چابکسوار نے سرداران سندھانوالیہ سے کسی قسم کا تعلق بتانے سے انکار کیا۔ چونکہ مخبر کی اطلاع بھی غلط نہ تھی، اس لیے مہاراجہ شیر سنگھ نے قرآن مجید منگوا کر محمد حفیظ چابکسوار سے کہا۔ "اگر تو سچا ہے تو اس پر ہاتھ رکھ کر کہو۔"

محمد حفیظ چابکسوار نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر بھی یہی کہا کہ اس کا سرداران سندھانوالیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پر مہاراجہ شیر سنگھ نے محمد حفیظ چابکسوار کو چھوڑ دیا۔ سب حیران تھے کہ محمد حفیظ چابکسوار نے ایسا کیوں کیا؟ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اس نے سندھانوالیہ سرداروں کی دوستی کی خاطر کیا ہے اور حق نمک ادا کیا ہے... چنانچہ مہاراجہ شیر سنگھ نے محمد حفیظ کے دونوں ہاتھ کاٹ دینے کا حکم جاری کیا۔

اس طرح دونوں ہاتھ کٹ جانے کے سبب وہ محمد حفیظ ٹنڈا کے نام سے مشہور ہوا۔ محمد حفیظ چابکسوار کے اس عمل سے سردار سندھانوالیہ کے حمایتی اور لاہور کے صراف بڑے خوش تھے، اس لیے وہ دل و جان اور مال و زر سے اس کے ساتھ تھے۔ اس لیے کہ لاہور میں کوئی بھی چابکسوار عزت و توقیر اور مال و دولت میں اس کا ثانی نہ تھا۔

مہاراجہ شیر سنگھ نے مہاراجہ ہوتے ہی سب سے پہلے ایک تو فوج کے سرکش عناصر کو اپنا ہم خیال بنایا تھا دوسرا دربار میں جموں کے راجوں اور سرداران سندھانوالیہ کا گروہ درپردہ اقتدار کی جنگ میں برابر کا شریک اور ہم پلہ تھا۔ اچانک رانی جندکور کی موت واقع ہو گئی۔ اس کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکالا گیا لیکن اس کی موت کے بارے میں مشہور یہ تھا کہ کنیزوں نے مہاراجہ شیر سنگھ کے کہنے پر اسے گلا گھونٹ کر مارا تھا۔ رانی جندکور کی موت مہاراجہ شیر سنگھ کے لیے اطمینان بخش تھی، اب اس نے راجہ دھیان کے اختیارات کلی طور پر ختم کرنے کا سوچا۔ دوسری طرف اس کے دربار پر قبضہ کے دوران لہنا سنگھ، اجیت سنگھ و عطر سنگھ سب سرداران سندھانوالیہ لاہور سے بھاگ کر ستلج پار ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقہ میں چلے گئے تھے۔ اب انگریز صاحب ایجنٹ بہادر لاہور نے سرداران سندھانوالیہ کی معافی اور بحالی عہدہ کے لیے کہا، تو مہاراجہ شیر سنگھ نے فوراً اس بات کو تسلیم کر لیا کیونکہ ایک طرف تو وہ انگریز بہادر کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا دوسری طرف دربار میں راجہ دھیان سنگھ کو اپنے سے کمزور دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح مہاراجہ شیر سنگھ نے سندھانوالیہ سرداروں کو پھر سے لاہور میں بلایا۔ جاگیریں اور حویلیاں مع عہدے واگزار کیے۔

راجہ دھیان سنگھ نے بھی سوچ رکھا تھا کہ جب سرداران سندھانوالیہ یہاں آئیں گے تو مہاراجہ کو اکسا کر اسے قتل کرنے کی سازش کریں گے اس لیے انہوں نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ سندھانوالیہ سرداروں کو فوراً لاہور بلایا جائے۔

سندھانوالیہ سرداروں کی لاہور آمد کے بعد محمد حفیظ چابکسوار کی وفاداری کا سن کر سندھانوالیہ سرداروں کے دل میں اپنے چابکسوار کے لیے بے پناہ جذبہ محبت جاگا اور انہوں نے اس کا برملا اظہار کیا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب محمد حفیظ چابکسوار المشہور حفیظ ٹنڈا چابکسوار جھوٹی قسم

کے ازالہ کے لیے کوشاں تھے۔

لاہور میں انگریزوں کے قبضہ کے بعد جب سکھوں کا عمل دخل جاتا رہا تو حفیظ ٹنڈا چابکسوار نے اپنی اس غلطی کے ازالہ کے لیے محلہ میں ایک قدیم چھوٹی سی مسجد کو از سرنو تعمیر کیا جس سے اس کا نام مسجد حفیظ چابکسوار ہوا۔

منشی نور الٰہی

میرے دادا نور الٰہی نے اسی کوچہ چابکسواراں میں طالع مند کے ہاں جنم لیا۔ اس وقت لاہور کے کوچہ و بازار میں ایک نئی تہذیب ابھر رہی تھی' جس پر انگریزی اثرات بڑے نمایاں' سامنے آئے۔ بچوں میں تعلیمی رجحان ہوا' خاص طور پر تین مشن اسکول قائم ہوئے۔ اس طرح میرے دادا کو ضلع کچہری میں معمولی ملازمت مل گئی۔ وہ اپنی محنت اور ذہانت سے ترقی کرتے کرتے سول جج کے عہدے پر پہنچے۔ عہدے کے لحاظ سے وہ منشی کہلوائے' اس طرح میرے دادا منشی نور الٰہی سرکار کے ملازم ہوئے۔

میرے دادا منشی نور الٰہی پانچ بھائیوں اور چار بہنوں کے مشترکہ خاندانی گھر میں رہتے تھے۔ منشی نور الٰہی سب سے بڑے بیٹے تھے اس سے چھوٹے غلام محمد اور جان محمد' تین بہنیں مہتاب' بی بی اور بیگم ان پانچ بچوں کے بعد والدہ کے انتقال کے بعد طالع مند نے دوسری شادی رچائی جس سے کرم الٰہی اور دوست محمد دو بھائی اور ایک بہن کرم النساء پیدا ہوئیں۔ کوچہ میں چابکسواروں کا مشترکہ خاندان تھا۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ چابکسوار تھے لیکن نسلی طور پر ان کا تعلق ککے زئی افغان پٹھانوں سے تھا۔ اس لیے ان کے رشتے ناتے ککے زئیوں سے بہت گہرے تھے۔

محمد حفیظ چابکسوار کا ذکر تفصیل سے بیان ہو چکا ان کے بیٹے حاجی الہ دین جو بڑے صاحب جائیداد تھے ان کی کوچہ چابکسواراں میں ہی نہیں کشمیری بازار اور چوک رنگ محل کے علاقے میں کئی مکان اور دکانیں تھیں۔ حاجی الہ دین کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی صرف دو بیٹیاں عمدہ جان اور بی بی جان تھیں۔ میرے دادا منشی نور الٰہی کی شادی عمدہ جان کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوئی جو کہ محمد حفیظ چابکسوار کی پوتی تھی۔ جس وقت میرے دادا منشی نور الٰہی کی شادی ہوئی اس وقت وہ ضلع کچہری میں ناظر تھے۔ اس

طرح کوچہ چابکسوار میں یہ ایک خوشحال مشترکہ گھرانہ تھا۔
باپ کے مرنے کے بعد اس مشترکہ خاندان کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو میرے دادا نے فوراً اپنے تمام بہن بھائیوں سے اپنا آبائی گھر خرید لیا۔ اس آبائی مکان کے خریدنے کے بعد اس کی نئے سرے سے تعمیر کی گئی۔ اب اس گھر میں دادا منشی نور الٰہی اور دادی عمدہ جان کے علاوہ دادا جان کا سب سے چھوٹا بھائی جان محمد رہنے لگے۔ جان محمد کو دادا منشی نور الٰہی نے بیٹوں کی طرح پالا' ضلع کچہری میں ملازمت دلائی اور اس کی شادی کر کے اسی گھر میں بسو لائے۔
میرے دادا منشی نور الٰہی خود صاحب ثروت اور صاحب منصب شخص تھے۔ اس کے ساتھ خوش قسمتی یہ کہ ان کی شادی ایک متمول خاندان کی بیٹی سے ہوئی۔ اس طرح دادا جان نے آبائی مکان کی خریداری کے ساتھ گوالمنڈی میں بھی سو کنال کے لگ بھگ اراضی بالواسطہ خریدی۔
گوالمنڈی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ انگریز عہد میں جب لاہور کو پنجاب کی مرکزیت حاصل ہوئی تو اس شہر کی طرف مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں نے رخ کیا۔ اس طرح راجپوتانہ اور بیکانیر کے ہندو اور مسلمان گوالے یہاں پہنچے اور انہوں نے بیرون شہر اپنے لیے اس جگہ پر ہٹ (عارضی رہائش) بنائے اور رہنے لگے اس طرح یہ علاقہ گوالوں کی منڈی اور بعد میں گوالمنڈی ہوا۔ یہ تمام اراضی ایک ساہوکار ہندو کی ملکیت میں تھی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس کے تمام کاروبار کا دیوالیہ نکل گیا اور پھر جب اس زمین کی قرقی کا عدالتی حکم نامہ جاری ہوا تو میرے دادا منشی نور الٰہی اس کے ناظر مقرر ہوئے اس طرح انہوں نے اس علاقے کی تقریباً سو کنال زمین کی بولی اپنی بیوی عمدہ جان کے ماموں شاہ دین کے نام گیارہ سو روپے پر ختم کرا دی۔ اس طرح یہ زمین شاہ دین کے نام منتقل ہو گئی۔ اس اراضی کی خرید سے میرے دادا کو سرکاری اور خاندانی سطح پر کئی الجھنوں اور مقدموں سے واسطہ پڑا جس کے برے اثرات بعد میں چابکسوار خاندان اور ککے زئی برادری پر پڑے۔
سرکاری طور پر دادا جان کے خلاف سرکاری املاک کو سستے داموں رشتہ داروں کے نام کرنے پر عدالتی تحقیقات شروع ہوئی۔ چونکہ منشی نور الٰہی تمام دیوانی عدالتوں

کے اسرار و رموز سے واقف تھے' اس لیے وہ بڑی آسانی سے باعزت طور پر اس مقدمے سے بری ہو گئے' لیکن جن رشتے داروں کے نام یہ بیع نامی (عارضی ملکیت) کے طور پر اراضی منتقل کی تھی انہوں نے لالچ میں آکر دادا جان کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ بعض رشتے دار اپنی اس عارضی ملکیت سے آگے بڑھ کر مستقل مالک بن بیٹھے۔ ان کے خلاف دادا جان کو عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اس طرح دادا جان نے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا تحفظ احسن طریقے سے کیا۔ ان مقدمات میں ایک تو وہ خود قانون دان تھے دوسرا انہوں نے اپنے وکیل کے طور پر لاہور کی سب سے بڑی متحرک سیاسی اور سماجی شخصیت محرم علی چشتی کی خدمات حاصل کیں' اس لیے ان کی کامیابی یقینی تھی۔

گوالمنڈی کی سو کنال اراضی کی ملکیت کی داستان بڑی عجیب ہے۔ ہوا یوں کہ بطور ناظر دادا جان نے سب سے پہلے گوالمنڈی کی سو کنال اراضی کی بیع نامی (عارضی ملکیت) شاہ دین کے نام کی تھی جو دادی جان کے سگے ماموں تھے۔ جب وہ اپنی اس عارضی ملکیت سے منحرف ہوئے تو ان کے خلاف مقدمہ بازی شروع ہو گئی جس سے دادی جان کے' اپنے ننھیال والوں سے تعلقات بگڑنا شروع ہو گئے' چنانچہ دادی جان کے والد محترم حاجی الہ دین نے اپنی بیٹی اور اپنے برادر نسبتی کے درمیان مصالحت کے لیے یہ حل تلاش کیا کہ وہ تمام معاوضہ جو شاہ دین نے عارضی ملکیت کی خریداری میں ادا کیا تھا' فوری طور پر شاہ دین کو لوٹا دیا جائے۔ اس طرح دادا جان کو اس اراضی کے لیے دوبارہ ادائیگی کرنا پڑی کیونکہ اس سے پہلے شاہ دین کے نام عارضی ملکیت کراتے وقت تمام قیمت انہوں نے اپنے پلے سے ادا کی تھی۔

شاہ دین کو دوبارہ تمام رقم ادا کی گئی۔ اس طرح اب دادا جان نے یہ اراضی اپنے سسر حاجی الہ دین کے نام منتقل کر دی اور اطمینان کا سانس لیا' لیکن قسمت میں اور ہی لکھا تھا۔ جلد ہی حاجی الہ دین اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے مرنے کے بعد حاجی الہ دین کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی وارث دو بیٹیاں تھیں یعنی میری دادی عمدہ جان اور ان کی بہن بی بی جان۔ یہ دونوں شادی شدہ تھیں۔ چنانچہ حاجی الہ دین کی عارضی ملکیت والی اراضی کی تقسیم پر دونوں کے درمیان نیا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس

طرح پوری برادری دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ نوبت جب خون خرابے پر پہنچی تو دادا جی اپنے وکیل محرم علی چشتی کے ساتھ عدالت میں پہنچے۔ آخر کار گوالمنڈی کی سو کنال اراضی میں سے صرف پچیس کنال کی مستقل ملکیت کے مالک' دادی جان اور میرے والد محترم ٹھہرے۔ سو کنال اراضی کی فروخت اور خریداری کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ دادا جان جیسے جیسے یہ اراضی کرایہ داروں سے خالی کرواتے جاتے' ساتھ ساتھ اس میں سے کچھ فروخت بھی کر دیتے تھے۔ دادا جان کی خوشحالی اور امارت کا یہ بھی ایک راز تھا۔ اس طرح وہ گوالمنڈی میں ایک حویلی نما مکان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح کی اور بھی کئی ایسی املاک کو دادا جان نے خریدا۔

1915ء سے شروع ہونے والا یہ قضیہ دس برس کی مدت میں 1925ء میں حل ہوا اور عدالت نے پچیس کنال اراضی پر کرایہ داروں کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے آئندہ دس برس یعنی 1935ء تک ایک سو ستاون روپے ماہانہ کرایہ ادا کرنے اور اس کے بعد دو سو روپے ماہانہ کرایہ داری عدالتی حکم نامہ جاری کیا--- اس طرح یہ کرایہ میری دادی اور والد محترم وصول کرنے لگے۔

اس وقت میری عمر بمشکل پانچ سال تھی۔ فصیل شہر لاہور کے کوچہ چابکسواراں اور اس کے گرد و پیش گلی محلوں اور بازاروں کے باسیوں سے ملنے کے علاوہ مسجد چینیانوالی میرے دل و دماغ پر نقش ہو گئی۔ میرے دادا باقاعدگی سے علی الصبح تین چار بجے نیند سے بیدار کر کے مجھے اپنے ساتھ انگلی پکڑ کر مسجد چینیاں والی میں نماز کے لیے لے جاتے۔ اس طرح بہت دفعہ میں نے ان کے ساتھ تہجد کی نماز بھی ادا کی۔ میرے داد نے اپنے بیٹے یعنی میرے والد کو کبھی نرمی یا درشتی سے صبح کی نماز کے لیے اصرار نہیں کیا تھا لیکن مجھ پر یہ اصرار کیوں؟ یہ دراصل ان کا میرے لیے بے پناہ پیار اور محبت کا جذبہ تھا۔

میں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ماں باپ سے زیادہ میں دادی جان اور دادا جان کا لاڈلا ہوں۔ اس طرح میری تعلیم و تربیت دادی اور دادا کی مرہون منت تھی۔ گھر پر میری پرورش کے سلسلے میں میری والدہ اور دادی کے درمیان ساس اور بہو کی سرد جنگ کا آغاز ہوا۔ اس کے برعکس والد صاحب کی شخصیت اپنے باپ کے سامنے کم تر

تھی نہ اس میں برتری کا احساس تھا اس لیے انہوں نے مسلسل خاموشی ایک مصلحت کے تحت اختیار کی۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ جس طرح میرا باپ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اسی طرح میری والدہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اس طرح میرا نہ تو کوئی براہ راست ماموں تھا نہ خالہ اور نہ ہی چچا اور نہ پھوپھی' میرا بچپن بے حد گھٹے ہوئے ماحول میں گزرا جس نے مجھے مدتوں ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا رکھا کیونکہ ضرورت سے زیادہ دیکھ بھال اور حد سے زیادہ میری حفاظت نے مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

مثال کے طور پر یہ اہتمام کیا جاتا کہ میں گھر سے باہر کسی قسم کے کھیل کود میں حصہ نہ لوں۔ وہ مجھے ہر وقت نظربد سے بچانے کی فکر میں رہتے۔ اس طرح کئی قسم کے ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے۔ میری ٹھوڑی اور ماتھے پر توے کی کالک لگا دی جاتی۔ اگر میں خود گھر سے باہر گلی محلے میں نکلنے اور کھیلنے کے لیے ضد کرتا تو مجھے ڈائن بن کر ڈرایا جاتا یعنی میری ماں یا کوئی اور فرد منہ پر ڈراؤنا نقلی چہرہ چڑھا کر یا کمبل اوڑھ کر مجھے ڈراتے اور میں انہیں سچ مچ کی ڈائن سمجھ کر چیخنے چلانے لگتا اور پھر ضد چھوڑ دیتا کہ والدین جو کہتے ہیں وہی سچ ہے۔ ان باتوں نے مجھے والدین پر زیادہ تکیہ کرنے پر مجبور کر دیا۔

بعد میں ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو دادا جان مجھے انگلی پکڑے ساتھ لے جاتے۔ مجھے یاد ہے عیدین کے موقع پر منٹو پارک میں نماز عید ادا کرنے کے بعد دادا جان محرم علی چشتی سے عید ملنے پیسہ اخبار محلے میں ان کی حویلی جاتے جہاں محرم علی چشتی صحن میں کھلونے اور مٹھائی سے میزیں سجائے ہوئے ملتے۔ وہ مجھے پیار کرتے اور عیدی دیتے۔ یہ بات داداجی کی محرم علی چشتی سے گہرے مراسم کی مظہر تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محرم علی چشتی کے والد مولوی احمد بخش یکدل اور بھائی نور احمد چشتی مصنف "تحقیقات چشتی" اور "یادگار چشتی" کوچہ چابکسواراں میں رہائش پذیر تھے۔ دادا کے ساتھ گھر سے باہر جانا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں آزاد فضا میں اپنے آپ کو اڑتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ گھر میں گھٹن اور جبر کا عالم تھا۔ ذہنی تشدد کے ساتھ جسمانی تشدد کا آغاز بھی گھر سے ہوا۔ میرے دادا جان نے مجھے قرآن پڑھانے کے لیے محمد امین کی خدمات حاصل کیں۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے خوشی ہوئی لیکن وہ اس قدر شدت

پسند اور ظالم تھا کہ اس کی شکل دیکھتے ہی میں سب سبق بھول جاتا۔ جب میں نے اس بات کا اظہار ان سے کیا تو اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ مجھے وہ قرآنی قاعدہ پڑھنے کے لیے دے کر دیوار کی طرف منہ کر کے بٹھا دیتے۔ میں سبق دہرانا شروع کر دیتا۔ جب ذرا بھولتا تو وہ دوسری دیوار سے بھاگتے ہوئے آتے اور میری پیٹھ پر پاؤں سے ٹھڈے مارتے، میں درد سے بلبلا اٹھتا۔ میرے بلبلانے یا چیخنے چلانے پر وہ اور زیادہ تشدد کرتے تھے۔

میں نے یہ ظلم سہنا سیکھ لیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ خدا خدا کر کے میں نے قرآن ختم کیا۔ اس کے بعد دادا جان نے مجھے سریانوالہ بازار کی ایک گلی میں جہاں دو پرائمری اسکول قریب قریب تھے ان میں سے ایک میں داخلہ لے دیا، یہ دوسرے کی نسبت بہتر اسکول تھا، لیکن یہاں بھی بچے ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ پہلی جماعت سے قاعدہ اور تختی شامل نصاب تھے۔ اس وقت پرائمری اسکول میں صرف چار جماعتوں تک پڑھائی ہوتی تھی۔ میں نے پانچ سال کی عمر میں اسکول جانا شروع کیا تھا۔ اسکول کی پڑھائی کے ساتھ دادا جان نے گھر پر ٹیوشن لگا دی۔ ہمارے ماسٹر پیراں دتہ ایک بوڑھے شخص تھے۔ کہا جاتا تھا کہ انہوں نے ہی میرے والد کو گھر پر پڑھایا تھا۔ وہ بڑے حلیم اور شفیق استاد تھے۔

دادا جان جو کٹر اہل حدیث تھے اکثر ہمارے ماسٹر پیراں دتہ سے کہا کرتے تھے۔ "دیکھو، میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے تم اپنا نام تبدیل کر کے پیراں دتہ سے اللہ دتہ رکھ لو، کیونکہ اولاد ہمیشہ اللہ دیتا ہے، پیر نہیں۔" یہ بات دادا جان جتنی بھی سختی سے کہتے، پیراں دتہ ہمیشہ اسے ہنس کر ٹال دیتے۔ ایک بار میں نے دادا جان کی غیر موجودگی میں کہا۔ "ماسٹر جی! یہ دادا جان آپ کو نام بدلنے کے لیے کیوں کہتے ہیں؟ مجھے تو یہ نام اچھا لگتا ہے۔" تو انہوں نے میری ٹھوڑی کو پیار سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "اوئے پترا! تیرا دادا وہابی اے۔" (ارے بیٹے! تمہارا دادا وہابی ہے۔)

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ماسٹر جی! یہ "وہابی" کیا ہوتا ہے؟" تو انہوں نے کہا جب تم بڑے ہو گے تو سمجھ جاؤ گے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار سوچا کہ جس طرح ماسٹر پیراں دتہ نے میری ٹھوڑی کو پیار سے ہلاتے ہوئے بتایا کہ تمہارا دادا وہابی ہے، میں بھی

دادا جان کی ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے پوچھوں کہ دادا جان "وہابی" کیا ہوتا ہے؟ لیکن میں ایسا نہ کر پایا۔

دادا' دادی کا حد سے بڑھا پیار ان کی نفسیات کا ہی ایک پہلو تھا۔ دادا دادی کے ہاں چودہ بچے پیدا ہوئے جو کم سنی میں ہی مر جاتے تھے۔ ان میں صرف ایک بیٹا محمد عمر ہی سن بلوغت کو پہنچا جس نے شیرانوالہ اسکول سے میٹرک کے بعد ملٹری اکاؤنٹ میں ملازمت اختیار کی۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی میرے دادا جان نے اپنے بہنوئی میاں نور محمد جو اپنے وقت میں گھوڑوں کے بہت بڑے تاجر تھے' ان کی نواسی اقبال بیگم سے کی۔ اس شادی پر میرے دادا نور الٰہی نے کٹر اہل حدیث ہونے کے باوجود ککے زئی برادری کی تمام روایتی رسومات کو ادا کیا جن کی وجہ سے ککے زئی اپنی الگ سے شہرت رکھتے ہیں۔

دادی جان

میری پیدائش کوچہ چابکسواراں میں میرے والدین کی شادی کے تین سال بعد ہوئی اور اسے دادا جان اور دادی جان کی بے پناہ دعاؤں اور چاہتوں کا ثمر قرار دیا گیا' چنانچہ میری پرورش کی ذمہ داری دادی جان نے اٹھالی' کیونکہ شادی کے بعد میری والدہ نماز' روزہ اور قرآن میں اس قدر کھو گئیں کہ انہیں کسی کا کوئی خیال تک نہ رہا۔ میں نے جب ذرا ہوش سنبھالا تو گھر میں دادی کے علاوہ صرف اپنے والد کو اپنی پرورش کا بار اٹھاتے دیکھا۔ دادی جان تو ہر رات سونے سے پہلے مجھے آیت الکرسی پڑھنے کو کہتیں' بستر میں ساتھ لیٹ کر مزے مزے کی کہانیاں سناتیں اور یہ کہانیاں سنتے سنتے میں خوابوں کی وادی میں کھو جاتا۔

دادی ماں کہانی سنانے سے پہلے ہمیشہ مجھ سے پوچھتیں کہ ہڈبیتی سنو گے یا جگ بیتی؟ اور میرا یہ حال تھا کہ میں ہمیشہ ان سے ہڈبیتی سنانے کی خواہش کرتا تھا۔ دادی مجھے گلی محلے میں نکلنے سے روکتی تھیں۔ میرے لیے گھر کی چار دیواری ہی تھی جس میں میں کھیلتا' کودتا' ہنستا اور روتا۔ اس طرح میرے اندر تنہائی پسندی نے جنم لیا۔ گھر میں کوئی اور بچہ بھی نہ تھا جو مجھ سے کھیلتا۔ صرف میرے داد جان کے چھوٹے بھائی جان محمد کی لڑکی

میری ہجولی تھی۔ اس کے ساتھ کبھی کبھی کھیلنے کا موقع مل جاتا تھا لیکن وہ بھی آٹھ سال کی عمر میں کسی بیماری کی وجہ سے فوت ہوگئی۔ اس کے بعد گھر میں رفیق ہی ایک ایسا فرد تھا جس سے تھوڑی سی رفاقت حاصل ہوئی اگرچہ وہ مجھ سے دس برس بڑا تھا۔

گھر میں ماں سے زیادہ دادی جان سے انسیت (Attachment) نے ساس اور بہو کے تعلقات میں خرابی پیدا کر دی تھی۔ میری ماں اکثر خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہتیں۔ دوسرے' وہ دادی جان کے مقابل زیادہ آرام پسند اور نفیس طبع تھیں۔ انہیں صرف میرے کپڑے سینا' نہلانا' میرے ناخن کاٹنا اور جمعہ کی نماز کے لیے مجھے تیار کرنا ہوتا تھا۔ میری ماں نے قمیص یا کرتہ سیتے وقت جیب ہمیشہ سینے پر رکھی' انہیں بغلی جیب سینے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ لیکن میں جب انہیں بغلی جیب لگانے کے لیے کہتا تو ان کا جواب ہوتا۔ "شریف لوگ یہاں جیب نہیں لگاتے۔" چنانچہ میں مدتوں یہی سمجھتا رہا کہ بغلی جیب والے کرتے یا قمیص لچے لفنگے پہنتے ہیں۔ ناخنوں کا حجام سے کٹوانا بھی وہ معیوب سمجھتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک پتنگ بازی اوباش اور لفنگوں کا کھیل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کسی بھی آؤٹ ڈور گیم میں مہارت حاصل نہ کر سکا۔

والد محترم

دادا جان اور دادی جان کے علاوہ والد صاحب کی بے پناہ محبت اور پدرانہ شفقت نے مجھے آہستہ آہستہ متاثر کرنا شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ چار پانچ بجے جب ان کے دفتر سے لوٹنے کا وقت ہوتا تو میں کھیل کود اور پڑھنا لکھنا سب چھوڑ کر ان کا انتظار کرنے لگتا۔ جب وہ گھر پہنچتے تو میں پہلے انہیں کرسی پر بیٹھنے کا کہتا اور پھر ان کے جوتے اور جرابیں اتارتا' پاؤں صاف کرتا' اسی دوران دن بھر کی اپنی مصروفیات سناتا جسے وہ بڑی دلچسپی سے سنتے اور مشورہ دیتے۔ وہ مجھے ایک جملہ اکثر کہا کرتے تھے۔ "بیٹا اگر مجھ سے نہ سمجھو گے تو وقت تمہیں خود بخود سمجھا دے گا' لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی ہوگی۔"

اس وقت تو میرے لیے اس جملے کے معانی سمجھنا بہت مشکل تھا' لیکن میں ہمیشہ والد کے قریب رہنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ بچپن میں ایک

عجیب عادت پڑ گئی تھی' میں آدھی رات کو صندل کے شربت میں دودھ ملا کر پیتا تھا۔ یہ عادت مجھے دادی جان نے ڈالی تھی کہ وہ رات کے بارہ بجے نیند سے جگا کر دودھ میں صندل کا شربت ملا کر پلایا کرتی تھیں۔ اس طرح میں نیند کے غلبے سے بوجھل چپ چاپ دودھ پی جاتا تھا پھر تو میں بارہ بجے کے قریب نیند میں ہی دودھ پینے کی ضد کرنے لگتا۔ یہ عادت ماں کے لیے بڑی ناخوشگوار تھی۔

1927ء میں جب دادا جان اور دادی جان حج پر گئے تو اس دوران دودھ پلانے کی ڈیوٹی والد صاحب نے سرانجام دی۔ والد صاحب دفتر سے آنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ اپنے دوستوں سے ملانے کے لیے لے جاتے۔ اس طرح سے میرے اندر بڑوں سے دوستی اور ان کی باتیں غور سے سننے کا رجحان پیدا ہوا۔ ان کے دوستوں میں جو مجھے اب تک یاد ہیں' ایک عبدالعزیز تھے جو محلہ شیعاں پیر گیلانیاں اندرون موچی دروازہ میں رہتے تھے اور مسلم بنک میں ملازم تھے۔ دوسرے شیخ اشرف جو والد صاحب کے پھوپھی زاد تھے۔ انہوں نے بعد میں اسلامی لٹریچر کے ناشر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ مرزا اشرف بیگ جو امپریل بنک میں ملازم تھے اور نوگھرہ اندرون شیرانوالہ میں رہتے تھے۔ اس طرح غلام مصطفیٰ حیرت تھے جن کی مسجد حفیظ چابکسوار کے نیچے سٹیشنری کی دکان تھی جہاں ہر شام لاہور کے علمی' ادبی' سیاسی اور ثقافتی لوگوں کی محفل بجتی تھی' اس کے اثرات میرے والد پر بڑے گہرے تھے۔

میرے والد صاحب نے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا لیکن اس کے باوجود سیاست سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اس کی وجہ شیخ غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر تھے جو ان کے ہمسائے اور ہم عصر تھے۔ بعد میں تو یہ دونوں کل وقتی سیاسی کارکن بن گئے تھے۔ سانحہ جلیانوالہ باغ کے بعد مارشل لاء کے زمانے میں غلام مصطفیٰ حیرت اور لال دین قیصر ڈنڈا فوج کے سالار تھے اور ان کو فوجی عدالت نے عمر قید کی سزا سنادی تھی۔ یہ دونوں پنجابی میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔



باب 2

ہدایت اللہ شاعر

شاعری سے یاد آیا' ہمارے گھر کے سامنے ایک بوڑھا شخص اکثر تھڑے (چبوترے) پر بیٹھا دکھائی دیتا۔ بڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنا ذہنی توازن بھی کھو چکا تھا' محلے کے اکثر بچے تو کیا بڑے بھی اسے چھیڑتے تھے اور وہ انہیں پنجابی میں گالیاں دیا کرتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ پنجابی زبان کا بڑا شاعر ہدایت اللہ ہے جس کی "سی حرفیاں" پنجابی شعری ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان "سی حرفیوں" کے علاوہ اس کا بڑا کارنامہ وارث شاہ کی ہیر میں شعری اضافہ تھا۔ وارث شاہ کو پڑھنے اور پرکھنے والے یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ کلام ہدایت اللہ کا ہے' ہدایت اللہ کی پنجابی سی حرفیاں نہ صرف میری دادی جان بلکہ والدہ بھی بڑے ذوق شوق سے پڑھا کرتی تھیں۔ ہدایت اللہ نے سی حرفیوں کے آخر میں نہ صرف اپنے بلکہ اپنے استاد محترم حافظ ولی اللہ سجن کے بارے میں لکھا ہے۔

اس شہر لاہور پنجاب اندر جتھے نور ہمیش برسدا اے
کم درزی دا کرے ہدایت اللہ گلی چابکسواراں دی وس دا اے

(پنجاب کے شہروں میں لاہور ایک ایسا شہر ہے جہاں ہمیشہ خدا کا نور برستا رہتا ہے۔ وہاں ہدایت اللہ درزی کا کام کرتا ہے اور وہ گلی چابکسواراں میں رہتا ہے۔)

شعر ہندی زبان وچ آکھنے دا
آیا شوق سجن استاد مینوں

پربت جگر تھیں سخن دی نہر
شیریں کڈھنی وانگ فرہاد مینوں
اندر شہر لاہور میرے لندے وچ
کلالاں دی گلی آہے
سجن نام دھریا اونہاں شعر اندر
اسم ولی اللہ گل مل دی آہے
اللہ بخش پیارا والد اونہاں دا سی
جہدے شعر بنات دی ڈلی آہے
عالم علم تے عمل دی کان گویا
باغ دین اندر شام بھلی آہے

"لاہور میں اس وقت پنجابی کو ہندی (مقامی) زبان کہا جاتا تھا' اس لیے ہدایت اللہ لکھتے ہیں کہ ہندی میں شعر کہنے کا شوق مجھے حافظ ولی اللہ سجن سے ہوا۔ انہوں نے مجھے جگر کے پہاڑ سے فرہاد کی طرح سخن کی نہر نکالنے کا ہنر بخشا۔ اندرون شہر وہ میرے گھر کے مغرب میں کلالوں کی گلی میں رہتے تھے۔ ان کا تخلص سجن ہے' اور نام ولی اللہ ہے۔ ان کے والد اللہ بخش پیارا ہیں جن کے اشعار بنات کی ڈلی ہیں۔ وہ علم و عمل کی گویا کان ہیں اور اس وقت وہ بڑھاپے کو پہنچ چکے ہیں۔)

لاہور میں شعرو سخن کے کئی بڑے ادارے تھے جن میں ایک کی سربراہی حافظ اللہ بخش پیارے کرتے تھے۔ ان کے اور میاں شادی کے درمیان "بیت بازی" کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ مقابلے میں ایک شاعر شعر کے ذریعے بجھارت کہتا تھا۔ دوسرا شاعر فی البدیہ اس کا جواب اشعار میں دیتا۔ جو ایسا نہ کر پاتا' وہ شکست کھا جاتا۔ اس طرح کی محفلیں لاہور میں اکثر سجتی رہتی تھیں۔ ایک مقابلے میں حافظ اللہ بخش پیارے نے میاں شادی سے بجھارت بجھوائی:

اساں دتا تیرے ہتھ پیسہ اوہدیاں لیا کھاں چیزاں توں چار میاں
کانبھول ککڑی' پان بیڑا' نالے لیاویں کھا پھلاں دے ہار میاں
پیسہ موڑ لیاویں نالے دودھ لیاویں اتے کریں نہ مول ادھار میاں

پیارے یار نوں دیویں جواب ایہدا نہیں تاں نکل جائیں پڑوں باہر میاں

(میں نے تجھے ایک پیسہ دیا ہے تاکہ تو چار چیزیں لے آئے۔ ان چار چیزوں میں گھاس پھونس کے علاوہ کھکڑی' خربوزہ' پان اور بیڑا شامل ہے اور دیکھنا پھولوں کے ہار بھی لانا مت بھولنا۔ لیکن یاد رہے کہ جو میں نے پیسہ دیا وہ بھی واپس لانا ہے اور دودھ بھی لانا ہے لیکن ادھار بالکل نہیں کرنا۔ دیکھو پیارے کو اس کا جواب دو نہیں تو شعر و سخن کے اس اکھاڑے سے باہر نکل جاؤ۔)

اس بجھارت کے جواب میں میاں شادی نے فوراً اشعار میں جواب دیا:

دال دوست نے دتا ہتھ پیسہ
جا کے لبھ لتی چیز وکھری میں
اک عجب عجائب تھیں اک ڈھا
اوہدی توڑ لئی سکی لکڑی میں
پہلے پھل توڑے پھر دودھ چویا
نالے توڑ لئی اوہدی کھکڑی میں
شادی یار نے تینوں جواب دتا
گل کھول دتی وکھو وکھری میں

(دوست نے مجھے ایک پیسہ دیا اور میں نے ایک ایسی چیز تلاش کی جس میں یہ سب خوبیاں ہوں اور اس طرح میں "آک" کی جھاڑی کے پاس جا بیٹھا اور مفت میں اس کی خشک لکڑی' پھول اور دودھ حاصل کیا اور اس کے پھل کھکڑی کو توڑ لیا۔ شادی نے تمہاری بجھارت کو کھول دیا ہے۔)

لاہور میں شعر و شاعری میں بجھارتوں اور اڑونیوں کے بعد "چوٹ بازی" کا دور شروع ہوا۔ شاعروں نے ایک دوسرے کی ذات برادری اور پیشوں کے حوالے سے ایسے ایسے شعر گھڑے جو پنجابی ادب میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری کے بھی اعلیٰ نمونے ہیں جن میں ہر قوم کے فطری رجحانات اور رویوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

یادگار چشتی

مولوی نور احمد چشتی جو مولوی محمد بخش یکدل کے بڑے بیٹے تھے اور جو ان کی پہلی بیوی فضل النساء بنت مولوی محمد بخش صحاف (جلد ساز) کے بطن سے تھے' انگریزوں کے لاہور پر قبضے کے بعد میاں میر فوجی چھاؤنی میں ڈاکٹر لوگن کے کہنے پر ملٹری و سول صاحب بہادروں کو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انہوں نے یورپی شاگردوں کے ایما پر تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ اس طرح "یادگار چشتی" لکھی گئی جس کے بارے میں انہوں نے خود کہا ہے کہ یہ کتاب اوہولڈر بی صاحب بہادر کے حکم سے تحریر کی۔ اس میں قدیم لاہور کے مختصر تعارف کے بعد لاہور کی تہذیبی زندگی اور اس کے مختلف رویوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا جیسا کہ گگے زئیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان میں اکثر چابکسواروں کا کام کرتے ہیں جبکہ معدودے چند دوسرے کاروبار سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں' پر فن اور مکرو حیلہ ساز! ان کے یہاں عورتوں کو ہر کام میں اختیار ہوتا ہے۔ جو چاہیں سو کریں۔ مردوں کا ان پر کچھ بس نہیں چلتا۔ لڑائی ان کی بہت مشہور ہے جو مدتوں چلتی رہتی ہے لیکن فریقین کے بیچ میں کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔ دراصل کوئی بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

چابکسوار یعنی گھوڑوں کے دلال' ان کا بھی ایک محلہ مشہور ہے اور ان کے ہی محلے میں بندہ کا غریب خانہ ہے۔ اس محلے میں آج کل چار نخاس ہیں اور وہاں گھوڑے بکتے ہیں۔

گگے زئی بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ کوئی گگے زئی گرمیوں کے دنوں میں صحن میں سویا ہوا تھا۔ صبح دم ایک کوے نے دیکھا کہ گھر کے صحن میں ایک شخص سویا ہوا ہے لیکن اس کی آنکھیں کھلی ہیں کیوں نہ اسے کھا لیا جائے۔ یہ سوچ کر کوا اڑ کر گگے زئی کے منہ پر آ بیٹھا۔ گگے زئی نے فوراً منہ کھول دیا اس طرح کوے کی ٹانگ' گگے زئی کے دانتوں میں آ گئی۔ کوا بڑا پریشان ہوا اور اس نے مصیبت سے نکلنے کے لیے ترکیب سوچی کہ اس شخص کی ذات کے بارے میں پوچھا جائے

اور جب وہ اپنی ذات بتانے کے لیے منہ کھولے تو وہ پھر سے اڑ جائے گا۔ یہ سوچ کر کوے نے پوچھا۔ "بھائی تمہاری ذات کیا ہے؟" ککے زئی نے دانت دبا کر کہا۔ "ککے زئی" غرض کہ ککے زئی بڑے حیلہ ساز ہوتے ہیں۔ میں نے سنا ہی نہیں، دیکھا بھی ہے کہ وہ مطلب کے دوست ہوتے ہیں۔ اگر کسی میں وفا ہے تو وہ بے سبب یا بغیر مطلب کے نہیں۔

"یادگار چشتی" میں نہ صرف لاہور کے ککے زئیوں اور چابکسواروں بلکہ دیگر ذات برادریوں اور پیشہ وروں کے بھی حالات رقم کیے گئے ہیں۔ گجروں کے بارے میں لکھا ہے۔ "دیہاتی گجر اکثر راست باز مشہور ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں چند لوگ صاحب عزت ہوئے۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ گجر بڑے بد ذات ہوتے ہیں چنانچہ ایک مصرع بطور مثل مشہور ہے کہ: "گجر بہ یک نقطہ کنجر شود" یعنی گجر میں اگر صرف ایک نقطہ لگایا جائے تو وہ کنجر بن جاتا ہے۔ پنجابی زبان میں کنچن کو کنجی یا کنجری کہتے ہیں۔

لاہور میں ارائیوں کی بھی ایک ذات ہے جس کی آگے تین ذاتیں ہیں: "کمبوہ' ملتانی اور قولی" یہ لوگ صرف اپنی برادری میں رشتے ناتے کرتے ہیں۔ کمبوہ کی بھی آگے بہت سی شاخیں تھیں۔ کمبوہوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے برادری پرور ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک پنجابی ضرب المثل ہے:

جٹ سنڈا سنسار قبیلہ گھالنا
ککڑ کاں کمبوہ قبیلہ پالنا

"جاٹ، بیل اور مگرمچھ اپنے قبیلے کو تباہ کر دیتا ہے جبکہ مرغ، کمبوہ اور کوا اپنے قبیلے کو ہمیشہ پالتا ہے۔)

لاہور میں جب شعر و شاعری میں "چوٹ بازی" کا رواج ہوا تو پھر شعراء نے ایک دوسرے کے پیشوں اور ذاتوں پر ایسے ایسے شعر کہے کہ جس سے شعراء کی حسیات کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا جیسا کہ استاد دامن کا ککے زئیوں کے متعلق یہ چو مصرعہ دیکھیں:

سو مراثی' پنج سو کنجر باہمن کٹھو کئی
کٹ کٹاء کے کرو ملیدہ تاں بن دا اک ککے زئی

جے نکلے او قولوں سچا
سمجھو کشتہ رہ گیا کچا

(سو مراثی اور پانچ سو کنجروں اور بے شمار براہمنوں کو ملا کر یکجان کر دیا جائے تو اس مرکب سے ایک گگے زئی بنتا ہے۔ یعنی ایک مجرب نسخہ بن جاتا ہے لیکن اس کے باوجود گگے زئی اگر سچ بول جائے تو سمجھو تمہارا کشتہ ابھی کچا رہ گیا ہے۔)

رولٹ ایکٹ

غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے دوران ہوا جس میں انگریزوں کے مطابق ان کے خلاف ہندوستان میں خفیہ سرگرمیاں بڑھ گئیں اور انگریز سرکار نے اس صورتحال سے گھبرا کر ایک انگریز سر سڈنی رولٹ کی نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمے ان "باغیانہ سرگرمیوں" کے سراغ اور ان کے تدارک کے لیے اپنی تجاویز پیش کرنا تھا' کمیٹی نے اپنی تجاویز پیش کیں جسے حکومت ایک بل کی صورت میں اسمبلی میں پیش کر کے اسے قانونی حیثیت دینا چاہتی تھی۔ اس بل کو ہندوستانی اپنی عزت کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ محمد علی جناح نے بھی اس بل کی مخالفت کی اور اس کے پاس ہونے پر اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس بل کے قانون بننے کے بعد تمام ہندوستان میں احتجاجی جلسے اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہی میں سے ایک جلسہ امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں ہو رہا تھا کہ انگریز جنرل ڈائر نے اس جلسہ عام پر گولیاں برسا کر ایک وحشیانہ قتل عام کیا۔ اس سانحے میں تین سو اناسی افراد ہلاک اور بارہ سو کے قریب شدید زخمی ہوئے۔ یہ خونی واقعہ 12 اپریل 1919ء کو پیش آیا۔ اس کے بعد انگریز حکومت نے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس مارشل لاء کے دوران لاہور کے نہ صرف سیاسی کارکن بلکہ طالب علم تک متاثر ہوئے۔

اس زمانے میں انگریزوں نے جرمنی کے ساتھ ترکی کی ہمدردیاں دیکھتے ہوئے ترکی کے خلاف محاذ کھول دیا۔ اس پر ہندوستان کے مسلمان انگریز حکومت کے مزید خلاف ہو گئے۔ جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے ترکی کی جو تقسیم کی اور خلافت عثمانیہ کو

جو نقصان پہنچایا اس سے ہندوستانی مسلمان بھڑک اٹھے۔ اس وقت ترکی کے ہیرو غازی مصطفیٰ کمال پاشا تھے۔ تحریک خلافت میں ملک لال دین قیصر نے نہ صرف عملی طور پر حصہ لیا' بلکہ جیل بھی گئے۔ پنجابی میں شعر بھی کہے۔ ان کی اس نظم میں جہاں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے لیے دعائیہ اشعار تھے وہاں سمرنا پر یونانی فوج کے حملے کا نوحہ بھی لکھا:

غازی مصطفیٰ پاشا کمال
وے تیریاں دور بلائیں
ڈالیوں ٹٹ پئے کچے پھل
وات یتیماں دی کوئی نہ پچھے
روندے سمرنا دے بال
وے بیوہ ہو گئیاں مائیاں
غازی مصطفیٰ پاشا کمال
وے تیریاں دور بلائیں

غازی مصطفیٰ کمال پاشا خدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے! یتیموں کا کوئی پرسان حال نہیں جیسا کہ شاخ سے گرا ہوا کچا پھل! سمرنا کی عورتیں بیوہ ہو گئی ہیں اور یتیم رو رہے ہیں۔)

اس دور میں جو بھی سیاسی تحریک چلتی اس میں شدت پنجابی شاعری کے ذریعے آتی کیونکہ یہ عوام کی زبان تھی۔ درمیانہ طبقہ اگرچہ پڑھتا لکھتا اردو میں تھا لیکن اس کی بول چال کی زبان یہی پنجابی تھی۔

مسلمان شخصیات کے علاوہ جن ہندوؤں سے دادا جان کے تعلقات تھے' ان میں لاہور کا سب سے بڑا ساہوکار بلاقی شاہ اور پھڑ بی بازار کے ساتھ والی گھگر گلی کے کشمیری پنڈت تھے۔ جہاں تک بلاقی شاہ کا تعلق ہے' ہمارے گھر میں اس کا اکثر ذکر ہوتا رہتا تھا۔ لاہور کے اکثر مسلمان زمیندار یا نچلے درمیانے طبقے کے سفید پوش اس سے قرض لیتے تھے یہاں تک کہ ہمارا خاندان بھی بلاقی شاہ کا مقروض تھا۔ بلاقی شاہ کی امارت سے تو دادا جان بھی خوف کھاتے تھے۔ یہ سن کر میں اکثر سوچتا کہ وہ شخص کتنا ظالم ہو گا جس سے میرے دادا ایسا دلیر' بے باک' جرات مندانہ فیصلے کرنے والا بھی ڈرتا ہے۔

بلاقی شاہ کا خوف اور دہشت میرے ذہن میں بیٹھ چکی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں دادا جان کی انگلی تھامے گمٹی بازار سے گزر رہا تھا۔ میرا دھیان نیچے سڑک پر تھا کہ اچانک رک کر دادا جان نے کہا: "بیٹے! بلاقی شاہ کو سلام کرو۔"

بلاقی شاہ کا نام سنتے ہی میں سہم سا گیا۔ اس کی طرف دیکھا لیکن خوف اور دہشت مجھ پر اس قدر طاری تھی کہ کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بلاقی شاہ ذرا سا مسکرایا اور مجھے جینے کی دعا دے کر آگے نکل گیا۔

ڈبی بازار کے ساتھ والی گلی گھگر گلی کہلاتی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور ہندو عورتیں اکثر گھاگرے پہنتی تھیں اس لیے گلی کا نام ان کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس گلی میں کشمیری پنڈتوں کے دو تین گھرانے تھے جس سے میرے دادا جان کے گہرے مراسم تھے۔ دیوالی اور دسہرہ کے موقع پر وہ ہمیں خورد و نوش کی چیزیں بھجواتے اور ہم بھی عیدین کے موقع پر ایسا ہی کرتے۔

دادا جان کے حوالے سے ہمارا گھر ایک کٹر اہل حدیث کا گھر تھا۔ میں چھ سال کا تھا کہ ہندوستان میں سلطان ابن سعود کے خلاف ایک مہم کا آغاز ہوا کیونکہ سلطان ابن سعود نے اپنے ملک میں مزاروں کے قبے گروا دیئے تھے۔ اس طرح لاہور کے گلی محلوں میں شیعہ' سنی اور وہابیوں کی بازگشت عام سنائی دینے لگی' یہاں تک کہ خلافت کمیٹی میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک طرف سلطان ابن سعود کا حامی گروہ تھا جس کی قیادت مولانا ابوالکلام آزاد" کر رہے تھے اور اس گروہ میں وہ تمام لوگ تھے جو بعد میں "احرار" کے نام سے سامنے آئے جبکہ دوسری طرف مولانا محمد علی اور مولانا شوکت اور ان کی خلافت کمیٹی! ہمارا خاندان چونکہ غزنوی خاندان کا معتقد تھا اس لیے وہ سلطان ابن سعود کا سب سے بڑا حامی تھا۔ سلطان ابن سعود غزنوی خاندان اور اس کے ذریعے اہل حدیث کی بھی تھوڑی بہت مالی مدد کیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں چینیانوالی مسجد' سلطان ابن سعود کے حامیوں کا مرکز تھی اور اُن کے کئی ایک جلسے ہمارے مکان پر بھی ہوئے تھے۔

مسجد چینیانوالی کے امام مولانا عبدالواحد غزنوی تھے۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ "عزوجل" کے الفاظ استعمال

کرتے تھے۔ ان کی کھنک دار بارعب آواز کی گونج اب تک میرے کانوں میں محفوظ ہے۔ ان کا نورانی چہرہ سفید شفاف رنگت' سفید دودھیا داڑھی' قد آدم عصا' سفید لباس' تنگ پائنچے کی شلوار اور گھٹنوں کے نیچے تک عربوں کا سا کرتہ' ان کے جمعہ اور عیدین کے خطبات اب بھی مجھے یاد ہیں۔ مولانا سے میرے خاندان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ بیمار پڑے اور ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی' تو میرے دادا انہیں اپنے گھر لے آئے۔

مولانا احمد علی

غزنوی خاندان کے علاوہ مولانا احمد علی کے خاندان سے بھی ہمارے خاندان کے عقیدت و احترام کے علاوہ خاندانی مراسم بہت گہرے تھے۔ مولانا احمد علی کی بیوی اور میری دادی اکثر غمی اور خوشی میں برابر کی شریک ہوتی تھیں۔ ان دونوں خاندانوں نے بعد میں سیاست میں بھی خاصا اہم کردار ادا کیا اور سیاست ہی میں نہیں بلکہ "شرک و فسق و فجور" کی یلغار کو جو سلطان ابن سعود کی مملکت کے خلاف ہوئی' اسے بھی ان دونوں خانوادوں نے مل کر ہی روکا اور سچ یہ ہے کہ مولانا احمد علی کی خدمات غزنوی خاندان سے کہیں زیادہ ہیں!

مولانا احمد علی عقیدتاً حنفی تھے اور دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن بریلویوں کے نزدیک دیوبندی بھی "وہابی" ہی تصور ہوتے تھے' چنانچہ ہر وہ مکتب خیال جو سلطان ابن سعود کی حمایت کرتا اسے یہاں کے کچھ سیاسی اور مذہبی علماء "وہابی" کا لقب دے کر عوام میں معتوب ٹھہرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ اس ضمن میں باقاعدہ مناظرے بھی ہوتے رہے جس سے لاہور کی فضا میں فرقہ واریت کی ہوا چلنے لگی۔ وہابیوں کی مرکزی مسجد چینیانوالی تھی' اس کے مقابلے میں بریلوی مولوی دیدار علی اور اس کا گروہ تھا جس کا واحد مرکز مسجد وزیر خان تھی۔

چینیانوالی مسجد کے صحن میں نور احمد چشتی کی جد میں سے غلام حسین نامی شخص کی قبر تھی۔ یہ قبر میں نے ابتدائی دنوں میں دیکھی تھی۔ قبر پرستوں نے اس قبر کو کسی پیر کی قبر بنا کر عرس کا اہتمام شروع کر دیا۔ اصل مقصد ان کا وہابیوں کے خلاف ایک محاذ

بناتا تھا۔ اس وقت وہابیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے خاندان میں میرے دادا جان کے علاوہ ان کے بہنوئی شیخ غلام محمد جن کے بیٹے شیخ محمد اشرف نے انگریزی میں اسلامی کتب کی اشاعت میں بڑا نام کمایا' اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور "وہابی" کہلاتے تھے' چنانچہ اس زمانے میں وہابیوں کے خلاف خاصے متشددانہ رویوں کا اظہار کیا جاتا تھا چنانچہ تکیہ سادھواں میں رہنے والے کشمیریوں اور سادھوؤں کی مسجد' وہابی مخالفوں کا مرکز بن گئی۔ اس طرح محلہ سادھوؤں اور اردگرد کے علاقے سے ایک عید میلادالنبی ﷺ کا جلوس یہاں سے ترتیب دیا گیا۔ دراصل یہ عید میلادالنبی ﷺ کا پہلا جلوس تھا جو غیر شعوری طور پر ذوالجناح کے جلوس کے مقابل سینوں کے ایک اجتماعی اظہار کے طور پر سامنے آیا۔

اس علاقے میں شیعوں کا بہت زور تھا کیونکہ اس کے قریب محلہ شیعاں کی گلی پیر گیلانیاں میں ایک امام باڑہ تھا جہاں سے ذوالجناح اور پھر حویلی مبارک سے بڑا ذوالجناح کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ محلہ پیر گیلانیاں کی ایک وجہ شہرت ایک نیم حکیم غلام احمد بھی تھے جن کا اس زمانے میں روزنامہ "زمیندار" میں نصف صفحے کا اشتہار مستقل شائع ہوتا تھا۔ عنوان تھا: "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔" دراصل یہ قوت مردمی' جریان احتلام وغیرہ پوشیدہ امراض کا اشتہار تھا۔ اس اشتہار کی وجہ سے حکیم غلام احمد کا نام ہی "اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔" پڑ گیا تھا۔

محلہ پیر گیلانیاں کی دوسری وجہ شہرت اس علاقے کے میونسپلٹی انتخابات تھے جن میں ہمیشہ کشمیری خانوادے کا امیدوار ہی منتخب ہوتا تھا۔ ہمارا خاندان بھی انتخابات کی حد تک ہمیشہ کشمیریوں کا ساتھ دیتا تھا۔ کشمیری خانوادے کے شیخ حسن دین کا مقابلہ ہمیشہ میاں خان کی حویلی کے باسیوں سے ہوتا۔ میں نے بچپن میں میونسپلٹی کا پہلا الیکشن جو دیکھا' اس میں کشمیری امیدوار شیخ حسن دین کے مقابل میاں خان کی حویلی کے سید محمد امین اندرابی تھے جو لمبے تڑنگے سیاہ فام تھے۔ ان کے متعلق پنجابی کے یہ شعر گلی کوچوں میں انتخابی مہم کا حصہ بن گئے:

سید تے ہوندے گورے چٹے
شاہ جی تسیں کیوں کالے او

یاں تسیں ڈوم مراثی او
یاں فیر اوہناں دے سالے او

(سید تو گورے چٹے ہوتے ہیں لیکن شاہ جی آپ کا رنگ کیوں کالا ہے۔ لگتا ہے یا تو آپ ڈوم مراثی ہیں یا پھر ان کے سالے)

محرم علی چشتی

1925ء میں شادی لال پنجاب کے چیف جسٹس ہو گئے۔ 1925ء کے آخر میں مسجد وزیر خان کے خطیب مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ نے علامہ اقبال پر کفر کا فتویٰ دے دیا' مولانا سید سلیمان ندوی نے اس فتوے کو جاہلانہ قرار دیا۔ اس فتوے کے محرکات بھی' سلطان ابن سعود کی حمایت تھی' انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حجاز کی سیاست میں مخل نہ ہوں لیکن ابن سعود کے مخالف علماء نے اس پر یہ غصہ نکالا کیونکہ دونوں فرقوں کے علماء کے درمیان تکفیر کا بازار گرم تھا۔

اس زمانے میں لاہور میں دو بڑے دھڑے ہوتے تھے۔ ایک دھڑے کی سرپرستی محرم علی چشتی کرتے جبکہ دوسرے دھڑے کی اندرون شہر کے کشمیری کرتے تھے۔ میرے دادا کے محرم علی چشتی سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ اس کے باوجود عملی سیاست میں انہوں نے کشمیریوں کا ساتھ دیا تھا۔

محرم علی چشتی' مولوی محمد بخش یکدل کے بیٹے اور مولوی نور احمد چشتی کے سوتیلے بھائی تھے۔ محرم علی چشتی نے 1884ء کو روزنامہ "رفیق ہند" جاری کیا۔ اس اخبار میں قومی حقوق کا اظہار جس جرات اور بے باکی سے کیا گیا یہ انہی کا حصہ تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کے وکیل' صحافی اور مقرر تھے۔ انہوں نے صحافت کا آغاز کوہ نور کی ادارت سے کیا اور منشی ہرسکھ رائے کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل سوسائٹی کی بنیاد بھی رکھی۔ ابتداء میں محرم علی چشتی نے سرسید احمد خاں کی تحریک کی نہایت شد و مد سے تائید کی لیکن جب سرسید احمد خاں کے مذہبی عقائد سے اختلاف ہوا تو ان کے خلاف خوب لکھا۔ "رفیق ہند" اخبار 1904ء تک جاری رہا۔

پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات میں لاہور سے علامہ محمد اقبال کے مقابل ملک محمد

دین بیرسٹر تھے جن کی حمایت سر محمد شفیع کی ارائیں برادری کے علاوہ محرم علی چشتی بھی کر رہے تھے۔ انتخابات میں علامہ اقبال کے خلاف تمام ارائیں برادری نے ووٹ ڈالے سوائے میاں عبدالعزیز بار ایٹ لاء کے' البتہ ککے زئی برادری کی اکثریت علامہ اقبال کے ساتھ تھی۔ غلام محمد حیرت' ملک لال دین قیصران کے پر زور حامی تھے۔ ان انتخابات میں ملک لال دین قیصر نے محرم علی چشتی کی خوب ہجو کہیں۔ علامہ محمد اقبال کامیاب ہوگئے تو ان کے حمائتیوں نے فتح کا جلوس نکالنا چاہا۔ محرم علی چشتی نے اعلان کر دیا کہ یہ جلوس نہیں نکلنے دیا جائے گا۔ لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹراوگلوی' محرم علی کے یار خاص تھے۔ اس سال لاہور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین کا انتخاب ہوا۔ اس انتخاب میں سر شہاب الدین نے جاٹ برادری کی بنا ڈالی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا ہم زلف چودھری نذیر حسین لاہور میونسپلٹی کا سیکرٹری مقرر ہو جائے چنانچہ انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے مل کر "جاٹ پارٹی" بنائی۔ سر شہاب الدین کے مقابل سر فضل حسین نے آغا صفدر جو کہ کٹر کانگریسی تھے' ان کی حمایت کر دی۔ یہ دیکھ کر سر شہاب الدین نے خاموشی اختیار کر لی جس کے نتیجے میں چودھری نذیر احمد کے بجائے آغا صفدر علی سیکرٹری نامزد ہوگئے۔ اس سے پہلے سر شہاب الدین جو لاہور میونسپلٹی کے چیئرمین تھے پنجاب اسمبلی کے سپیکر منتخب ہوئے تو چیئرمین کی خالی جگہ کے لیے سر فضل حسین نے چودھری سلطان احمد کی حمایت کی جو ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر تھے اور اس کے لیے انہوں نے سر شہاب الدین کو بھی اعتماد میں لے لیا لیکن میاں امیرالدین وائس چیئرمین نے اس کی مخالفت کی تو سر فضل حسین نے اس عہدے پر محرم علی چشتی کا نام پیش کیا کیونکہ ڈپٹی کمشنر اوگلوی بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ میاں امیرالدین نے جب اس پر رضامندی کا اظہار کیا تو سر فضل حسین نے ملک محمد حسین ایڈووکیٹ کو جو لاہور کی ککے زئی برادری سے تعلق رکھتے تھے' چیئرمین بنوا دیا۔ ملک محمد حسین بڑے کامیاب وکیل تھے۔

میرے والد پر گھر کے مذہبی ماحول کے ساتھ ساتھ محلے کی سیاسی فضا نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ محلے میں میرے والد' شیخ غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین کی ایک تکون تھی۔ مجھے "مغل پورہ ایجی ٹیشن" ابھی تک یاد ہے۔ یہ ایجی ٹیشن مغل پورہ انجینئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کے خلاف تھا۔ اس انگریز پرنسپل پر الزام تھا کہ وہ

توہین رسالت کا مرتکب ہوا ہے۔ موچی دروازہ میں احتجاجی جلسہ منعقد ہوا جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی سحرانگیز تقریر کی۔ عطاءاللہ بخاری اکثر عشاء کی نماز کے بعد تقریر کرتے اور ان کی تقریر صبح تک جاری رہتی۔ اس رات تقریر کے بعد جب سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے صبح کی نماز پڑھائی تو ہجوم اس حد تک جذباتی تھا کہ نماز کے بعد یہ مشتعل جلوس مغلپورہ کی طرف روانہ ہوا۔ والد صاحب صرف جلسے دیکھتے تقریریں سنتے لیکن جلوس میں کبھی شامل نہیں ہوتے تھے۔

"مغل پورہ ایجی ٹیشن" کے بارے میں بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انگریز پرنسپل کے خلاف اس احتجاجی تحریک کا اصل پس منظر چند مسلمان لڑکوں کو انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہ ملنا تھا۔ انہوں نے انگریز پرنسپل کے خلاف مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے توہین رسالت کا الزام لگایا تھا۔ اس طرح کی کئی اور تحریکوں کے دھندلے نقوش ذہن پر ابھرتے ہیں' جیسا کہ 56 فیصد کی تحریک جس کی پشت پر سر محمد شفیع اور سر فضل حسین تھے اور سامنے غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین وغیرہ۔

غازی علم دین شہید

جس تحریک نے مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے' اس کا تعلق بھی اسی کوچہ و بازار سے تھا۔ علم دین کے والد مستری طالع مند اور ان کے بڑے بھائی مستری محمد دین کا ساتھ والد صاحب کا اکثر اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بیس اور تیس کی دہائی میں جس طرح مسلمانوں میں تنظیم و تبلیغ کی مختلف سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں اسی طرح ہندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن ایسی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ شدھی تحریک کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان اصل میں ہندو ہیں جن کو مسلمان بادشاہوں نے اپنے عہد حکومت میں زبردستی مسلمان بنایا تھا اس لیے گاؤں گاؤں میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک شروع ہوئی جبکہ سنگھٹن تحریک کی بنیاد یہ تھی کہ "زور کرو' ڈنڈ پیلو اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" مسلمانوں میں تنظیم و تبلیغ تحریک کا نعرہ یہ تھا کہ مسلمان نوجوان زور کریں' ڈنڈ پیلیں اور ہندوؤں کا مقابلہ کریں۔ جب یہ تحریکیں شروع ہوئیں تو انہوں نے ہندوؤں مسلمانوں کو اس قدر متاثر کیا کہ تمام رہنما کسی نہ کسی حد تک ان تحریکوں کے سامنے بے بس

ہوگئے۔ چنانچہ لاہور میں رنگ محل چوک کے اندر ایک بہت بڑا اکھاڑہ قائم ہوا۔ یہ اکھاڑہ شیخ غلام مصطفیٰ حیرت کے مکان سے متصل اصطبل میں بنایا گیا۔ اس اکھاڑے کا افتتاح مولانا شوکت علی نے کیا تھا اور اس وقت کے مشہور پہلوان خلیفہ غلام محی الدین اس کے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے تھے۔ اس اکھاڑے میں علاقے کے نوجوان ورزش کے لیے آتے تھے۔ اس ورزش کی بنیاد سیاسی تھی۔ ایسا ہی ہندو محلے میں ہو رہا تھا۔ اس طرح محلوں میں غنڈہ عناصر کی بھی خوب بن آ رہی تھی۔ دو کیمپ تیار ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندو مسلمان اور سکھ فسادات کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں سن کر علم دین (بعد میں غازی علم دین کے نام سے شہرت پائی) نے خلیفہ غلام محی الدین کے اکھاڑے میں ورزش کرنی شروع کر دی۔ علم دین اپنے باپ کے ساتھ بازار سریانوالہ میں رہتا تھا۔ اس کا والد بڑھئی تھا اور اس نے علم دین کو آبائی کام سکھانے کا تہیہ کر رکھا تھا' اس لیے علم دین کو پڑھایا نہیں تھا۔ علم دین کا بڑا بھائی محمد دین بہت ماہر بڑھئی تھا اور کوچہ چابکسواراں میں رہتا تھا۔ وہ ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا۔ شدھی اور سنگھٹن تحریکیں اٹھیں تو آریہ سماجیوں کی طرف سے کثیر تعداد میں اس قسم کی کتابیں شائع ہونا شروع ہوگئیں جن میں اسلام اور رسول اللہ ﷺ پر نازیبا حملے کیے جاتے تھے' چنانچہ لاہور میں ایک کتاب "رنگیلا رسول" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے ناشر "راجپال اینڈ سنز" تھے۔

"رنگیلا رسول" شائع ہوئی تو پنجاب کیا پورے ہندوستان میں آگ لگ گئی۔ اس کتاب کی ضبطی کے لیے جلسے ہونے لگے۔ حکومت نے جلسوں کے خلاف پابندی لگانے کی غرض سے دفعہ 144 نافذ کر دی۔ اس کے باوجود سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے شاہ محمد غوث کے سامنے والی کٹڑی کے اندر ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اس کتاب کی ضبطی کا پرزور مطالبہ کیا۔ آخر حکومت نے کتاب کے ناشر کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا' لیکن ہائیکورٹ کے جسٹس کنور دلیپ سنگھ نے انہیں اس مقدمے سے بری کر دیا۔ اس سے مسلمانوں میں مزید اشتعال پیدا ہوا۔ انہوں نے راجپال کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے کوہاٹ کے ایک پٹھان عبدالرشید نے راجپال پر خنجر سے حملہ کیا' لیکن زخم کاری نہ لگا سکا۔ اس طرح راجپال زندہ بچ گیا جبکہ عبدالرشید کو دفعہ 304 کے

تحت سات سال کی سزا ہوئی۔ اس سزا نے مسلمانوں میں مزید ہیجان پیدا کر دیا کیونکہ راجپال مسلمانوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت نام بن گیا تھا۔ یہاں کے مقررین کی اس سلسلے میں معرکہ آراء تقریروں خاص کر سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریر کے بعد تو لاہور کے گلی کوچوں میں خون ہی خون ہوتا' لیکن انہوں نے اس جوش اور غیظ و غضب کو قابو میں رکھا۔ مسلمانوں کے جذبات کھولتے رہتے اسی دوران یکی دروازے کا نوجوان خدا بخش جسے لوگ "اکو جیہا" یعنی "ایک جیسا" کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ وہ گول مٹول اور کسرتی بدن والا پہلوان تھا' راجپال پر حملہ آور ہوا لیکن وہ بھی اپنے مقصد میں ناکام رہا البتہ راجپال پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں اسے چودہ سال کی سزا ہوئی۔

آخر سریانوالہ بازار کے نوجوان علم دین نے راجپال کی دکان پر دو ملازموں کی موجودگی میں اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ راجپال کے قتل کی خبر نے پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔ علم دین دیکھتے دیکھتے چند دنوں میں غازی علم دین بن گیا جب جب علم دین کی عدالت میں پیشی ہوتی لوگ اسے دیکھنے کے لیے کچہری پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ آخر علم دین کو سیشن کے سپرد کر دیا۔ مسلمانوں کی پوری کوششوں اور قانونی موشگافیوں کے باوجود سیشن جج نے علم دین کو سزائے موت کا حکم سنا دیا جس سے مسلمانوں میں کہرام مچ گیا۔ چندے جمع ہوئے' مسلمانوں نے محمد علی جناح کو وکیل کیا۔ جسٹس براڈوے اور جانسن نے مقدمے کی سماعت کی۔ محمد علی جناح نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن آخر فیصلہ علم دین کی پھانسی کا ہوا۔

جس دن علم دین کو میانوالی جیل میں پھانسی دی گئی' اس دن علم دین کا والد طالع مند نعش لینے پہنچا تاکہ اسے لاہور میں لاکر سپرد خاک کیا جائے۔ علم دین کو لاہور میں دفنانے کا تمام انتظام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر نے کر رکھا تھا۔ وہ علم دین کی نعش کی آمد کے انتظار میں تھے۔ شام کو انہیں اطلاع پہنچی کہ ڈپٹی کمشنر میانوالی نے نعش دینے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ خبر لاہور میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جنازہ پڑھنے کے لیے آنے والے لوگ عظیم الشان احتجاجی جلوس میں تبدیل ہو گئے۔ رات دس بجے موچی دروازہ کے باغ میں زبردست جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں "غازی علم دین

کمیٹی" قائم ہوئی۔ جلسے کے بعد شیخ غلام محمد مصطفیٰ حیرت' مولانا محمد بخش مسلم' ڈاکٹر تاثیر اور لال دین قیصر ڈاکٹر محمد اقبال کی کوٹھی میں گئے اور انہیں گورنر پنجاب سے ملنے کو کہا۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے گورنر سے بات کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ لاہور سے باہر جا چکے ہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ دوسرے روز لاہور کے تمام کاروباری مرکز بند رہے۔ مکمل ہڑتال کی وجہ سے لوگ ہر کوچے اور بازار میں ٹولیاں بنا کر بیٹھے تھے۔ علم دین کی نعش کی واپسی کے سلسلے میں "غازی علم دین کمیٹی" نے باقاعدہ تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور کمیٹی کا دفتر کوچہ چابکسواراں میں قائم ہوا کیونکہ یہ کوچہ ان دنوں خاصی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ایک تو ویسے بھی علم دین کا محلہ تھا دوسرا کشمیری بازار رنگ محل کا یہ مرکز تھا۔

غازی علم دین کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ روزانہ تین تین قافلے نکلا کریں اور بازاروں میں تقریریں اور نعرے لگایا کریں۔ دفعہ 144 کے تحت پانچ سے زیادہ افراد کا اجتماع ممنوع تھا' اس لیے یہ قافلے شہر کی گلیوں میں گشت کرتے اور لوگوں کو اس تحریک کے لیے اکساتے تھے۔ اس تحریک سے ناتا قائم کرنے کے لیے اس وقت کے چوٹی کے سیاسی زعما بھی بے قرار تھے' چنانچہ سر فضل حسین نے تحریک کے فعال کارکنوں کو کہلوا بھیجا کہ اپنے دستوں میں رضاکاروں کو دھلے ہوئے کپڑے پہنوایا کرو اور کوشش کرو کہ ان میں طلباء زیادہ سے زیادہ شامل ہوں۔ اس طرح سے سر فضل حسین حکومت پر دباؤ ڈال کر نعش حاصل کرنے کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔ تحریک نے جب زور پکڑا تو میاں محمد شفیع بھی اس میں شامل ہو گئے' چنانچہ انہوں نے ایک مجلس میں کہا: "گورنر پنجاب ماؤنٹ مورینسی میرے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔" چنانچہ دوسرے دن سر محمد شفیع ایک وفد لے کر گورنر سے ملے۔ اس وفد میں ڈاکٹر محمد اقبال' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین' میاں عبدالعزیز مالواڈہ' خواجہ دل محمد اور مولانا محمد علی صدر جماعت احمدیہ لاہور شامل تھے۔

گورنر نے نقص امن کے خدشے کا اظہار کیا تو وفد کے ارکان نے کہا کہ وہ امن وامان بحال رکھنے کی ضمانت دیتے ہیں۔

سر محمد شفیع نے کہا: "اگر نعش نہ ملی تو یہ سر جس کے بال انگریز کی خدمت کرتے کرتے سفید ہو گئے ہیں کبھی اپنی قوم کے آگے نہ اٹھ سکے گا۔" اس پر گورنر نے چوبیس

گھنٹے کے بعد نعش کے متعلق حتمی اطلاع کا یقین دلایا تاکہ فوجی حکام سے گفتگو کی جا سکے۔

دوسرے دن جب دہلی دروازے کے باہر ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہو رہا تھا اور اس کی صدارت غلام مصطفیٰ حیرت کر رہے تھے تو دوران جلسہ روزنامہ زمیندار کے دفتر میں ڈاکٹر محمد اقبال کا فون آیا۔ "غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر سے کہا جائے کہ مجھ سے آکر فوراً ملیں۔" غلام مصطفیٰ حیرت کو جب جلسہ گاہ میں یہ اطلاع ملی تو وہ جلسے کی صدارت کسی اور کے سپرد کر کے فوراً زمیندار کے دفتر پہنچے۔ یہاں لال دین قیصر بھی موجود تھے۔ دونوں ڈاکٹر محمد اقبال کی کوٹھی گئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے پیغام دیا کہ گورنر نے سر محمد شفیع کو اس شرط پر نعش دینے کا وعدہ کیا ہے کہ تحریک کو فوراً بند کر دیا جائے۔ وفد نے ڈاکٹر محمد اقبال سے کہا کہ اگر آپ نعش کے ملنے کی ضمانت دیتے ہیں تو سوچا جا سکتا ہے ورنہ سر محمد شفیع پر ہم کو اعتماد نہیں' چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال نے نعش کے ملنے کی ضمانت دی تو غلام مصطفیٰ حیرت نے واپس آکر جلسے کو یہ کہہ کر منتشر کر دیا کل تک آپ ایک خوش خبری سن سکیں گے۔

اس رات گورنر کے ساتھ نعش کی واپسی کے لیے یہ شرائط طے پائیں: اولاً نعش کے آنے کے سلسلے میں اخبارات کوئی زیادہ تشہیر نہ کریں تاکہ تدفین اوز جنازے کے لیے پورے پنجاب سے مسلمان یہاں جمع ہونا شروع نہ ہو جائیں۔ تحریک بند کر دی جائے۔ جنازہ کے سوا کوئی جلوس نہ نکالا جائے اور لاش لانے کے لیے حکومت کا ایک نمائندہ ہوگا اور ایک نمائندہ مسلمانوں کا ہوگا اور چوبیس گھنٹوں کے بعد لاش مل جائے گی۔ اس طرح مسلمانوں کی طرف سے سید مراتب علی حسنی نمائندہ مقرر ہوئے جو معروف سادات خاندان کے سربراہ تھے اور اس وقت آنریری مجسٹریٹ تھے۔ وہ میاں والی جیل میں علم دین سے کئی بار ملاقات کر چکے تھے۔ حکومت کے نمائندے کے طور پر پولیس انسپکٹر مرزا غلام حسین کا انتخاب ہوا جن کا تعلق موچی دروازہ کے مشہور شیعہ خاندان سے تھا۔ یہ دونوں حضرات میانوالی گئے اور ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں تیرہ دن کے بعد نعش کو قبر سے نکالا گیا۔ نعش کے لیے حکومت کی طرف سے میو اسکول سے لکڑی کے بکس بنوائے گئے۔ یہ نعش میاں میر ریلوے اسٹیشن پر لائی گئی جہاں پر پونچھ

ہاؤس کے سامنے چوبرجی کے کھلے میدان میں پہنچائی گئی۔ نعش کو وصول کرنے والوں میں ڈاکٹر محمد اقبال اور سر محمد شفیع تھے جنھوں نے نعش ورثا کے سپرد کی۔ جنازے کے لیے خاص چارپائی جس کے ساتھ بڑے بڑے لمبے بانس جڑے ہوئے تھے' بنوائی گئی تھی۔ بارہ بجے تک نعش کو میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

یہ لاہور کی تاریخ میں یادگار جنازہ تھا۔

لطف کی بات یہ کہ جنازے کے بعد مسلمان یہ نعرے لگا رہے تھے:

ہندو ہمارے بھائی
انگریز نے یہ آگ لگوائی

تحریک کے دنوں میں منشی عزیز دین نجم دین کی طرف سے ایک منظوم قصہ شائع کیا گیا' لیکن حکومت نے اس قصے کو ضبط کر لیا اور منشی عزیز دین کو کوتوالی بلا کر تنبیہہ کی گئی اور تمام کاپیاں سپرد آتش کر دی گئیں۔ اس کے بعد اس کتب خانہ کی طرف سے کسی سیاسی نوعیت کا کوئی منظوم قصہ شائع نہیں ہوا البتہ انہوں نے پیر غلام دستگیر نامی ایک کتاب شائع کی جس میں علم دین کی زندگی اور اس کے متعلق واقعات تھے۔ اس زمانے میں علم دین کے بارے میں عجیب و غریب تصویریں بھی شائع ہونا شروع ہوئیں جو عامتہ الناس کے تخیل کے ترجمانی کرتی تھیں جیسا کہ ایک تصویر جس میں علم دین کی نعش چارپائی پر پڑی ہے پاس ہی اس کی روح کھڑی ہے اور اس کے گلے میں خوبصورت پریاں پھولوں کے ہار ڈال رہی ہیں۔ اس تصویر کے نیچے پنجابی نظم درج تھی:

چودھویں صدی دے وچ دیکھو نبی اپنا نور دکھایا اے
علم دین دے قلب وچ ہو داخل ایہ معجزہ دکھایا اے
کیتا قہر نازل فرعون اتے حضرت موسیٰ نوں پار لنگھایا اے

(چودھویں صدی میں نبی کے نور کا جلوہ دکھائی دیا ہے۔ اس نور نے علم دین کے قلب کو روشن کر کے ایسا معجزہ کر دکھایا ہے جیسے حضرت موسیٰ دریا پار کر گئے تھے اور فرعون قہر الٰہی کا شکار ہو کر غرقاب ہوا تھا۔)

اس کے علاوہ کئی اور تصویریں بھی شائع ہوئیں جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔ پنجاب کے مشہور شاعر عشق لہر نے بھی میانوالی جیل میں علم دین سے ملاقات کی اور اس

سلسلے میں ایک نظم لکھی:

علم دین محمد ﷺ دے نام اتوں میاں جان جوانی واریا ای
آفریں غازی تیرے حوصلے دا راجپال کم بخت نوں ماریا ای
جیڑا چکیا بوجھ محبتاں دا چڑھ کے دار تے سروں اتاریا ای
بیڑا ڈوب کے نبی دے دشمناں دا علمدین توں کل نوں تاریا ای

(علم دین نے محمد ﷺ کی حرمت پر اپنی جان قربان کر دی۔ اس غازی کے حوصلے کی داد دیتا ہوں جس نے راج پال جیسے شیطان کو جہنم واصل کیا۔ اس نے حب نبی ﷺ کا بوجھ دار پر چڑھ کر ہی سر سے اتارا اور نبی ﷺ کے دشمنوں کا بیڑا غرق کر کے امت کی کشتی کو پار لگایا)

سائمن کمیشن

غازی علم دین شہید کی تحریک کے بعد لاہور کے گلی کوچوں میں "چھپن فیصد" کے نعرے گونجنے لگے اور دیکھتے دیکھتے چھپن فیصد کور کے رضاکاروں کی تنظیم وجود میں آئی۔ یہ بالکل سیاسی تحریک تھی جس کے پس پردہ حکومت برطانیہ سے ہندوستان کی آزادی کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس صورتحال کے پیش نظر برطانوی حکومت نے ایک آئینی کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ نئے حالات کی تحقیق کر کے اپنی سفارشات حکومت کو پیش کرے۔ اس کمیشن کی سب سے عجیب بات یہ تھی کہ اس میں کوئی بھی ہندوستانی شامل نہیں کیا گیا تھا' چنانچہ کمیشن کے خلاف ہر طرف سے احتجاج سنائی دیا یہاں تک کہ اعتدال پسند سیاستدان بھی جو حکومت سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار تھے' وہ بھی واویلا کرنے لگے اور انہوں نے بھی اسے نسلی تعصب قرار دیا۔

سائمن کمیشن کے سربراہ سرجان سائمن اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب لاہور آئے تاکہ مزید سیاسی اصلاحات کی خاطر تجاویز دیں تو کانگرس نے بھی اس کمیشن سے تعاون نہیں کیا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کے خلاف مظاہرہ کیا' چنانچہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں سرجان سائمن کا خیر مقدم "سائمن واپس جاؤ" کے نعروں سے کیا گیا۔ یہ کمیشن جب لاہور پہنچا تو ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک زبردست ہجوم اکٹھا تھا۔

مولانا غلام محی الدین قصوری سرجان سائمن کو ان کی قیام گاہ تک چھوڑنے کے لیے ان کی کار میں بیٹھ گئے۔ گاڑی جونہی عوام کے قریب پہنچی تو انہوں نے آوازے کسنے شروع کر دیئے: اوئے دلے! اوئے دلے! (اے دلال' اے دلال) مولانا نے بڑی حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اپنے سر کو جھکاتے ہوئے ان کے فقروں کو بڑی خوشی سے قبول کرتے ہوئے سر کو ہلانا اور مسکرانا شروع کر دیا۔

سر سائمن نے ان سے پوچھا کہ "اوئے دلے" کے کیا معنی ہیں؟ مولانا نے انہیں بتایا کہ آپ کو داد تحسین دے رہے ہیں کہ آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔

سرجان سائمن نے عوام کے جوش اور جذبے کے ساتھ اس جملے کو بھی یاد رکھا اور پھر انہوں نے دوپہر کو سر فضل حسین سے ملاقات پر ان سے پوچھا کہ "اوئے دلے" کے کیا معنی ہیں؟" سر فضل حسین نے پریشان ہو کر پوچھا کہ آپ نے یہ جملہ کہاں سے سنا ہے۔ سرجان سائمن نے صبح کو اپنے استقبال میں بلند کیے جانے والے نعرے اور مولانا غلام محی الدین قصوری کے بتائے ہوئے اس کے معانی کا ذکر کیا۔ یہ سن کر سر فضل حسین نے انہیں تمام صورتحال سے آگاہ کیا اور کہا کہ یہ تو گالی ہے۔

سرجان سائمن نے یہ بات یاد رکھی۔ شام کو عشائیہ پر جب معززین شہر اکٹھے ہوئے تو ان میں مولانا کو دیکھ کر سرجان سائمن بڑے تیز قدموں کے ساتھ مولانا کی طرف آئے اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "اوئے دلے! کیا حال ہے؟"

مولانا کو معلوم تھا کہ صاحب بہادر نے انہیں "اوئے دلے" انہی معنوں میں کہا ہے' جو خود انہوں نے بتائے تھے' اس لیے انہوں نے مسکراتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کا جواب دیتے ہوئے اس جملے کا سر جھکا کر خیر مقدم کیا۔

چھپن فیصد کی تحریک پنجاب کے مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق اور آبادی کے مطابق مجالس قانون ساز میں نمائندگی حاصل کرنے کی غرض سے شروع کی گئی تھی۔ یہ تحریک روزنامہ "انقلاب" کی پیدا کردہ تھی۔ روزنامہ انقلاب مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے روزنامہ زمیندار سے علیحدگی کے بعد جاری کیا تھا۔ چھپن فیصد کا نعرہ سر فضل حسین کی اختراع تھی کیونکہ غازی علم دین کی نعش کی وصولی کی تحریک کو سر محمد شفیع اور سر فضل حسین نے حکومت برطانیہ کے سامنے بڑی چابکدستی سے پیش کر

کے کامیابی حاصل کی تھی اگرچہ غازی علم دین کمیٹی کے کرتا دھرتا غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصر تھے اور انہوں نے عوام کو خاصا متحرک کیا تھا۔ اس تحریک کی کامیابی کے بعد روزنامہ انقلاب کے اداریہ میں لال دین قیصراور ان کے رفقاء کی بہادری اور جوانمردی کی تعریف کرتے ہوئے ان سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ اب مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ دوسرے دن "انقلاب" میں یہ شہ سرخیاں شائع ہوئیں: کانگرس کو مسلمانوں کا آخری الٹی میٹم' لاہور میں حفاظت حقوق کی مہم شروع ہو گئی۔ غازی علم دین کمیٹی کے مجاہدوں کا نیا میدان عمل' چھپن فیصد کمیٹی کا فوری قیام|وغیرہ۔

غازی علم دین کمیٹی کی طرح "چھپن فیصد" کا دفتر بھی کوچہ چابکسواراں میں غلام مصطفیٰ حیرت کی بیٹھک میں کھولا گیا۔ لال دین قیصر قریب ہی کوچہ ککے زئیاں میں رہتے تھے۔ ککے زئی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مولانا عبدالمجید سالک کے ہم زلف بھی تھے۔ وہ بڑے جیالے نوجوان تھے۔ ان کی پنجابی شاعری میں انگارے برستے تھے۔ جلیانوالہ باغ کے سانحے کے بعد جب لاہور میں مارشل لاء لگا تو لال دین قیصر کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ بعد میں جب عام معافی کا اعلان ہوا تو اس دن ان کی رہائی ہوئی۔

چھپن فیصد تحریک کو پنجاب کی خلافت کمیٹی نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں راوی کے کنارے کانگرس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ خیموں اور چھولداریوں کا ایک شہر آباد کیا گیا جس کا نام "لاجپت نگر" رکھا گیا۔ یہ وہی لاجپت رائے تھے جو ایک سال پہلے گول باغ ٹھنڈی سڑک پر ایک پولیس سارجنٹ سانڈرس کی لاٹھی لگنے سے ہلاک ہوگئے تھے۔ انہی کی موت کے انتقام میں سانڈرس کو دن دیہاڑے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے "لاہور سازش" کا مقدمہ قائم ہوا اور بھگت سنگھ وغیرہ گرفتار ہوئے۔

لالہ لاجپت رائے کی موت نے انہیں ہیرو بنا دیا تھا۔ حالانکہ وہ زندگی کی آخری دہائی میں خاصے ہندو مہاسبھائی تصورات کے مالک ہوگئے تھے اور اس طرح کانگرس کے موتی لال نہرو اور ان کے ہم خیال لوگ لاجپت رائے کے مخالف تھے۔ دریائے راوی کے کنارے نو آباد "لاجپت نگر" کے پنڈال کے مختلف دروازے تھے جن میں تلک

گیٹ، مظہرالحق گیٹ بڑے اہم تھے۔ مندوبین ہوٹلوں کے بجائے یہاں خیموں میں ٹھہرتے تھے۔ اسی برس جواہر لعل نہرو کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے، اس لیے شہر بھر میں اس جلوس کی تیاریوں کے لیے کانگرس کمیٹی سرگرداں تھی۔

جواہر لعل نہرو جب لاہور اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ چاروں طرف گاندھی ٹوپی کھدر کی شیروانیاں اور پھولوں کے ہار دکھائی دیتے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کے استقبال کے لیے ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ظفر علی، عبدالقادر قصوری، چودھری افضل، لالہ دنی چند انبالوی، گوپی چند بھارگو اور ڈاکٹر ستیہ پال اسٹیشن پر موجود تھے۔ جواہر لعل نہرو کو سفید براق گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ یہ جلوس ریلوے اسٹیشن سے سیدھا برانڈرتھ روڈ کے راستے سرکلر روڈ سے گزر کر دہلی دروازہ کے اندر جا داخل ہوا۔ یہاں سے چوک وزیر خاں، کشمیری بازار، سنہری مسجد، ڈبی بازار، باؤلی بزار ہٹہ سے رنگ محل، رنگ محل سے مچھلی ہٹہ کے راستے شاہ عالمی لوہاری سے ہوتا ہوا انارکلی میں داخل ہوا۔ انارکلی میں پنڈت جواہر لعل نہرو کو کئی ہزار کی تھیلی پیش کی گئی۔ یہاں پر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال موجود تھے۔ دوسرے دن جب اخباروں میں چیف جسٹس کا نام شائع ہوا تو چیف جسٹس نے اپنی موجودگی کی تردید واضح الفاظ میں کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ ان کا جواہر لعل نہرو کا استقبال کرنے والوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اگلے دن کانگرس مخالف سکھوں کے مشہور رہنما بابا کھڑک سنگھ، سکھوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس کی صدارت کے لیے لاہور پہنچے۔ سکھوں نے اسٹیشن سے انہیں ہاتھی پر بٹھا کر ان کا جلوس برانڈرتھ روڈ، سرکلر روڈ شاہ عالمی، لوہاری، انارکلی سے مچھلی ہٹہ اور پھر رنگ محل سے منٹو پارک تک نکالا۔ یہ جلوس بڑا منظم تھا کیونکہ کھڑک سنگھ جس ہاتھی پر سوار تھے اس کے آگے اور پیچھے آٹھ آٹھ سکھ برہنہ کرپانیں لہراتے جب زور سے پکارتے: "جو بولے سو نہال" تو سکھ کیا جلوس دیکھنے والے ہندو اور مسلمان تماشائیوں کو بھی ست سری اکال کہنا پڑتا۔

والد کی وفات

والد صاحب کے ساتھ لاہور کے جلسوں، جلوسوں میں شرکت اور ان کے احباب کی محفلوں میں جانے سے میرے اندر بڑوں کی باتیں سننے اور اپنی باتیں کہنے کی جھجک جاتی رہی۔ اپنے سے بڑوں کے ساتھ دوستی اور بے تکلفی کی تربیت مجھے گھر سے ملی۔ میرے دادا جان کے چھوٹے بھائی جان محمد کا بیٹا رفیق جو مجھ سے عمر میں سات آٹھ سال بڑا تھا، مجھے اس سے اس قدر لگاؤ اور پیار بڑھا کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت اور گرمی آتی گئی۔ سریانوالہ بازار کے اندر گلی میں پرائمری تعلیم جو چوتھی جماعت تک تھی، حاصل کرنے کے بعد دادا جان نے مجھے پانچویں جماعت کے لیے شیرانوالہ ہائی اسکول میں داخل کروادیا۔ گھر سے اسکول تک گلیوں، بازاروں سے پیدل گزرتے ہوئے یہ کوئی آدھ گھنٹے کا سفر تھا۔ چینیانوالی مسجد سے گزرتے ہوئے باؤلی، سنہری مسجد، کشمیری بازار، اس طرح مجھے اپنے کوچہ چابکسواراں کے اڑوس پڑوس کے مختلف گلی محلوں کی سیاسی اور مذہبی فضا کو دیکھنے کا بھرپور موقع ملا اور مجھ میں یہ شعور جاگ اٹھا کہ اگر شاہ عالمی میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے نعرے بلند ہوتے تھے تو اندرون موچی دروازے سے "چپ راست" کے نعروں کی گونج سنائی دیتی۔ اگر شاہ عالمی میں شدھی سنگھٹن کا جھگڑا سر اٹھاتا تو اندرون موچی دروازے کے سارے علاقے میں "نماز کمیٹیاں" قائم ہونے لگتیں۔ جب چھپن فیصد کا چرچا ہوا تو شاہ عالمی میں ہندو سبھا کا طوطی بولنے لگا۔ اس طرح ہر آن دو محاذ کسی نہ کسی انداز میں صف آراء رہتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے ہمیشہ یہیں سے بھڑکتے اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ آگ سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ چوک رنگ محل کا علاقہ جو ایک طرف شاہ عالمی اور موچی دروازہ کے سنگم پر واقع ہے، سب ہنگاموں کی بنیاد ہوتا تھا۔ لاہور میں ہندو مسلم فسادات کی ابتداء، جہاں تک مجھے یاد ہے چوک رنگ محل سے ہوئی۔ چوک رنگ محل کی مسجد حفیظ جو اس زمانے میں مسجد کے امام فضل الٰہی کی وجہ سے مسجد فضل الٰہی کہلانے لگی تھی، اس مسجد کے نیچے غلام مصطفیٰ حیرت کی سٹیشنری کی دکان تھی جہاں سر شام علمی ادبی اور سیاسی شخصیات کی محفل بلاناغہ سجتی تھی۔ میں یہاں لال دین قیصر،

پروفیسر محمد دین تاثیر' بدرالدین بدر اور عبدالرحمٰن چغتائی کو اکثر بیٹھے دیکھتا۔ کبھی کبھی مولانا چراغ حسن حسرت' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالمجید سالک کو یہاں آتے اور گفتگو کرتے بھی میں نے سنا۔

چوک رنگ محل میں جو بھی مسلمانوں کی سیاسی' سماجی اور مذہبی تحریکیں چلیں غلام مصطفیٰ حیرت اور ملک لال دین قیصران میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اس لیے متشدد ہندوؤں کے دلوں میں وہ دونوں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے اور وہ ان کے خلاف ہر وقت سازشوں کا جال بنتے رہتے تھے۔ چوک رنگ محل کا ایک ہندو دکاندار ہوا کرتا تھا کسی دیرینہ دشمنی کی بنا پر چند ہندوؤں نے اس پر قاتلانہ حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا۔ جب اس کے بچنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو چند متشدد ہندوؤں نے اس سے یہ بیان دلوایا کہ اس پر چار آدمیوں نے حملہ کیا ان میں سے تین آدمی غلام مصطفیٰ' لال دین اور علم دین تھے۔

اس بیان کی روشنی میں متشدد ہندوؤں نے غلام مصطفیٰ حیرت' لال دین قیصر اور علم دین جو کہ اس زمانے میں مجلس احرار اور خلافت تحریک کا سرگرم رکن تھا' ان تینوں پر قتل کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پولیس نے غلام مصطفیٰ حیرت' لال دین قیصر اور علم دین اور ایک نامعلوم شخص کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے۔ اس طرح غلام مصطفیٰ حیرت اور علم دین گرفتار کر لیے گئے جبکہ لال دین قیصر کی جگہ لال دین راج (معمار) نے اپنی گرفتاری دے دی۔

غلام مصطفیٰ حیرت کی گرفتاری نے میرے والد کو سب سے زیادہ پریشان کیا۔ وہ مصطفیٰ حیرت کی اس مقدمہ قتل سے باعزت رہائی چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تگ و دو شروع کی۔ میں نے اپنے والد کو اس سے پہلے کبھی اتنا اداس اور پریشان نہ دیکھا تھا۔ اس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ بچپن کی دوستی کیا ہوتی ہے! مصطفیٰ حیرت والد کے بچپن کے دوست ہجولی اور ہم جماعت اور ہمسایہ تھے۔ ہمارا پورا خاندان بھی بہت پریشان تھا لیکن والد کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کا تو کھانا پینا اور سونا تک حرام ہو گیا تھا۔ انہی تفکرات میں والد صاحب کو اچانک اپنڈکس کا شدید درد اٹھا۔

دادا جان انہیں نسبت روڈ ڈاکٹر گنیش کے کلینک پر لے گئے۔ ڈاکٹر گنیش اپنے

وقت کے مشہور سرجن تھے۔ ویانا سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ انہوں نے فوراً والد صاحب کے اپنڈکس کا کامیاب آپریشن کر کے انہیں اپنے کلینک میں انتہائی نگہداشت میں رکھا۔ یہ کلینک تین چار بستروں کا ایک اعلیٰ ہسپتال تھا جہاں والد صاحب کامیاب آپریشن کے بعد دس روز تک داخل رہے۔

چاند رات کو جب ہمارا پورا گھر صبح عید کی تیاریاں کر رہا تھا اور خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا' اچانک رات بارہ بجے کے قریب والد صاحب کے انتقال کی خبر پہنچی۔ یک دم گھر میں ہی نہیں پورے محلے میں کہرام مچ گیا۔ صبح عید کی نماز کے بعد انہیں گیارہ بجے کے قریب اپنے آبائی قبرستان بی بی پاک دامن میں دفن کیا گیا۔ والد کے جنازے میں شرکت کرنے والوں کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ ان کی نماز جنازہ دہلی دروازے کے باہر باغ میں ادا کی گئی۔

میرا بچپن میرا لڑکپن

والد صاحب کے انتقال کے وقت میری عمر بارہ سال تھی اور میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ میرا چھوٹا بھائی عبدالرؤف ابھی پانچ چھ سال کا تھا۔ عبدالرؤف سے بڑا ایک بھائی عبدالرحمٰن تھا جس کی وفات سال سوا سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ اس کے بعد عبدالرؤف پیدا ہوا۔ جس وقت میرے والد صاحب کا انتقال ہوا اس وقت میری ماں امید سے تھی اور پورے چھ ماہ کے بعد ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبدالمجید رکھا گیا لیکن یہ بھائی صرف چھ ماہ تک زندہ رہ سکا۔

جواں سال بیٹے کی موت دادا جان اور دادی جان کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ اس موت سے ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دادی جان تو جیسے پتھر ہو گئی تھیں' گم سم! اس کے بعد جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے مجھے ایک لمحہ بھی اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا۔ یہی حالت میری ماں کی تھی کہ وہ کسی پل عبدالرؤف کو اپنی گود سے الگ نہیں ہونے دیتی تھیں۔ گھر میں صرف دادا جان ہی ایک ایسی شخصیت تھے جو صبر و رضا کی تصویر نظر آتے تھے۔ اگرچہ اکلوتے بیٹے کی موت نے انہیں ادھ مُوا کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ اتنے مضبوط اعصاب اور پختہ ارادے کے مالک تھے کہ کسی سے اپنے

دل کی کیفیت بیان نہ کی لیکن میں نے جوان بیٹے کی موت کے بعد کبھی ان کی آنکھوں کو خشک ہوتے نہ دیکھا۔

دادا جان نے سب سے پہلے ان مسائل کے حل کا راستہ تلاش کیا جس میں خاندان الجھا ہوا تھا۔ دادا جان اور دادی جان چونکہ دونوں صاحب جائیداد تھے' ان کی وراثت کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ تھا' اس لیے سب سے پہلے انہوں نے گوالمنڈی کی زمینوں کی کرایہ داری کے حقوق جو دادی جان اور والد صاحب کے نام تھے ان میں والد صاحب کا حصہ والدہ صاحبہ کے نام منتقل کر دیا۔ اس طرح وہ گوالمنڈی کی زمینوں کا کرایہ وصول کرنے لگیں۔

دادا جان ان مسائل میں ایسے الجھے ہوئے تھے کہ انہیں میری پڑھائی کا خیال تک نہ رہا۔ چونکہ میں گھر سے کچھ فاصلے پر شیرانوالہ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا' دادا جان نے فوری طور پر مجھے اپنے محلے میں ہی رنگ محل مشن ہائی سکول میں داخل کروایا۔ والد کی موت کے بعد اب میں کھیل کود کی بجائے پڑھنے میں زیادہ کھل کر دلچسپی لینے لگا۔ اس سے پہلے مجھے گھر سے باہر جو کھیل کود کا موقع ملا وہ صرف اس وقت ہوتا جب دادی اور امی جان سے نظریں بچا کر گلی میں نکل جاتا اور وہاں گلی ڈنڈا' گیند اور بنٹے کوئی بھی کھیل کھیلنے لگتا۔ لیکن جونہی گھر میں سے کسی کی نظر پڑتی تو مجھے بلا لیا جاتا اور پھر گھر میں کمرے میں بند ہو کر پڑھنا شروع کر دیتا اور یہ کتابیں نصابی نہیں ہوتی تھیں۔

گلی محلے میں کھیل کود کرتے ہوئے میرے دل میں ہمیشہ یہ خیال سمایا رہتا کہ مجھے والد کے دفتر سے آنے سے پہلے گھر پر ہونا چاہیے اور میں ایسا ہی کرتا۔ اس لیے گھر والوں کو والد سے شکایت کرنے کا موقع نہ دیتا۔ والد صاحب بھی میری اس عادت پر مجھے شام کو اپنے ساتھ دوستوں کی محفلوں میں لے جاتے۔ چھٹی مشن ہائی سکول سے کرنے کے بعد ساتویں جماعت میں پھر سے دادا جان نے مجھے شیرانوالہ ہائی اسکول میں داخلہ لے دیا۔ کیونکہ ان کا تعلق اہل حدیث مکتب فکر سے تھا اس لیے پوتے کا مشن اسکول میں پڑھنا انہیں گوارا نہ تھا۔ دادا جان مولانا ابوالکلام آزادؒ سے از حد متاثر تھے بلکہ وہ مولاناؒ کے کلام کے بھی مداح تھے۔ اس زمانے میں شیرانوالہ میں "الہلال بک ایجنسی" نے مولانا آزادؒ کے خطبات اور "قول فیصل" جو ان کا عدالتی بیان تھا انہیں پمفلٹوں کی

صورت میں شائع کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے گھر میں یہ پمفلٹ باقاعدگی سے آتے تھے اور دادا جان ان کا مطالعہ بغور کرتے تھے۔ میں بھی انہیں توجہ سے پڑھنے لگا تھا۔ اس زمانے میں کوئی زیادہ شعور تو نہ تھا لیکن مجھے ان خطبات نے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے ان کے کئی حصے ازبر کر لیے۔ اس طرح مجھے یاد ہے کہ جب مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے دادا جان سے باصرار یہ تفسیر منگوائی۔ ہمارے گھر میں جو اخبارات و رسائل آتے تھے' ان میں مولانا داؤد غزنویؒ کا ہفتہ وار رسالہ "توحید" بھی تھا جو امرتسر سے شائع ہوتا تھا اور وہ رسالہ ہمیں بذریعہ ڈاک ہر ہفتے موصول ہوتا تھا۔

وہ دور مجلس احرار کا سنہری دور تھا۔ ان عمائدین کی تحریر اور تقریر نے مجھے ہی کیا تمام زمانے کو متاثر کیا۔ اس زمانے میں کسی کی خطابت سے متاثر ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ سننے والا اعلیٰ ذوق رکھتا ہے' وہ شعر سمجھ لیتا ہے اور الفاظ کی بندش پر سر دھن سکتا ہے۔ اس دور کی خطابت میں الفاظ و تراکیب اس طرح سے ہوتی تھیں جیسے کوئی شاعری کر رہا ہو۔ دوسرا بات بات پر خطیب بھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم سے شعر پڑھتا تھا کہ تماشائی مسحور ہوتے' اس طرح ساری ساری رات وہ جلسہ گاہ میں تماشائیوں کو بٹھائے رکھتے' دراصل یہ دور خطابت کا دور تھا' تھیٹر کا دور تھا' کیونکہ تھیٹر میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔

تھیٹر سے ہی یاد آیا' اس وقت ادب میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے "انارکلی" کی بڑی دھوم مچی۔ مجھے اس کو خریدنے کا شوق پیدا ہوا' چنانچہ میں نے پہلی کتاب جو دادا جان کو بتائے بغیر اپنے جیب خرچ سے خریدی تھی وہ یہی کتاب تھی۔

آٹھویں جماعت میں تھا کہ میں نے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت پر ایک مضمون لکھا جس میں اس عہد کی خطابت کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس مضمون میں' میں نے اس دور کی خطابت پر تھیٹریکل اثرات کا نمایاں ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ چونکہ ایسی خطابت سے سامعین کو ایک وقت میں ہنسانا' رلانا اور شدید قسم کے جذبات کو ابھارنا لازم ہوتا ہے' اس لیے ایسا ہی خطیب کامیاب ہو سکتا تھا جسے ایسی خطابت کا ہنر آتا ہو۔ آٹھویں جماعت تک ہمارا ادبی مطالعہ خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔ چونکہ ادب کے

مطالعہ کی ابتدا پرائمری اسکول کی پڑھائی کے بعد پانچویں جماعت سے شروع ہوئی (اس وقت پرائمری اسکول میں صرف چار جماعتیں ہوتی تھیں) اس لیے چوتھی جماعت کے بعد پانچویں جماعت کے لیے ہمیں شیرانوالہ اسکول میں داخلہ لینا پڑا۔ اس دوران ادبی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی اصل وجہ ہمارے محلے میں ایک پرائمری اسکول کے استاد ماسٹر جان محمد تھے جنہیں ناول پڑھنے کی لت پڑ گئی تھی۔ ان کا محبوب مشغلہ دن رات ہر طرح کے ناول خریدنا اور پڑھنا تھا۔ جب میں نے ان سے ناول پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے میرا خاندانی پس منظر جانتے ہوئے مجھے عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری کے تاریخی اور اصلاحی ناول پڑھنے کو دیئے۔ ان کے پڑھنے سے جہاں میرے اندر انگریز اور عیسائیوں سے دشمنی کے جذبات پیدا ہوئے وہاں مجھے ان ناولوں نے مسلمانوں کی بہادری و شجاعت کا قائل کیا اور غلامی کے خلاف لڑنے کے لیے اکسایا۔ یہ ناول بھی دراصل اسی شعور اور جذبات کو ابھارنے کے لیے تخلیق کیے جاتے تھے۔ بعد میں میں نے ماسٹر جان محمد سے ہی کرائے پر جاسوسی ناول بھی پڑھنے شروع کیے اس طرح "بہرام ڈاکو کے کارنامے" سے لے کر تیرتھ رام فیروزپوری کے تمام ناول پڑھ ڈالے۔ ان مہماتی ناولوں سے متاثر ہو کر میں نے اپنے محلے دار شیخ اختر کے ساتھ مل کر سب سے پہلے ایک جاسوسی ناول لکھنا شروع کیا۔ اس ناول کا نام "لال ٹھڑا" رکھا گیا۔ یہ ناول مکمل کیوں نہ ہو سکا' اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں۔

نویں جماعت میں تھا کہ حفیظ جالندھری کے ترنم اور "شاہنامہ اسلام" کا چرچا سنائی دیا۔ میں نے مختار اور صدیق کے ساتھ مل کر (یہ دونوں میرے ہم جماعت اور ہم خیال تھے) "شاہنامہ اسلام" کا ہی نہیں بلکہ مجلس احرار کے رہنماؤں کے انداز کی تقریریں رٹنے اور انہیں اسی انداز میں بیان کرنے میں مہارت کے لیے ایک پروگرام بنایا۔ چیخ چیخ کر روانی سے بولنے اور لہک لہک کر گانے سے ہم سب کے گلے خراب ہو گئے۔ میرا گلا اس قدر متاثر ہوا کہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق گلے کے غدود کاٹنے کے لیے مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا' لیکن جس دن میرے گلے کا آپریشن تھا اسی دن قادیان میں مجلس احرار کی کانفرنس ہو رہی تھی' چنانچہ میں نے دادا جان سے اس کانفرنس میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے خوشی سے نہ صرف اجازت دی بلکہ

محمد رفیق کو بھی میرا ہم سفر بنا دیا جس سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ دادا جان کی مجلس احرار سے عقیدت کی سب سے بڑی وجہ مولانا داؤد غزنوی تھے۔

والد صاحب کی وفات کے بعد جلسے جلوسوں میں میری دلچسپی بڑھانے میں غلام مصطفیٰ حیرت سب سے پیش پیش تھے۔ میں بھی ان کی دکان پر جہاں سر شام علمی ادبی اور سیاسی شخصیتوں کا جمگھٹا لگنا شروع ہو جاتا تھا بے دھڑک آ جا سکتا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ غلام مصطفیٰ حیرت نے باپ کے مرنے کے بعد مجھے باپ کی طرح بے پناہ محبت اور شفقت سے نوازا تھا۔ اصل میں وہ باپ کی کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ میرے باپ کے عزیز ترین دوست تھے۔ ایک کسک شاید ان کے دل میں یہ بھی تھی کہ میرے والد کی اچانک موت کا وہ اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے تھے کیونکہ جب وہ قتل کے مقدمہ میں گرفتار ہوئے تو ان کی رہائی کے سلسلے میں والد صاحب نے بے پناہ بھاگ دوڑ کی اور اسی بھاگ دوڑ میں اچانک انہیں اپنڈکس کا جان لیوا درد اٹھا۔ مصطفیٰ حیرت کے مقدمہ قتل میں ڈاکٹر محمد اقبال وکیل صفائی کے طور پر عدالت میں پیش ہوئے تھے۔ والد کی موت کے چھ ماہ بعد غلام مصطفیٰ حیرت مقدمہ قتل سے باعزت طور پر رہا ہوئے۔

مجھے یاد ہے ایک بار غلام مصطفیٰ حیرت مجھے اپنے ساتھ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے ایک جلسے میں لے گئے جہاں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی تشریف فرما تھے۔ غلام مصطفیٰ حیرت نے ان سے میرا تعارف اپنے بھتیجے کے طور پر کروایا اور ان کے ساتھ اسٹیج پر بٹھایا۔ یہی وجہ تھی کہ دادا جان بھی میرا سیاسی اور مذہبی جلسوں میں جانا میرے لیے اچھا سمجھتے تھے۔

میں دسویں میں پڑھتا تھا کہ اس سال میری زندگی میں بڑا سانحہ گزرا اور یہ سانحہ میری دادی جان کی موت تھا۔ میری دادی اپنے جواں سال بیٹے کی موت کے پورے تین سال بعد وفات پا گئیں۔ اس موت نے مجھے تنہا کر دیا۔ گھر کی چار دیواری میرے لیے قبر کی خاموشی اور اندھیرا بن گئی۔ گھر میں اگر کوئی روشنی کی کرن یا خاموشی کی آواز تھی تو وہ محمد رفیق تھا۔ میرا چچا' میرا دوست!

بمبئی کی سیر

جس سال دادی جان کا انتقال ہوا' اس سال میں نے اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ سے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد والدہ نے دادا جان سے بمبئی میں اپنے ماموں محمد حسن کے ہاں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو دادا جان نے بخوشی نہ صرف ہمیں بمبئی میں جانے کی اجازت دی بلکہ وہاں پر ہماری اچھی رہائش اور سیرو تفریح کے لیے اچھے بندوبست کے لیے محمد حسن کو لکھ بھیجا۔

محمد حسن میری والدہ کے سگے ماموں تھے۔ گھر میں دولت کی فراوانی کے باعث بڑے شاہ خرچ بلکہ بہت خرچیلے واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے شادی سے پہلے اور شادی کے بعد دونوں ہاتھوں سے دولت کو لٹایا' جب نوبت فاقوں تک پہنچی تو وہ لاہور کو خیرباد کہہ کر بمبئی چلے گئے۔

بمبئی میں انہوں نے شاہجہان ہوٹل کے نمائندے یا ایجنٹ کے طور پر ملازمت اختیار کرلی' ان کا کام ریلوے اسٹیشن سے ایسے مسافروں کو جو بمبئی میں سیرو تفریح یا کاروباری مصروفیات کے سلسلے میں آتے تھے انہیں اسی ہوٹل میں قیام کرنے کی ترغیب دینا تھا۔ محمد حسن خاصے خوش لباس خوش شکل اور خوش زبان تھے' اس لیے انہوں نے بہت جلد پنجابیوں کے نمائندے کے طور پر شہرت حاصل کرلی' اس ملازمت میں ایک معقول تنخواہ کے ساتھ ساتھ ایک خاص کمیشن بھی ملتا تھا' اس لیے بمبئی میں وہ بہتر طور پر زندگی بسر کر رہے تھے۔

محمد حسن سے والدہ کے حد سے بڑھے پیار کی اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں ایک ہی گھر میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ محمد حسن کی شادی امرتسر میں ہوئی اور ان کی بھانجی اقبال بیگم کی شادی لاہور میں کوچہ چابکسوار میں منشی نورالٰہی کے اکلوتے بیٹے محمد عمر سے ہوئی تھی۔ محمد حسن تو اولاد کی دولت سے محروم رہے جبکہ اقبال بیگم کو خدا نے نرینہ اولاد عطا کی لیکن وہ شادی کے پورے پندرہ سال بعد بیوہ ہوگئیں۔ محمد حسن کی اقبال بیگم سے محبت میں خونی تعلق کے ساتھ ساتھ اب ہمدردی کا جذبہ بھی شامل ہوگیا تھا۔

اقبال بیگم کو اپنی بیوگی کے تین سال بعد ساس کو کھونا پڑا' جس نے ان پر گھریلو ذمہ

داریوں کا بھاری بوجھ ڈال دیا جس سے نمٹنے کے لیے ان میں نہ صلاحیت تھی اور نہ حوصلہ' وہ اپنی ذات میں گم رہنے والی خاتون تھیں۔

محمد حسن نے والدہ کی دلجوئی اور بچوں کے دل بہلاوے کے لیے انہیں جب بھی چند روز کے لیے بمبئی آنے کی دعوت دی تو والدہ نے ہمیشہ بچوں کی پڑھائی کا بہانہ بنایا۔ آخر اس بار جب میں نے میٹرک کا امتحان دینے کے بعد بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو والدہ نے اپنے ماموں جان سے کہا کہ اس بار عبداللہ جب میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوگا تو ہم سب لوگ آپ کے ہاں بمبئی آئیں گے۔ اس طرح ہم تینوں والدہ' میں اور میرا چھوٹا بھائی عبدالرؤف ملک بمبئی پہنچے۔

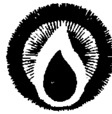
بمبئی میں ہمارا کوئی تین چار ہفتوں کا پروگرام تھا۔ محمد حسن نے سب سے پہلے ہمیں اپنے ہاں باندرہ میں ٹھہرایا۔ وہ ایک مختصر سی' میاں بیوی کے لیے اچھی رہائش گاہ تھی۔ باندرہ بمبئی کی ایک بہت مشہور بستی ہے' اس زمانے میں بمبئی کے تمام بڑے رؤسا اور تمام بڑے لوگ یہاں رہتے تھے' جہاں متوسط طبقہ بہت کم تھا۔ زیادہ تر ایکٹر اور ایکٹرسیں اور صنعت کار یا فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں رہنا پسند کرتے تھے۔

ماموں محمد حسن کو اب ہم بھی محمد حسن کے بجائے ماموں کہنے لگے تھے۔ ماموں محمد حسن کی اس مختصر سی رہائش گاہ میں بھی ان دنوں امرتسر سے ان کی بیوی کا بھائی جو ایکٹر بننے کے لیے بمبئی آیا ہوا تھا' رہائش پذیر تھا۔ اس طرح تین ان کے اور تین ہمارے افراد کی وجہ سے یہ جگہ تنگ پڑ گئی تھی۔

ممانی کے بھائی کی آمد نے میرے لیے خاصی تفریح مہیا کی' خاص کر ان کے ساتھ مجھے بمبئی کے فلم اسٹوڈیو اور فلمی ستاروں کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا کیونکہ وہ ہر روز فلم اسٹوڈیو میں اپنی قسمت آزمائی کے لیے جاتے تھے۔ اس طرح مجھے اس عہد کی مشہور اداکاراؤں اور گلوکاراؤں جیسا کہ سلوچنا اور گوہرجان وغیرہ سے ملنے کا موقع ملا۔

دادا جان کو جب معلوم ہوا کہ بمبئی میں ہم سب مل کر ایک مختصر رہائش گاہ میں رہ رہے ہیں تو انہوں نے ماموں محمد حسن کو ہمارے لیے الگ رہائش کے بندوبست کے لیے لکھا۔ چنانچہ انہوں نے ہمیں سنٹرل بمبئی کے بھنڈی بازار میں ایک کمرہ کرایہ پر لے

دیا۔ جس بلڈنگ میں یہ کمرہ تھا' اس کے نیچے کتابوں اور اسٹیشنری کی دکان تھی' جس میں ایک آنہ لائبریری تھی' جہاں سے میں نے روزانہ کرایہ پر داستان امیر حمزہ اور فسانہ آزاد کی تمام جلدیں پڑھ ڈالیں' کلاسیک ادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہم نے بمبئی میں جی بھر کر سیرو تفریح میں یہ دن گزارے۔ جب بمبئی سے لاہور واپسی کی اطلاع دادا جان کو ہوئی تو محمد رفیق اور میری ماں کے ماموں زاد بھائی الطاف نے دادا جان سے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دہلی جا کر عبداللہ کا استقبال کریں۔" دادا جان کی رضامندی سے محمد رفیق اور الطاف حسین ہمیں لینے کے لیے دہلی پہنچے اور وہاں سے ہم سب مل کر خوب ہلے گلے کے ساتھ ٹرین کے ذریعے لاہور پہنچے۔ دہلی سے لاہور تک کا یہ سفر بھی بڑا یادگار سفر تھا۔ میٹرک کا امتحان میں نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔



باب 3

گورنمنٹ کالج نئی دنیا نئے معرکے

میٹرک کے بعد دادا جی کی خواہش کے مطابق میں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ اس زمانے میں خاصی مشکل سے ملتا تھا لیکن فضل حسین جب مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانے میں وزیر تعلیم تھے تو ان کی زبردست کوششوں سے گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلباء کے لیے 40 فیصد نشستیں مختص کر دی گئی تھیں۔ یہ 1924ء کی بات ہے اور اس اقدام پر پنجاب کے ہندو اور سکھوں اور ان کے اخبارات نے بڑا شور مچایا تھا اور اس احتجاج میں پنجاب کانگرس بھی شامل ہو گئی۔ یہ احتجاج اتنا شدید ہوا کہ گاندھی جی نے پنجاب کا دورہ رکھ لیا اور یہاں آکر انہوں نے میاں فضل حسین سے ملاقات کی تو میاں فضل حسین نے ان کو جب پورے معاملہ سے آگاہ کیا تو گاندھی جی نے کھلم کھلا میاں فضل حسین کی تائید کر دی' اس پر پنجاب کانگرس اور ان کے ہندو سکھ پیروکار خاموش ہو گئے۔ لیکن وہ یہ کھلے عام کہتے رہے کہ میاں فضل حسین نے اپنی چرب زبانی سے گاندھی جی کو بھی شیشے میں اتار لیا' چنانچہ میاں فضل حسین کا یہی اقدام تھا جس سے مجھ جیسے سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کرنے والے طالب علم کو بھی گورنمنٹ کالج ایسے اعلیٰ معیاری تعلیمی ادارے میں داخلہ مل سکا۔ لیکن اس سہولت اور رعایت کے باوجود میرے دادا نے اپنی واقفیت کو بھی استعمال کیا۔

اس وقت گورنمنٹ کالج ایک ایسی تعلیمی درسگاہ تھی' جہاں مخلوط تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کا پورا ماحول مغربی تہذیب زدہ تھا' جہاں داخلہ میرٹ کی بنیاد پر ملتا تھا۔ ہر طالب علم کے لیے کم از کم فسٹ ڈویژن میں پاس ہونا لازمی تھا اس لیے دادا جان کو

بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ مجھے یاد ہے داخلے کے انٹرویو سے ایک روز پہلے داداجان مجھے اپنے ہمراہ تانگے میں بٹھاکر مزنگ ٹانگوں کے اڈے کے ساتھ والی سڑک کے اندر ایک دو منزلہ مکان پر لے گئے جہاں ملک احمد حسن رہتے تھے۔ جب ان سے گورنمنٹ کالج میں میرے داخلے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے مجھے بغور دیکھا اور میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "ماشاء اللہ" اس کے بعد وہ دادا جان سے میرے والد کے متعلق باتیں کرنے لگے اور آخر میں کہا۔ "منشی صاحب' آپ اطمینان رکھیں' ہمارا یہ بچہ گورنمنٹ کالج میں ضرور داخل ہوگا۔" یہ سن کر داداجان بہت خوش ہوئے۔ واپسی پر دادا جان نے مجھے راستے میں بتایا۔ "یہ ملک صاحب گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے استاد ہیں' ان کا تعلق ہماری برادری ککے زئی سے ہے' یہ لوگ سیالکوٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور سیالکوٹی ککے زئی کہلاتے ہیں۔"

دوسرے روز جب میں انٹرویو کے لیے گورنمنٹ کالج پہنچا تو انٹرویو کے لیے آئے ہوئے چند لڑکوں نے شلوار قمیص اور ہاف کوٹ پہن رکھے تھے۔ انٹرویو بورڈ میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل گریٹ کے ہمراہ جو دو پروفیسر تھے ان میں پروفیسر احمد شاہ بخاری اور پروفیسر ملک احمد حسن موجود تھے۔ انٹرویو میری توقع کے برعکس بڑے خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں ہوا۔ اس کی وجہ پروفیسر ملک احمد حسن تھے۔ بہرحال جب داخلہ ملنے والے طلباء کی فہرست "نوٹس بورڈ" پر چسپاں کی گئی اس میں میرا نام بھی شامل تھا۔ ملک احمد حسن سے میں دو سال تک فلسفہ جبکہ سائیکالوجی قاضی اسلم سے پڑھتا رہا' ان دونوں حضرات سے مرتے دم تک میری نیازمندی کا سلسلہ جاری رہا۔ گورنمنٹ کالج میں میری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

اس سے پہلے میری زندگی پر جو مختلف افکار اور اسلوب اثرانداز تھے' انہیں ایک زبردست دھچکا لگا۔ میرے لیے نیا ماحول بالکل ایسے تھا جیسے میں ایک گھٹن اور تعفن زدہ فضا سے نکل کر یکدم ایک کھلی سرسبزو شاداب وادی میں نکل آیا ہوں' میرے چاروں طرف رنگوں اور خوشبوؤں میں بسی پھولوں کی خوبصورت روشیں ہیں۔ یہاں پر ایسے ایسے خاندانوں کے بچوں سے ملا جس نے میرے اندر فوراً یہ احساس پیدا کیا کہ اگرچہ ہمارا خاندان ایک صاحب حیثیت خاندان ہے لیکن بااختیار ہرگز نہیں۔

دادی جان کی وفات کے بعد دادا جان ہی ہمارے "گارڈین" تھے۔ وصیت کے مطابق منشی نور الٰہی اور عمدہ جان کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے صرف دو یعنی عبداللہ اور عبدالرؤف ہی صحیح وارث تھے اور یہ دونوں ابھی نابالغ تھے' اس لیے کسی کو تو ان کا "گارڈین" ہوناتھا۔ ہم دونوں عبداللہ اور عبدالرؤف ابھی زیر تعلیم تھے۔ اس لیے ایک عدالتی فیصلے کے مطابق ہم دونوں بھائیوں کے لیے چھتیس روپے ماہوار خرچہ مقرر ہوا چنانچہ کالج میں داخلہ کے بعد دادا جان نے میری تعلیم اور جیب خرچ کے لیے چودہ روپے ماہوار مختص کردیئے۔

میرے لیے یہ معقول رقم تھی۔ اس کے باوجود کالج میں امیر بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنی حیثیت کم تر محسوس ہونے لگی' جس سے میں ایک طرف تو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا' دوسرا میں نے ایک طرح کی ظاہرداری دکھانا شروع کردی۔ میری جماعت میں ذوالفقار بخاری' محمد اجمل' حمید شیخ' امیر احمد صدیقی ایسے مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں میں راج ہنس کرشن اور کالی چرن سے خوب میل ملاپ تھا۔ ان چاروں میں مولوی ابراہیم علی چشتی' محمد اجمل' قادیان کے احمدی خانوادے کے مرزا مبارک اور مرزا منور کے نام شامل تھے' ان کے علاوہ بٹالہ کے پیر خانوادے کے لڑکے اپنا مشرقی لباس پہنتے تھے۔ کالج میں پہلے سال تو میں نے بھی شلوار قمیض ہی پہنی لیکن دوسرے سال جب میں نے بڑی جرات سے سفید زین کی پتلون اور چیک کا ٹھنڈا کوٹ سلوایا تو مجھے یاد ہے' دادا جان نے مجھے اس لباس میں دیکھا اور اس قدر غضبناک ہوئے کہ ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا: "کیا تم عیسائی ہو گئے ہو؟" اس وقت دادا جان کے عقائد میں یہ تصور مسلم تھا کہ جس قوم کا لباس تم پہنو گے' قیامت کے روز اسی قوم کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے۔

مجھے دادا جان کے اس رویے کی قطعاً سمجھ نہ آئی کیونکہ میرے والد خود سوٹ پہنتے اور ٹائی لگاتے تھے۔ چنانچہ بعدازاں جب میں نے ٹائی لگانا شروع کی تو مدتوں تک نکٹائی کی گرہ میری ماں ہی باندھا کرتی تھی۔

یہ میری ہٹ دھرمی ہی سمجھیں یا بغاوت کہ میں نے دادا جان کی سنی ان سنی کردی اور بہت جلد دادا جان نے بھی حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا تبھی تو مجھ سے بلکہ میرے

لباس سے بھی چشم پوشی کرنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ایسا لباس زیب تن کرنا شروع کر دیا جس سے میری شخصیت سے امارت ٹپکتی ہو' اس طرح میرا شمار کالج کے خوش لباس طالب علموں میں ہونے لگا۔

لباس میں نفاست پسندی مجھے ماں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی لیکن کالج میں نفاست پسندی سے زیادہ خود نمائی کا پہلو نمایاں تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میری دوستی لاہور کے مختلف اعلیٰ طبقوں سے ہو گئی۔ گوردھن لال مغنی' خلیفہ نسیم سے تو دوستی کالج کی حدود تک محدود نہ رہی بلکہ ان کے ساتھ ہمارا دن رات کا اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا۔ ہم انگریزی فلمیں صرف اس لیے دیکھتے تھے کہ ان کے لباس کے نت نئے ڈیزائن معلوم کرتے اور پھر لاہور کے مشہور ٹیلروں کے چکر کاٹتے۔ انارکلی اور مال روڈ کی سڑکوں پر اکثر مٹر گشت کرتے' اس وقت ڈیپارٹمنٹل سٹور یا پلازہ تو نہیں تھے' البتہ آرائش کا تمام سامان جنرل سٹور سے دستیاب ہو جاتا تھا۔ کپڑا' ہوزری پرفیومز' شیو کا سامان! اس وقت دو اہم جنرل سٹور تھے' ایک انارکلی میں راجہ برادر اور دوسرا مال روڈ پر لیلٰے رام برادرز' جہاں نہ صرف کپڑا ملتا تھا بلکہ سلائی کا کام بھی ہوتا تھا۔

لاہور میں ٹیلرنگ کی سب سے بڑی دکان "ڈینکن ٹیلرز" تھی۔ یہ ایک اطالوی فرم تھی۔ اس وقت ٹیلرنگ کی سب سے بڑی مارکیٹ انارکلی میں دھنی رام روڈ پر تھی جہاں سے ہم کپڑے سلواتے تھے۔

ایک دن اچانک امیر احمد صدیقی اور کالی چرن نے مجھ سے کہا: "ہم تمہارے گھر چابکسواراں میں آج شام کو آئیں گے۔" یہ سن کر میں بہت گھبرایا کہ یہ لوگ اس تنگ و تاریک گلی کوچوں کی زندگی کو دیکھ کر کیا تاثر قائم کریں گے۔ اس لیے میں نے انہیں گھر آنے کی بجائے کسی اچھے ہوٹل میں دعوت دی' جسے انہوں نے قبول نہیں کیا بلکہ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم آج تمہیں سرپرائز دیں گے۔ اس طرح مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑی' لیکن میں بڑا پریشان تھا۔ امیر احمد صدیقی پبلک پراسیکیوٹر نصیر احمد صدیقی کے صاحبزادے تھے اور ان کی رہائش جنازہ گاہ کے قریب "الفیض" کوٹھی میں تھی۔ کالی چرن مونا سکھ تھا' اس کا تعلق لدھیانہ سے تھا' اس کا باپ یونینسٹ حکومت میں پارلیمنٹری سیکریٹری تھا۔

ان دونوں دوستوں کا جب وہ شام کو رنگ محل پہنچے تو میں نے پرتپاک استقبال کیا اور پھر انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر میں اپنی بیٹھک میں بٹھایا' گھر کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد بڑے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کالی چرن نے شراب کی نصف بوتل پتلون کی جیب سے نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا: "آج سے ہماری دوستی کی تکون میں یہ بوتل مرکزی نقطہ کے طور پر ابھرے گی۔" میں نے حیرانی سے بوتل کی طرف دیکھا جس پر "جون ہیگ" کا خوبصورت لیبل چسپاں تھا۔ وہ واقعی انگریزی شراب تھی۔

میرے لیے شراب پینے کا تو کیا چکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کے باوجود ہم تینوں نصف گھنٹے میں جون ہیگ کی نصف بوتل اپنے اندر انڈیل چکے تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس نصف بوتل کی نصف شراب میں نے پی تھی' اس کے باوجود ان دونوں کے مقابل میں زیادہ ہوش میں تھا جبکہ وہ دونوں مدہوش سے دکھائی دے رہے تھے۔

شراب نوشی کا یہ پہلا تجربہ بڑا کار آمد ثابت ہوا' کیونکہ شراب کے بارے میں جو خدشات اور وسوسے میرے ذہن میں تھے' وہ یکدم دور ہو گئے۔ شراب مجھے اپنی دشمن نہیں دوست لگی۔ شراب کے متعلق عام تاثر ہے کہ اسے اوباش اور جرائم پیشہ لوگ پیتے ہیں اور شراب پینے والا اپنا ہوش و حواس کھو دیتا ہے' اسے اچھے برے کی پہچان نہیں رہتی' وہ اس قدر لڑکھڑا جاتا ہے کہ اسے اپنے قدموں پر چلنا تو دور کی بات ہے وہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔

اس دوران شراب نوشی نے مجھ پر کوئی ایسی کیفیات طاری نہیں کیں بلکہ مجھے یکدم چاک و چوبند کر دیا تھا۔ اس سے پہلے میں اپنے آپ کو ڈرا ڈرا سہا سہا محسوس کرتا تھا لیکن شراب نے میرے اندر زبردست حوصلہ اور بے پناہ خود اعتمادی پیدا کر دی۔ یہ سب کچھ ان کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ جب میں انہیں الوداع کہنے کے لیے ان کے ساتھ رنگ محل چوک پہنچا تو انہوں نے میری گفتگو سے اندازہ لگا لیا کہ مجھے اس وقت شراب کی اشد ضرورت ہے' اس لیے انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں نیا فیصلہ کرنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ لیا اور ہیرا منڈی کی طرف پیدل چل دیئے۔ ہیرا منڈی میں دو تین دیسی شراب کے اڈے تھے۔ دیسی شراب کو "ٹھرا " کہا جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم تینوں نے "ٹھرا" کا ایک ایک گلاس مزید اپنے اندر انڈیلا' یہ تیز شراب تھی' اس کے

پینے سے مجھے محسوس ہوا کہ میں نے جلتی آگ سی نگل لی ہے۔ اس آگ نے بھی میرے اندر کو یکدم جلا کر راکھ نہیں کیا بلکہ میرے دل و دماغ کی رگوں میں رینگنے والے خون میں اس قدر آگ بھر دی کہ وہ دوڑنے لگا۔ گویا شراب مجھ پر یا میری ذات پر کبھی سوار نہیں ہوئی' بلکہ ہمیشہ میں ہی شراب پر حاوی رہا۔ اس دن سے آج کے دن تک ہمیشہ یہی ہوا ہے۔

انگریزی فلموں سے لباس کے جدید فیشن نوٹ کرنے سے ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ ڈبل بریسٹ کوٹ کے بٹن کتنے ہوتے ہیں' کون سا بٹن بند کیا جائے اور کسے کھلا رہنا چاہیے۔ ٹائی کی گرہ کیسی باندھی جائے' قمیض کا کالر کیسا ہو۔ ان دنوں ہمارے پسندیدہ اداکاروں میں رونالڈ کال مین' گریٹا گاربو' مارلین ڈیٹریچ' ریزر فلنین اور سب سے اہم چارلس بائیر شامل تھے' جنہوں نے نپولین کا کردار ادا کیا تھا۔

جہاں تک ہندوستانی تھیٹر اور فلم کا تعلق ہے تو میں نے سب سے پہلی فلم اپنے والد کے ساتھ 1931ء میں عالم آرا' ریجنٹ سینما میں دیکھی' یہ برصغیر کی پہلی بولتی فلم تھی' جسے اس وقت ٹاکی فلم کہا جاتا تھا۔ اس فلم کے بعد میں نے میڈن تھیٹر میں لیلیٰ مجنوں ڈرامہ دیکھا۔ اس ڈرامہ میں مجنوں کا کردار ماسٹر نثار اور لیلیٰ کا کردار کجن نے ادا کیا تھا۔ بعد میں میڈن تھیٹر کمپنی نے فلم کمپنی بنا کر اس ڈرامے پر فلم بنائی تو بھی لیلیٰ کا کردار کجن اور مجنوں کا کردار ماسٹر نثار نے ادا کیا۔ اس فلم نے بھی پورے ہندوستان میں دھوم مچا دی۔ باپ کی موت کے بعد میں نے تھیٹر اور فلم کی طرف بالکل دھیان نہیں دیا' بلکہ میرا زیادہ تر دھیان جگہ جگہ سیاسی اور مذہبی جلسوں کی تحریکوں کی طرف تھا' جہاں پر زیادہ تر سیاسی ڈرامہ بازی کمال کی ہوتی تھی' جس نے مجھے بڑا متاثر کیا۔

گورنمنٹ کالج میں انگریزی فلموں کو ہم ایک خاص نقطہ نگاہ سے دیکھتے تھے' ان دنوں فلم "دیوداس" کے متعلق سنا' ہندوستان میں فلمی تاریخ میں نئی نسل کو غیر معمولی طور پر متاثر کرنے والی فلم "دیوداس" تھی۔ "دیوداس" کے ہدایت کار پی سی بروا تھے۔ پی سی بروا آسام کی ریاست گوری پور کے راجکمار تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے سرت چند چٹرجی کے بنگالی ناول کو "دیوداس" کے نام سے بنگالی میں فلمایا۔ اس فلم میں پی سی بروا نے خود دیوداس کا کردار ادا کیا۔ بنگالی زبان کی وجہ سے اسے بنگال اور

آسام صوبہ میں بڑی پذیرائی ملی۔ یہ دیکھتے ہوئے پی سی بروا نے "دیوداس" کو ہندی میں فلمانے کا منصوبہ بنایا' چنانچہ اس ہندی فلم میں پی سی بروا نے صرف اپنے آپ کو ہدایت کار کے طور پر ہی محدود نہ رکھا بلکہ اس فلم میں جاگیردار کا کردار ادا کیا چنانچہ یہ پی سی بروا کا ہی کردار تھا جس نے مجھے بے پناہ متاثر کیا اور تمام عمر میں نے اسی کردار کے سائے میں گزار دی۔ اس فلم میں دیوداس کا کردار کندن لال سہگل اور پارو کا کردار جمنا کر سونیا نے خوب نبھایا۔

فلم دیوداس نے پورے ہندوستان میں بے پناہ کامیابی حاصل کی' موضوع کے حوالے سے بھی یہ فلم رجحان ساز ثابت ہوئی' جس میں ایک جاگیردار معاشرے کے ایک نمائندہ کو آتش عشق اور محبت کے درد سے تڑپتے دکھایا گیا۔ یہ ایک خیالی اور رومانی فلم تھی' جس پر ہدایت کار کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ مجھے اس فلم نے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے یہ فلم کئی بار مختلف حوالوں سے دیکھی۔ بروا کا کردار' اس کا رہن سہن بڑا مثالی تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب بھی میرے پاس ڈھیروں دولت آئی تو میں اپنے لیے ایسا ہی ایک الگ گھر بناؤں گا' بالکل جاگیردار کی حویلی کی طرح بڑا اور الگ تھلگ جس میں ایک خوبصورت لائبریری اور ایک خوبصورت بار ہوگی۔ آخر پورے بیس اکیس سال کی جدوجہد کے بعد میں جب اپنا الگ مکان بنانے میں کامیاب ہوا تو اس گھر میں ایک "بار" تو نہ بن سکی البتہ ایک لائبریری ضرور بن گئی۔

تعلیمی اداروں میں تھیٹر کے حوالے سے گورنمنٹ کالج کا نام ہر دور میں سرفہرست رہا۔ ان دنوں پروفیسر احمد شاہ بخاری جن کا قلمی نام پطرس بخاری تھا' انگریزی کے پروفیسر تھے۔ کالج کی اسٹیج پر شیکسپئر کا ڈراما "ہملٹ" کھیلا جس میں OPHELIA کا نسوانی کردار ایک خوش شکل ہندو طالب علم برج موہن نے ادا کیا۔ کالج میں اس وقت مخلوط تعلیم تھی' پھر بھی کالج میں کھیلے جانے والے تمام ڈراموں میں صرف لڑکے ہی حصہ لیتے تھے۔ برج موہن کی خوش شکلی کی دھوم تمام کالج میں تھی۔ دوسرا اوفیلیا کے کردار نے اس کی خوبصورتی پر سونے پر سہاگے کا کام کر دکھایا۔ ہر کوئی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ برج موہن نہ صرف طلبا اور طالبات بلکہ اساتذہ کی نظر میں بھی تھا بلکہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی نظر کرم اس پر کچھ زیادہ ہی تھی۔ بخاری صاحب کی نوازشات کا چرچہ ہر زبان

پر تھا۔ بخاری صاحب کے ایک دلچسپ اور برجستہ جملے کی دھوم نے کالج میں بڑی خوشگوار فضا پیدا کردی۔

ہوا یوں کہ پطرس بخاری نے کالج کے میگزین "راوی" کی لڑکیوں میں ترسیل کی ذمہ داری بھی برج موہن کو سونپ دی' اس پر چند طالب علموں نے نوٹس بورڈ پر لگے کاغذ پہ لکھ کر یہ سوال چسپاں کردیا کہ "بخاری صاحب! برج موہن پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟" بخاری صاحب کی نگاہ جب اس نوٹس بورڈ پر لکھے سوال پر پڑی تو سخت ناراض ہونے یا غصہ سے بگڑنے کی بجائے مسکراکراپنی جیب سے قلم نکالااور فوراًاس سوال کے نیچے انگریزی میں لکھا:

Because Bridge Mohen is the only good looking but harmless student.

گورنمنٹ کالج کے ہم جماعتوں میں صرف ایک ہی طالب علم میرا شیرانوالہ ہائی سکول کا ساتھی تھا۔ یہ ذوالفقار علی بخاری تھا جس کو ہم "زلفی" کہہ کر پکارتے تھے جو نواب صاحب کے چوک میں رہتا تھا۔ یہ میرا خاصا بے تکلف اور گہرا دوست تھا' گو طبائع میں ہم ایک دوسرے سے خاصے مختلف تھے۔ وہ خاصا لاف زن تھا جسے لپھاڑیا یا لفاڑیا کہا جاتا ہے' وہ ہروقت گپیں ہانکتا رہتا تھا لیکن چرب زبان خاصا تھا' اسی چرب زبانی کی وجہ سے اس نے کالج میں کئی معرکے سر کئے۔ اس کی دوستی لاء کالج کے چند لڑکوں کے ساتھ تھی اور جب گورنمنٹ کالج میں شیکسپیئر کا ڈراما "ہملٹ" کھیلا گیا تو اس سے متاثر ہو کر لا کالج کے لڑکوں نے بھی ڈرامہ اسٹیج کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ حکیم احمد شجاع پاشا کا ڈرامہ "باپ کا گناہ" منتخب کیا گیا' اس میں ہیرو کا کردار ذوالفقار علی بخاری یعنی "زلفی" کر رہا تھا۔ چنانچہ مجھے اس نے اس ڈرامے میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے پر مجبور کیا۔ اس ڈرامے کی ہدایت کاری خود حکیم احمد شجاع نے کی۔ یہ ڈراما خاصا کامیاب ہوا اور اس کے ساتھ ہی میرے بحیثیت ہیروئن اور اس کے حسن کے بھی چرچے ہونے لگے۔

گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے وقت میں ملکی سیاست سے بھی خاصا آشنا تھا' کیونکہ ایک تو مجھے بچپن سے ہی اخبار پڑھنے کی لت پڑ چکی تھی حتیٰ کہ اس زمانے میں

"زمیندار" اور "ٹریبون" اخبار پڑھا کرتا تھا اور پھر میں نے گاندھی جی کا "ہریجن" جو ہفتہ وار ہوتا تھا اور واردھا ضلع گجرات کاٹھیاواڑ سے شائع ہوتا تھا' پڑھنا شروع کیا۔ میں نے گاندھی جی سے زیادہ اور چھوٹے فقروں پر مشتمل انگریزی آج تک کسی کی نہیں پڑھی' چنانچہ اس وجہ سے مجھے مجلس احرار اور کانگرس دونوں سے ہی زبردست لگاؤ ہو گیا۔

گورنمنٹ کالج میں داخلے کے بعد میں ایک بالکل ہی نئی دنیا سے روشناس ہوا اور اس میں کھو بھی گیا۔ لیکن میری زندگی کا یہ وہ دور تھا کہ میں ایک چوراہا پر کھڑا تتر بتر چاروں طرف کی ہنگامہ خیزیوں اور دلفریبیوں کو دیکھ رہا تھا اور ہر ہنگامے میں کچھ دیر کھو جانے کو جی چاہتا تھا اور پھر دامن جھاڑ کر الگ ہونے کو۔ اس طرح گورنمنٹ کالج کے یہ دو سال بڑے معرکے اور ہنگاموں کے سال تھے جس میں بالآخر مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ چمک دمک کی دنیا' فیشن اور ریستوراں گردی کی زندگی اپنی تمام کشش کے باوجود میرے بس کا روگ نہیں کیونکہ مالی استطاعت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

ایک طرف مغنی گوردھن لال جن کو ہم صرف "لال' لال" کہہ کر پکارتے تھے' جن کی کچہری روڈ گورنمنٹ کالج کے قریب فرنیچر کی ایک بہت بڑی دکان تھی اور اس کے اوپر ہی ان کی رہائش تھی' یہ خاصے متمول کاروباری خاندان کے فرد تھے۔ مغنی بھاٹی دروازے کے اندر کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر جنرل تھے اور بڑا بھائی عبدالغنی بھی آل انڈیا پوسٹل سروس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور میرے تیسرے دوست خلیفہ نسیم اللہ تھے جن کے ساتھ ہمارے خاندانی مراسم تھے۔ یہ خلیفہ شجاع الدین قیام پاکستان کے بعد پنجاب اسمبلی کے سپیکر کے عہدے پر فائز ہوئے' ان کے خاندان سے متعلق تھے اور ان کے والد خود کلکتہ میں امپیریل لائبریری کے مدارالمہام تھے' ایک تو میرا یہ حلقہ تھا۔ دوسری طرف محمد اجمل' حمید شیخ' افضل اقبال کا حلقہ تھا یہ پڑھاکوؤں کا حلقہ تھا۔ ان کے ساتھ بھی میرا محلہ داری کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا تھا۔ تیسرا حلقہ جس نے مجھے متاثر کیا وہ پیرن بھروچہ' راج بنس کشن' رمیش چندرا' مظہر علی خاں' محمود علی خاں' بشیر قریشی کا حلقہ تھا' یہ سینئر طلباء تھے' صرف پیرن اور راج بنس کشن میرے ہم جماعت تھے اور یہی وہ گروہ تھا جس نے گورنمنٹ کالج میں پہلی بار

بغاوت کا پرچم لہرایا۔

قومی سیاست اور کھدر پوشی

دراصل ہمارا گورنمنٹ کالج کا یہ زمانہ سیاسی طور پر بڑے ہی ہنگاموں کا دور تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حکومت برطانیہ نے نئی اصلاحات کا اعلان کیا اور انڈیا ایکٹ 1935ء کا نفاذ عمل میں آیا۔

یہ اصلاحات کی آخری کڑی جو برطانیہ نے اس برصغیر کو دی اور اس کے تحت ہی ایک خاصی معتدبہ آبادی کو حق رائے دہی سے نوازا گیا۔ چنانچہ جب گورنمنٹ کالج میں داخلہ ہوا تو یہ ایکٹ نافذ ہو چکا تھا اور اس کے تحت 1937ء میں نئے انتخابات عمل میں آنے والے تھے چنانچہ انہی انتخابات کی آمد آمد نے پورے برصغیر میں ایک نئی بیداری اور تحریک کو جنم دیا اور ہر صوبے میں جو تحریکیں ابھر رہی تھیں وہ سب کی سب ایک نہ ایک انداز میں ان آنے والے انتخابات پر نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ چنانچہ پنجاب میں مجلس احرار ہو یا کشمیر کمیٹی اور کشمیر ایجی ٹیشن یا قادیانیوں کے خلاف مجلس احرار کی یلغار' یہ سب آنے والے انتخابات پر ہی نگاہ رکھے ہوئے تھیں۔ دوسری طرف سر فضل حسین جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت سے فارغ ہو کر واپس پنجاب پہنچے تھے' انہوں نے اپنی راہیں محمد علی جناح سے الگ کیں جو اس زمانے میں مسلم لیگ کو ان انتخابات کے لیے نئے سرے سے منظم کر رہے تھے۔ اس طرح آل انڈیا کانگرس نے پنڈت جواہرلال نہرو کو اپنا صدر چن کر اپنی انتخابی مہم کے لیے ہوائی جہاز کے استعمال کی روایت ڈالی اور پنڈت جواہرلال نہرو نے آندھی کی طرح ہندوستان کے تمام علاقوں کے دورے کیے اور ایک دن میں چھتیس جلسوں میں تقریریں کر کے انہوں نے ایک طرح سے عالمی ریکارڈ قائم کیا چنانچہ یہ ان ہی کی شعلہ بیانی تھی جس نے ملک بھر کے نوجوانوں کو خصوصی طور پر متاثر کیا اور انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ کیمونسٹ پارٹی جن کے کئی ایک لیڈر بھی اسی زمانے میں میرٹھ سازش کیس سے رہا ہو کر جیلوں سے باہر آئے تھے انہوں نے اس پوری فضا کا فائدہ اٹھا کر آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کو منظم کیا۔ چنانچہ راج بنس کشن گورنمنٹ کالج کا پہلا طالب علم تھا جس نے اس آل انڈیا

اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام پر کالج یونین کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ راج بنس کشن خاصا شعلہ بیان مقرر تھا اور اس نے کالج میں کھدر پوشی کی ابتدا کی۔ اس کھدر پوش طالب علم نے گورنمنٹ کالج میں نصف صدی کی برطانوی حکومت کی وفاداری کی روایت کے پرخچے اڑا دیئے۔ یہی وہ دن تھے جب پرنسپل گیرٹ جو مسلمہ مورخ تھے ریٹائر ہوئے اور نئے پرنسپل ڈینی کلف مقرر ہوئے۔ ان کو یہ بغاوت کسی صورت میں قبول نہ تھی، چنانچہ انہوں نے راج بنس کشن کو کالج سے Rusticate کر دیا۔ پرنسپل کے اس فیصلے نے کالج میں آگ لگا دی چنانچہ ذوالفقار علی بخاری جو اب کھدر پوش ہو گیا تھا اسے یونین کی سیکریٹری شپ کے لیے کھڑا کیا گیا تو وہ بلامقابلہ منتخب ہو گیا۔ اس طرح یہ گورنمنٹ کالج میں کانگرس اور کمیونسٹ نواز سٹوڈنٹس فیڈریشن کا پہلا حملہ تھا جس میں یہ باغی گروہ نہ صرف کامیاب و کامران ہوا بلکہ اس کی وساطت سے سوشلزم اور کمیونزم کے الفاظ ہماری سیاسی لغت میں متعارف ہوئے۔

سوشلزم اور کمیونزم

اس زمانے میں مجھے بھی سوشلزم اور کمیونزم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس دلچسپی میں خود مجلس احرار کے غریبوں کی حمایت میں نعروں نے بھی اہم کردار ادا کیا اور ساتھ ہی جواہر لال نہرو کی بین الاقوامی سطح پر فاشزم اور ہٹلر کی مخالفت میں آواز نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔

دراصل یہ وہ دن تھے جب جواہر لال نہرو کی ولولہ انگیز تقریروں اور حسین و دلفریب شخصیت نے ہم نوجوان نسل کو بہت متاثر کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ گورنمنٹ کالج کے طلباء کی ایک تعداد متاثر نہ ہوئی ہو لیکن میرے جیسے طالب علم جو اقتصادی بحران اور محرومیوں کا شکار تھے ان کی تقریروں میں اپنے لیے ایک نئے مستقبل کی نوید سن رہے تھے، انہی تقریروں سے ہسپانیہ میں لڑی جانے والی جمہوریت کی لڑائی کا ادراک حاصل ہوا اور دل میں فاشزم کے خلاف نفرت کا بیج پڑا اور اسی بنا پر ہسپانیہ میں اس لڑائی کے بارے میں جب عالمی سطح پر انٹرنیشنل بریگیڈ ترتیب دیا گیا تو اس نے میرے اندر کے شاعر اور ادیب کو پہلی بار بیدار کیا۔

ہسپانیہ کی جمہوری حکومت نے بھی پہلی بار یہ تجربہ کیا کہ یہ فاشزم کے خلاف کسی ایک ملک کے عوام کی لڑائی نہیں بلکہ ہر دیس اور اس میں بسنے والوں کی لڑائی ہے جو جمہوریت اور معاشرتی عدل پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ اس کی آواز کی گونج' اس للکار کا شور ایک عالم نے سنا۔ دیس دیس کے لوگ ہسپانیہ پہنچنے لگے کہ جمہوریت کی اس پہلی لڑائی میں حصہ لیا جاسکے' جب دیس دیس کے ادیبوں اور شاعروں کو ہسپانیہ جاتے دیکھا پھران ادیبوں کو جن کی تخلیقات نے میری فکر کو جلا دی تھی' مرتے اور زخمی ہوتے دل کی آنکھ سے دیکھا تو یہ ایک عجیب تجربہ تھا' جس نے میرے دنوں اور راتوں کو پریشان رکھا۔ ان ادیبوں' شاعروں نے خندقوں میں بیٹھ کر گیت لکھے' شعر کہے' اپنی محبوباؤں کو یاد کیا۔ یہ لڑتے رہے' مسکراتے رہے' تاکہ زندگی کے حسن کو محفوظ رکھ سکیں تاکہ فاشزم کی یلغار کو روک سکیں اور پھر اسی خانہ جنگی میں مصروف زندگی اور موت کی کشمکش میں الجھے ہوئے ہسپانیہ ہی کے ایک شہر میں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانگرس منعقد ہوئی' جس میں دیس دیس سے ادیب اور دانشور آئے اور انہوں نے جمہوری حکومت کی حمایت کی۔ یہی موقع تھا جب بین الاقوامی بریگیڈ قائم ہوا اور ہسپانیہ کے جواں سال شاعر البرٹی نے کہا:

تم دور دراز سے آئے ہو
تمہارا خون ان فاصلوں سے ماورا ہے
یہ خون سرحدوں سے بے نیاز ہے' لیکن پھر بھی وہ گائے جا رہا ہے
تم کسی دن' کسی رات' کسی لمحے
موت سے ہم آغوش ہو جاؤ گے
لیکن کون جانتا ہے کہ یہ موت تمہیں کہاں آئے گی
کس شہر میں کس قصبے میں کس گاؤں میں
کس کھیت میں اور کس سڑک کے کنارے
یہ بھی کون جانے کہ یہ کون سا ملک ہو گا
چھوٹا یا بڑا' وسیع یا مختصر
یہ ملک کسی نقطہ عالم پر ابھرا ہو گا یا نہیں

انسان ایک ہی باوا کی اولاد ہیں
وہ ایک ہی جڑ سے پھوٹا ہے' وہ ایک جیسے خواب دیکھتا ہے
تم بے نام ہو' بے نشان ہو' تمہاری زبان کچھ اور ہے
لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ تم یہاں آئے ہو
ایک ایسے ملک میں جس کو تم نہیں جانتے
تم اس دیوار کے رنگ کو بھی نہیں جانتے
جس مکان کی حفاظت کے لیے تم سینہ سپر ہو
اب جس زمین میں تم دفن ہو
جس مٹی میں تم پنہاں ہو
تم اس مٹی سے محبت کرتے ہو
یہ دھرتی یہ زمیں تمہیں کتنی پیاری تھی

ہسپانیہ کے شاعر ہوں یا کسی باہر کے ملک کے' سب نے بین الاقوامی بریگیڈ کو شعرو ادب کے ذریعے زبردست خراج تحسین پیش کیا جس نے ہماری نسل کو بین الاقوامی مسائل اور فاشزم دشمنی سے خاصی حد تک آگاہ کیا۔

فاشزم دشمنی کے جذبے کی نشوونما اور فاشزم مخالف تحریک کو منظم کرنے کا سہرا اگر ایک طرف بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے سر بندھتا ہے تو دوسری طرف اس جذبے کی آبیاری اگر کسی نے اس برصغیر کی سطح پر کی تو وہ پنڈت جواہر لال نہرو ہی تھے' چنانچہ یہ ان کا اور کانگرس میں کمیونسٹوں کا اثر ورسوخ تھا جس نے کانگرس کو بین الاقوامی مسائل پر خاصا ترقی پسند موقف اپنانے پر مجبور کیا۔

اسی زمانے میں لاہور کی مسلم سیاست میں ایک اور طرح کی صف بندی ہو رہی تھی' یعنی مجلس احرار ایک طرف پنجاب کے نچلے درمیانہ درجہ کے افراد جن میں دیہات کے بے زمین اور چھوٹے رقبوں کے مالک' کسان' شہروں کے چھوٹے دکاندار' ملازمت پیشہ کلرک اور بے روزگار نوجوان شامل تھے' تو دوسری طرف مولویوں اور مساجد کے ائمہ کی ایک بڑی تعداد کی نمائندگی کر رہی تھی اور اسی حوالے سے وہ کشمیر میں اپنے ہزاروں کی تعداد میں والنٹیئر بھیج کر سول نافرمانی کی بے مثال تحریک کی

آبیاری کر کے انگریزی حکومت اور ریاستی حکمرانوں کو للکار کر اپنی مقبولیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہ احمدیوں اور قادیانیوں کے خلاف ختم نبوت کے نعرے کی بنیاد پر مذہبی اور دینی طبقوں کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھی۔ اسی مقبولیت کی بنا پر احراری 1935ء انڈیا ایکٹ کے تحت 1937ء کے اوائل میں ہونے والے انتخابات میں اترنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مسجد شہید گنج کی تحریک نے ان کے سب منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

شہید گنج

شہید گنج کی تحریک بھی ایک دلچسپ تحریک تھی' دراصل مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت جب میاں فضل حسین وزارت پر فائز تھے تو اس زمانے میں سکھوں نے اپنے گورداروں پر قابض مہنتوں کے خلاف زبردست تحریک چلا رکھی تھی جو بالاخر میاں فضل حسین کی کوششوں سے کامیاب ہوئی اور 1924ء میں پنجاب کونسل نے گوردوارہ ایکٹ منظور کیا' جس کے تحت تمام گوردوارے سکھوں کے عام ووٹوں سے چنی جانے والی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دیئے گئے' چنانچہ لاہور میں ریلوے اسٹیشن کے قریب لنڈا بازار میں واقع گوردوارہ شہید گنج کو جب پربندھک کمیٹی کے سپرد کیا گیا اس تاریخی گوردوارہ کے اندر ایک غیر آباد مسجد بھی تھی چنانچہ جب 1936ء میں اس گوردوارہ کی مرمت کا اہتمام کیا گیا تو اس موقع پر یہ مسجد مسمار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مسجد کو جب گرایا جا رہا تھا کہ اچانک مسجد کی دیوار گراتے ہوئے ایک مزدور خود گر کر ہلاک ہو گیا۔ لاہور کے شہریوں کو اس مسجد کی شہادت کا علم ہوا' جس نے مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔

ایسی تحریکوں کی آبیاری مولانا ظفرعلی خان کے خمیر میں تھی' انہوں نے اپنے روزنامہ "زمیندار" کے پہلے صفحے پر "بنت حرا" کی شہادت کے نام پر ایک دھواں دار خبر لگائی اور تحریک چلانے کی اپیل کی لیکن مجلس احرار کا موقف تھا کہ قانون کو ہاتھ میں لینے کے بجائے قانونی چارہ جوئی کی جائے لیکن مولانا ظفرعلی خان نے جو پہلے سے ہی مجلس احرار سے خاصے بدظن تھے' ان کو نیچا دکھانے کا تہیہ کر لیا۔ ادھر مجلس احرار کے

قائدین کا پختہ یقین تھا کہ یہ مسجد مجلس احرار کو پھانسنے کے لیے مسمار کی گئی ہے کہ اگر مجلس احرار اس تحریک میں الجھی رہی تو جیل جاتی ہے اور انتخابات کے لیے میدان سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے لیے خالی ہو جاتا ہے اور اگر مجلس احرار حصہ نہیں لیتی تو مسلمانوں میں بدنام ہو کر اپنی مقبولیت کھو بیٹھتی ہے۔ واقعات نے مجلس احرار کے قائدین کا موقف بہت حد تک درست ثابت کیا کیونکہ مولانا ظفرعلی خان نے آناً فاناً ایک نئی جماعت مجلس اتحاد ملت کے نام سے قائم کر ڈالی اور رضاکار بھرتی کئے جانے کی مہم کا آغاز کیا گیا' جن کا نام نیلی پوش رکھا گیا کیونکہ احراری رضاکاروں کی وردی کا رنگ سرخ ہوتا تھا' اس لیے اس زمانے میں ان رضاکاروں کے تصادم روزمرہ کا معمول ہو گیا۔

مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد سکھوں سے اس مسئلے کے لیے ملا' اس وفد میں مولانا محمد داؤد غزنوی جنرل سیکریٹری مجلس احرار ہند' میاں امیرالدین میئر لاہور' میاں عبدالعزیز اور مولانا ظفرعلی خاں نے "اتحاد ملت" کی طرف سے قیادت کی۔ سکھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ گردواروں کی طرح مسجد بھی ہمارے لیے مقدس ہے اس لیے ہم کوئی پرامن حل تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن لاہور میں "نیلی پوش" ایسی تنظیم کی موجودگی میں امن و امان کی بات چیت بے معنی ہے۔ اس کے باوجود فی الحال ہم مسجد تعمیر کر دیتے ہیں لیکن یہ اپنی پہلی حالت میں ہماری ملکیت رہے گی۔

مسلمانوں کے وفد نے اس سے اتفاق رائے کیا لیکن مولانا ظفرعلی خان بضد تھے کہ فوری طور پر مسجد مسلمانوں کے حوالے کی جائے۔ سکھوں کی غیر موجودگی میں جب مولانا ظفرعلی خان سے پوچھا گیا کہ ایسا کیونکر ممکن ہے' جبکہ قانون کا فیصلہ انہیں تحفظ دے رہا ہے' ہمیں قانون کے فیصلے کے خلاف لڑنا نہیں چاہیے؟

مولانا ظفرعلی خان نے بڑے رازدارانہ لہجے میں بتایا' ایک بہت ہی ذمہ دار سرکاری آفیسر نے مجھے کہا ہے کہ آپ تحریک جاری رکھیں ہم مسجد مسلمانوں کو دے دیں گے۔ مولانا ظفرعلی خان کا اشارہ پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کی طرف تھا' جس نے یہ بات مسلمانوں کے ایک خاص وفد سے ملاقات کے دوران کہی تھی۔ سکھوں سے ناکام مذاکرے کے بعد مولانا ظفرعلی نے موچی دروازہ کے باغ میں جلسہ عام میں

اعلان کرتے ہوئے کہا: "اتحاد ملت نے اس جلسہ میں مجلس احرار کے رہنماؤں کو بھی دعوت دی تھی لیکن انہوں نے اس جلسہ میں شرکت نہ کر کے ثابت کر دیا کہ انہیں مسلمانوں اور اسلام سے کیسا لگاؤ ہے۔" اس طرح مولانا ظفرعلی نے اپنی اس مختصر تقریر میں مجلس احرار کی تحریک خواہ تحریک ختم نبوت ہو یا پھر تحریک کشمیر سب کو مسجد شہید گنج کے ملبہ میں دفن کرنے کی سیاسی چال چلی' جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ سرخ پوش احراری اور نیلی پوش اتحاد ملی کے رضاکار ایک دوسرے کے جلسوں میں اودھم مچاتے اور جلسہ خراب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بعد میں جس طرح مولانا ظفرعلی خان نے روزنامہ "زمیندار" کو تحریک شہید گنج کے لیے وقف کر دیا اسی طرح مجلس احرار نے بھی اس کے جواب میں ایک روزنامہ جاری کیا۔

تحریک مسجد شہید گنج نے روز بروز کشیدگی میں اضافہ کیا۔ اس تحریک کے اثرات جب دوسرے شہروں میں پہنچے تو وہاں بھی جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا جانے لگا۔ اس طرح کئی جان نثار جذبہ ایمان سے سرشار لاہور پہنچنا شروع ہوئے' یہ دیکھتے ہوئے سکھوں نے بھی اپنے مسلمہ مذہبی جتھوں کو بلانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہوئے حکومت نے لاہور میں دفعہ 144 نافذ کر دی اور نہ صرف مسجد بلکہ گردواروں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ تحفظ امن عامہ کے تحت حکومت نے کئی لیڈروں اور کارکنوں کو نظربند اور گرفتار کر لیا۔ یہ دیکھتے ہوئے نوجوانوں نے اس تحریک کو خود سنبھال لیا۔ اس طرح دو روز چوک دہلی دروازہ میں کئی مسلمان نوجوان گولیوں کا نشانہ بنتے رہے۔ اس خونی سانحہ کے بعد مسجد شہید گنج کے روح رواں مولانا ظفرعلی خان نے جو آبائی گاؤں میں نظربند تھے' تحریک کو پرامن رکھنے اور اپنی جانوں کی حفاظت کی تلقین کی۔ اس طرح یہ تحریک بظاہر ماند پڑ گئی لیکن سیاست دانوں کے خلاف غم اور غصہ برقرار رہا کہ ستمبر 1936ء میں تحریک مسجد شہید گنج کے ایک رکن چودھری مولابخش نے اعلان کیا: "جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے مسجد کی واگزاری کے لیے عملی اقدام نہیں کیا تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے بل بوتے پر میدان میں نکلیں اور فیصلہ کریں کہ ہمیں حصول مسجد کے لیے کیا کرنا ہے' ہر روز یہ کہنا کہ مسجد مل جائے گی اور اس کے لیے کوئی عملی قدم نہ اٹھانا عوام کو دھوکہ دینا ہے۔ اس لیے اتوار تک میں شاہی مسجد میں مقیم

رہوں گا اس عرصہ میں عوام سے مشورہ کیا جائے گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" یہ تو تھے عوام کے جذبات، جبکہ سیاست دانوں کو سب معلوم تھا کہ اب انہیں کیا کرنا تھا۔ اس لیے وہ ہمہ تن 1935ء کے ایکٹ کے تحت ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کی مہم میں مصروف ہو گئے۔

1935ء کے ایکٹ کی آمد سے پہلے ہی مسلمانوں نے اپنی اپنی صفوں کی از سر نو تنظیم کرنا شروع کر دی۔ 1934ء میں محمد علی جناح نے انگلستان سے واپس آکر مسلم لیگ کی از سر نو شیرازہ بندی کی۔ اس وقت کانگرس ہندوستان کی سب سے بڑی منظم سیاسی جماعت تھی۔ 1935ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد تمام سیاسی پارٹیوں یا مذہبی جماعتوں نے پہلی بار اپنے اپنے منشور جاری کیے۔ لیکن انتخابات میں کامیابی کے لیے مضبوط تنظیم اور ایسے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کا رابطہ عوام کے ساتھ گہرا ہو، مسلم لیگ ابھی ان دونوں باتوں سے تہی دامن تھی۔ اس کے مقابل مسلمان عوام کو حرکت میں لانے والی سب سے متحرک ایک ہی جماعت تھی، جس کا نام مجلس احرار تھا لیکن مسجد شہید گنج تحریک نے مجلس احرار اور اتحاد ملت کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ مسلم لیگ نے مجلس احرار، اتحاد ملت اور دوسری باا ثر و رسوخ سماجی، مذہبی اور سیاسی شخصیتوں سے اتحاد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی اگر یہ اتحاد برقرار رہتا تو پھر شائد مارچ 1937ء کے انتخابات کے سلسلے میں پنجاب سے یونینسٹ پارٹی کو اس قدر کامیابی حاصل نہ ہوتی۔

انتخابات میں مسلم لیگ نے صرف سات مسلم حلقوں سے اپنے امیدوار کھڑے کیے جن میں صرف دو ہی امیدوار کامیاب ہوئے۔ ایک ملک برکت علی اور دوسرے راجہ غضنفر علی خان۔ کامیاب ہونے کے بعد راجہ غضنفر علی خان فوراً یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح مسلم لیگ کے پاس صرف ایک ہی مسلم نشست پنجاب میں باقی بچی، جبکہ مجلس احرار اور اتحاد ملت اور کانگرس کے پاس دو دو مسلم نشستیں تھیں۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ باقی تمام نشستوں پر یونینسٹ پارٹی قابض تھی، یونینسٹ پارٹی کوئی عوامی پارٹی نہیں تھی بلکہ وہ تو جاگیرداروں اور زمینداروں کا ایک ٹولہ تھا جو ان پڑھ دیہی زندگی کا ان داتا اور شہری

یا تعلیم یافتہ طبقہ کا نجات دہندہ کہلاتا تھا اور یہ طبقہ اس پارٹی سے بڑا متاثر تھا۔
انتخابات کے بعد پنجاب میں روز بروز مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھنے لگی' اس کی وجہ بنگال اور یوپی کے نواب زادے' تعلقہ دار اور جاگیردار تھے' جو ہندوؤں کے مقابل مسلمانوں کے نجات دہندہ بننا چاہتے تھے۔ پنجاب میں لاہور سے خالد لطیف گابا نے جو احرار کی ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا مرکزی اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا' چنانچہ مرکزی اسمبلی کے لیے لاہور سے کانگرس نے میاں عبدالعزیز کو چنا جو مزنگ کی آرائیں برادری سے تھا۔ اس کے مقابل یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ نے اتحاد ملت کے بانی مولانا ظفرعلی خان کی حمایت کرنا شروع کر دی۔ یونینسٹ پارٹی چونکہ پنجاب میں برسراقتدار تھی' انہوں نے میاں عبدالعزیز پر دباؤ ڈالا۔ میاں صاحب باعزت طریقہ سے دستبردار ہونے پر رضامند ہو گئے اور اپنا نام واپس لے لیا۔ اس طرح مولانا ظفرعلی خان لاہور سے مرکزی اسمبلی کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔
مارچ 1937ء کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج میں گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں بنیں' اس وقت کانگرس ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی قومی جماعت بن کر سامنے آئی جو ہندو مسلم اتحاد اور روشن خیالی کی علامت تھی۔
کانگرس نے جب اپنے اکثریتی صوبوں میں وزارتیں بنائیں تو ان میں وہی مسلمان شامل کئے جو کانگرس کی ٹکٹ سے منتخب ہوئے تھے۔ کانگرس نے مسلم لیگ کے نمائندوں کو اپنی وزارتوں میں شامل نہیں کیا' جس کے خلاف مسلم لیگ نے احتجاجی رویہ اختیار کر کے مسلمانوں کو اپنے پرچم تلے جمع کرنا شروع کیا۔ اس دور میں تعلیمی اداروں میں طلبہ بھی سیاسی جماعتوں کی طرف متوجہ ہوئے' دوسرا تعلیمی اداروں میں یونین سازی نے اسے بڑی ہوا دی۔

اسلامیہ کالج

سیاست میں ہمیں اس قدر پرجوش دیکھ کر پرنسپل نے انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحان کے لیے کالج سے ہمارا داخلہ نہ بھیجنے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس پر ہم نے بڑا احتجاج کیا

لیکن پرنسپل نے ہماری ایک نہ سنی' آخر ہم نے کالج ہی کی طرف سے سپلیمنٹری امتحان میں داخلہ بھیجنے کی درخواست دے دی جو منظور کرلی گئی۔

سپلیمنٹری امتحان میں' میں کامیاب تو ہو گیا' لیکن مجھے گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ائیر کی کلاس میں داخلہ نہ ملا تو میں نے فوری طور پر ایف سی کالج کی طرف رجوع کیا اور تھرڈ ائیر میں داخلہ لے لیا۔ یہ کالج اندرون شہر خاص طور پر رنگ محل ایسے علاقے سے بہت دور پڑتا تھا اس لیے وہاں صرف چند ماہ گزارنے کے بعد اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخلہ لے لیا کیونکہ یہ کالج ہمارے گھر سے بہت قریب پڑتا تھا' کوچہ چابکسواراں کے موچی دروازے سے چند منٹوں کا پیدل سفر تھا۔ اسلامیہ کالج میں میری سب سے پہلی شناخت میری "کھدر پوشی" تھی' یہ کوئی معمولی کھدر نہ تھا بلکہ اعلیٰ معیار کا نفیس کھدر جس کے پہننے والے کی نفاست ہی نہیں امارت بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس لباس میں جس نے مجھے دیکھا وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گورنمنٹ کالج کی نسبت اسلامیہ کالج میں سیاسی وابستگیاں بڑی گہری اور مضبوط تھیں۔

انتخابات کے بعد مسلم لیگ نے کانگرس کے خلاف مسلم لیگ کی تنظیم سازی کی مہم شروع کی' اکتوبر 1937ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا' بنگال کے وزیراعظم مولوی فضل الحق' آسام کے وزیراعظم سر سعد اللہ اور پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات اپنی اپنی پارٹیوں کے ارکان کے ساتھ مسلم لیگ سے آملے۔

اس اجلاس کے بعد اگلے سال 1938ء میں صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں جب مسلم لیگ کا 26واں سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں پنجاب کے وفود میں موچی دروازے کے فیروزالدین احمد بھی شامل تھے جو لاہور میونسپل کمیٹی کے کونسلر بھی تھے اور بڑے سرگرم سیاسی و سماجی کارکن تصور ہوتے تھے۔ وہ فیروز کاہدے والا کے نام سے پکارے جاتے تھے' انہوں نے پٹنہ کے اس اجلاس میں محمد علی جناح کے ساتھ "قائداعظم" کا اضافہ کر کے بڑے جذباتی انداز سے نعرہ لگایا "قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد۔" اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ خطاب مقبول عام ہوا' حتیٰ کہ اگست 1947ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے اپنے پہلے اجلاس میں محمد علی جناح کے

"قائداعظم" کے خطاب کو سرکاری حیثیت دے دی۔
اسی دور میں مسلم طلباء بھی مسلم لیگ کی طرف بڑے جوش اور جذبہ سے متوجہ ہوئے اور انہوں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی جس کے دو اجلاسوں' لاہور اور علی گڑھ میں قائداعظم نے خطاب کیا۔ اس وقت جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے تو میں جواہر لال نہرو کی روشن خیالی اور سوشلسٹ نظریات کا مداح تھا۔ کھدر پوشی بھی اسی حوالے سے اختیار کی۔ اسلامیہ کالج میں عبداللہ بٹ سے دوستی کا حوالہ بھی یہی کھدر پوشی تھا۔ وہ پنجاب مسلم فیڈریشن سے الگ ہو کر آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھ چکے تھے اور اس فیڈریشن میں ملک معراج خالد' اکبر ملک' مصطفیٰ قیصر' عمادالدین اور مرزا صفدر بیگ شامل ہو کر سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر چکے تھے۔ عبداللہ بٹ اسلامیہ کالج کے میگزین "کریسنٹ" کے اردو حصہ کے اور عمادالدین انگریزی حصہ کے مدیر رہ چکے تھے۔
میں نے عبداللہ بٹ اور ان کے ہم جماعت عبدالسلام خورشید' جو عبدالمجید سالک ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب" کے بیٹے تھے' کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی تاکہ ان سے اپنی دوستی مضبوط کی جائے۔ اس لیے میں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو گورنمنٹ کالج میں امیر احمد صدیقی اور کالی چرن نے کیا' یعنی میں نے گھر پر ان دونوں کو کھانے کے ساتھ شراب بھی پینے کو کہا' اس واقعے کے بعد عبداللہ بٹ جس قدر میرے نزدیک آئے' عبدالسلام خورشید اتنا ہی دور ہو گئے۔
اس روز کے بعد عبداللہ بٹ اور میں ایسے ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہوئے کہ ہماری دوستی کی مثالیں دی جانے لگیں۔ عبداللہ بٹ اور میں' لکشمی چوک میں سرور ہوٹل کے تہ خانے میں جہاں شراب کے ساتھ بلیرڈ کا کھیل کھیلا جاتا تھا' باقاعدہ نشستیں کرتے۔ آہستہ آہستہ میری کھدر پوشی کے ساتھ ساتھ شراب نوشی اور تاش کے کھیل "برج" اور "رمی" کے حوالے سے بڑا چرچا ہونے لگا۔
اسلامیہ کالج میں میری شہرت ہونہار یا ذہین طالب کے طور پر نہیں بلکہ تاش کے بہترین کھلاڑی کی حیثیت سے تھی خاص کر "برج" کا کھیل جو چھوٹی موٹی شرط کے بغیر نہیں کھیلا جاتا تھا' اکثر بڑی آسانی سے جیت جاتا تھا۔

ایک بار ہوسٹل کے چند امیرزادوں نے مجھے "برج" کھیلنے کی دعوت اور اپنے گرد "برج" کے بڑے اچھے کھلاڑی جمع کر لیے' اس کے باوجود میں نے بڑی آسانی سے ان سے کئی بازیاں جیتیں' اس طرح سارے کالج میں میری دھاک بیٹھ گئی کہ گورنمنٹ کالج سے آنے والا نوا منڈا "نوخیز لڑکا" تاش کے کھیل میں ناقابل تسخیر ہے۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل ایم اے غنی تھے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کے بڑے بیٹے ڈاکٹر آفتاب احمد ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ فارسی کے استاد ڈاکٹر محمد باقر تھے جبکہ سیاسیات اور معاشیات ہم نے ڈاکٹر محمد اختر سے پڑھی۔

عرب ہوٹل

اسلامیہ کالج کا مرکزی دروازہ جو ریلوے روڈ کی طرف کھلتا تھا' اس کے سامنے عرب ہوٹل میں نشست و برخاست کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ہوٹل میں طالب علموں سے زیادہ صحافی' دانشور' اہل علم و ادب اور سیاسی کارکنوں کا بکثرت آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا تھا۔

پہلی بار میں نے یہاں پر باری علیگ' مولانا چراغ حسن حسرت' ملک غلام نبی' فیروز الدین منصور اور کرم سنگھ مان کو دیکھا۔ باری علیگ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ تمام معاشرتی علوم سے وہ کماحقہ واقف تھے اور جب بھی علمی بحث چھڑتی تو اس وقت معلوم ہوتا کہ یہ عام طور پر خاموش رہنے والا اپنے اندر کتنی معلومات رکھتا ہے۔ باری علیگ نے روسی ادب کو تراجم کے ذریعے اردو پڑھنے والوں تک پہنچانے کی شروعات کی' اس کام کو پھر سعادت حسن منٹو اور فیروز الدین منصور نے بڑے احسن طریقے سے آگے بڑھایا۔

عرب ہوٹل کی اہمیت اس طرح سے بھی تھی کہ مسلمانوں کے اکثر و بیشتر اخبارات کے دفتر سرکلر روڈ اور ریلوے روڈ پر تھے جیسا کہ روزنامہ "زمیندار" کا دفتر دہلی دروازہ کے باہر تھا اور اس کے ساتھ ہی روزنامہ "احسان" کا دفتر تھا جب کہ ریلوے روڈ پر امرت دھارا بلڈنگ کے سامنے عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کا روزنامہ "انقلاب" شائع ہوتا تھا۔ عرب ہوٹل کے قریب رہائش رکھنے والوں میں عبدالمجید

بھٹی تھے جو عرب ہوٹل کی عمارت کے زیر سایہ رہتے تھے جبکہ باری علیگ کا گھر اس ہوٹل کے ساتھ والی گلی میں تھا۔

چراغ حسن حسرت اور باری علیگ یہاں اکثر نشست کرتے' ان کے دوست احباب انہیں ملنے کے لیے یہاں عرب ہوٹل یا نگینہ بیکری آتے جو ایک مختصر چائے خانہ تھا اور وہاں مختلف الخیال لوگوں کی محفل سرشام چائے کی پیالیوں کے گرد بجتی تھی۔

مولانا چراغ حسن حسرت اور باری علیگ کو کسی نے میری بلا کی شراب نوشی کے متعلق بتایا تو انہیں یقین نہ آیا' چنانچہ ایک دن مولانا چراغ حسن حسرت نے مجھ سے کہا: "مولانا یہ کیا سن رہے ہیں؟ اس رعنا سالی میں ہی---"

میں نے ان کے ساتھ بیٹھے باری علیگ کو اپنی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا تو بڑے فخریہ انداز سے اعتراف کرتے ہوئے کہا: "ہاں مولانا ہم یہ شغل بھی کر لیتے ہیں۔" یہ سن کر باری علیگ نے کہا' "بھئی ہمارے ساتھ بھی کبھی نشست رکھو۔"

"کبھی کیوں؟ ابھی---" میں نے برجستہ جواب دیا تو مولانا چراغ حسن حسرت نے کہا: "یہ بات ہے تو کل میجسٹک ہوٹل انار کلی میں آپ آجائیں' ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

دوسرے روز ہم تینوں نے مل کر میجسٹک ہوٹل میں بلا کی شراب نوشی کی۔ میں نے ان کے اندازے سے زیادہ پی لی تھی' اس کے باوجود میں چاق و چوبند تھا۔ شراب نوشی کے بعد عرب ہوٹل میں کھانے کا پروگرام بنایا گیا' اس لیے مولانا چراغ حسن حسرت نے مجھ سے کہا: "مولانا تم اپنی سائیکل یہیں چھوڑو اور ہمارے ساتھ تانگے میں بیٹھ جاؤ' تمہیں عرب ہوٹل لے چلتے ہیں۔"

اس پر میں نے جواب دیا: "آپ تانگہ میں چلیں میں اپنی سائیکل پر آتا ہوں۔" باری صاحب نے کہا: "دیکھو تم نے بہت پی رکھی ہے لڑھک جاؤ گے' اس حالت میں سائیکل پر جانا تمہارے لیے خطرناک ہے۔" میں نے ضد کر کے انہیں تانگہ پر سوار کیا اور خود سائیکل پر سوار ہو کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ تانگہ بڑا سست رفتار تھا' اس لیے میں عرب ہوٹل پہنچ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ دونوں عرب ہوٹل پہنچے اور مجھے وہاں کھڑا دیکھا تو ان کی آنکھوں میں حیرانی مسکرانے لگی۔

عبداللہ بٹ کے کہنے پر مجھے کالج میگزین کریسنٹ کے اُردو حصہ کا مدیر اور عبدالمجید بھٹی کے چھوٹے بھائی مشتاق بھٹی کو نائب مدیر مقرر کیا گیا۔ ابتدا میں ادب کے حوالے سے میں نے شاعر بننے کا فیصلہ کیا اور اپنے لیے نسیم تخلص پسند کیا۔ عبداللہ نسیم کے نام سے تھوڑی بہت شاعری کی۔ روزنامہ "احسان" کے مدیر نے جب اخبار کے لیے لکھنے کو کہا تو میں نے عبداللہ بن عمر کے نام سے سیاسیات اور معاشیات پر مضمون نگاری کی منصوبہ بندی شروع کی۔ اسی دوران آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے انتخاب ہوئے تو لاہور سے گورنمنٹ کالج کے فورتھ ائیر کے طالب علم امان اللہ خان نیازی صدر اور مجھے جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس طرح میرے پاس ادب اور سیاسیات کے دو عہدے بیک وقت اکٹھے ہو گئے۔ اس طرح مجھے ادب اور سیاست میں عملی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لینا پڑا، جس سے مجھے تمام سیاسی اور مذہبی تحریکوں کو جاننے کا موقع ملا۔ ان تحریکوں میں مسجد شہید گنج کی تحریک کی بازگشت اب تک سنائی دے رہی ہے۔

"کعبہ کی بیٹی" کی حفاظت کے نعرے کی بنیاد پر پروان چڑھنے والی یہ تحریک ایک فریب ایک دھوکہ ثابت ہوئی کیونکہ اس تحریک کا اصل مقصد نئے انتخابات میں پنجاب کی سب سے بڑی منظم تنظیم مجلس احرار اسلام کو راستے سے ہٹا کر اپنی راہ ہموار کرنا تھا۔

نوجوان شعلہ بیان خطیب اور جیالا کارکن شورش کاشمیری مسجد شہید گنج تحریک کا ایک نمایاں کردار تھا۔ اس تحریک کو منظم کرنے کے لیے بیرون موچی دروازہ باغ میں اتحاد ملت نے جلسہ عام منعقد کیا تو اس جلسہ کا پہلا نوجوان مقرر شورش کاشمیری تھا۔ مجلس احرار نے شورش کاشمیری کی ذہنی پرورش کی جس سے سامراج دشمنی اس کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، عطاءاللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق اس کے محبوب تھے، جن کا وہ اسلوب اپنا رہا تھا۔ مجلس احرار اسلام نے مسجد شہید گنج تحریک میں اس طرح حصہ نہیں لیا تھا، جس طرح "اتحاد ملت" شور مچا رہی تھی۔ 1937ء کے ضمنی انتخابات میں مولانا ظفر علی خان اتحاد ملت کے ٹکٹ سے کامیاب ہونے کے بعد اتحاد ملت کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

شورش کاشمیری اتحاد ملت کے سیکرٹری تھے۔ لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے وزیر اعلیٰ سکندر حیات جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو مجلس احرار نے اعلان کیا کہ اب مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی مل کر مسجد شہید گنج کی واگذاری کا ذمہ قبول کرتے ہوئے سول نافرمانی کا اعلان کریں۔

آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

مجلس احرار کے کہنے پر شورش کاشمیری بحیثیت اتحاد ملت کے سیکرٹری دوبارہ مجلس احرار کے متحدہ محاذ میں شامل ہو گیا۔ آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے شورش کاشمیری کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ بحیثیت جنرل سیکرٹری مجھے شورش کاشمیری کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ یہ سپاسنامہ میری اور شورش کی دوستی کی بنیاد بنا۔

اس وقت پنجاب میں طلباء کی تین تحریکیں فعال تھیں: آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، اور پنجاب سٹوڈنٹ یونین!

آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا مسلک سامراج دشمنی تھا جو مسلمانوں اور غیر مسلم کی ہندوستان گیر تحریکوں کی ہمنوا تھی، جبکہ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن، مسلم لیگ اور پنجاب سٹوڈنٹس یونین غیر فرقہ وارانہ کمیونسٹوں کے زیر اثر طلبہ کی تنظیم تھی۔

پنجاب کے نچلے درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے طلباء بالعموم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ مسلم لیگ نوابوں اور امرا کی جماعت ہے اور اس پر ٹوڈی چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن 1937ء میں جب علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے فعال طریقے سے پنجاب مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو مسلم طلباء کا نچلا درمیانہ طبقہ بھی خاصا متحرک دکھائی دینے لگا۔ چونکہ آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا بنیادی مقصد سامراج دشمنی تھا اس لیے وہ مجلس احرار، کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی کی ہمنوا بن کر ابھری۔ یہ تمام سیاسی پارٹیاں یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کو سامراج دوست تصور کرتی تھیں۔ سامراج دشمنی کی بنا پر مجھے آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ لیکن اس انتخاب میں

عبداللہ بٹ کا سب سے زیادہ عمل دخل تھا جس سے دوستی کا آغاز اسلامیہ کالج سے ہوا۔ وہ مجھ سے ایک جماعت سینئر تھا۔ اسی نے مجھے اسلامیہ کالج کے میگزین "کریسنٹ" میں اردو کا مدیر مقرر کروایا تھا۔

سامراج دشمنی کی بنا پر ہی آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن پنجاب سٹوڈنٹ یونین کے ساتھ تھی تاکہ سامراج دشمنی کی تحریک کو طاقت ور کیا جائے۔ شورش کاشمیری جو کہ مسجد شہید گنج کی تحریک کے دوران گرفتار ہوا تھا' جب جیل سے رہا ہوا تو مجلس احرار نے دہلی دروازہ کے باہر باغ میں اس کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا جہاں مجھے آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے بحیثیت جنرل سیکرٹری سپاسنامہ پیش کرنا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کسی بھی پبلک جلسے یا تقریب میں کبھی کوئی تقریر نہ کی تھی اور نہ ہی کبھی کالج کے مباحثوں میں حصہ لیا تھا۔ اس لیے میں پریشان اور خوف زدہ تھا۔ لیکن عبداللہ بٹ نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے اسٹیج پر لے آیا۔ میں نے کپکپاتے ہاتھوں اور لرزتی ٹانگوں اور ہکلاتی زبان سے شورش کاشمیری کی خدمت میں سپاسنامہ پڑھا۔

عبداللہ بٹ

شورش کاشمیری جو ایک شعلہ بیان مقرر اور جیالا کارکن تھا' اسے میرا خلوص' میری ادا اس قدر پسند آئی کہ وہ میرا دوست بن گیا۔ ہمارے درمیان دنوں میں دوستی اس قدر بڑھ گئی کہ عبداللہ بٹ کو تشویش ہونے لگی۔ جب میں نے سامراج دشمنی اور سوشلزم کی حمایت میں "سرمایہ داری" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تو اس کے دیباچے کے لیے شورش سے رجوع کیا۔ اس نے ایک ایسا دیباچہ تحریر کیا جس میں اس کی نثر شاعری کی طرح دلفریب اور دلنشیں تھی۔ اس نے لکھا:"عبداللہ ملک کی یہ تصنیف حسن سادہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس حسن سادہ کی بڑی تمنا مزدور کو اونچا کرنا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے ان ڈھوروں کو جنہیں "مزدور" کہا جاتا ہے' جہاد و فکر کی اس راہ پر لگانا ہے جہاں انقلاب بڑی مدت سے پیشوائی کے لیے بے تاب کھڑا ہے اور آزادی کی محبوبہ اپنے اس بھولے ہوئے عاشق کی راہ تک رہی ہے۔

دُرِ مضموں کوئی یوں گوندھ لے اے شاد مشکل ہے
سلیقہ انتہا کا چاہیے موتی پرونے میں

میرا روز بروز شورش کاشمیری کی طرف کھنچے چلے جانا عبداللہ بٹ کے لیے اس سے دور ہونے کا عندیہ تھا۔ میں جیسے جیسے اسے یقین دلاتا کہ وہ مجھے ابھی تک ماضی کی طرح عزیز ہے' وہ ویسے ویسے ہی مجھ سے بدظن ہوتا جا رہا تھا۔ 1939ء کے وسط میں اس نے کالج میگزین کے پیڈ پر مجھے کئی ایک خط لکھے جن سے اس کی ذہنی کیفیات کا پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

13۔ برانڈرتھ روڈ لاہور
21 جولائی 1939

میرے پیارے عبداللہ

"میں خط لکھنے کا وعدہ کر چکا ہوں مگر حیران ہوں کہ کیا لکھوں' کیونکر لکھوں اور کس طرح لکھوں' شام سے اس وقت تک جبکہ 12 بجے ہیں کوئی چیز ذہن میں نہیں آتی جو قابل تحریر ہو۔ نیند کا غلبہ اور خیالات کا فقدان' تمہیں خط نہ لکھنے کے لیے کافی سے زیادہ دلیل ہو سکتی ہے۔ مگر ایفائے وعدہ کے خیال نے اپنی آہنی اور غیر محسوس زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ میں تمہاری طرح نہیں ہوں کہ وعدہ شکنی پر اتر آؤں۔ جی چاہتا ہے کہ بہت کچھ لکھوں' اپنی محبت و الفت کی داستان' تمہاری دلچسپ باتوں کا تذکرہ' تمہارے خیالات پر بحث و تنقید' ایام رفتہ اور واقعات گزشتہ کی یاد تازہ کر کے پڑھنے والے کے لیے گدگدیوں کا سامان پیدا کیا جائے۔ اگر میں شاعر ہوتا تو تمہاری شان میں ہی قصیدہ کہہ کر تمہارے نام کو روشن کرتا۔ تمہیں ایران کا سبزہ خط اور ہندوستان کا بت سیمیں بدن کہہ کر مخاطب کرتا۔ تمہاری کمر معدوم اور ذہن غائب ہاتھ میں خنجر اور شمشیر دے کر آنکھوں میں بریلی کا سرمہ مس لگا کر شیشہ میں شراب طہور کا جلوہ دکھاتا اور پھر اپنے دل سے یوں خطاب کرتا ؎

لیے تو چلتے ہیں حضرت دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

اور جب تم بے اعتنائی اور بے رخی سے پیش آتے تو فوراً یہ شعر گنگناتے ہوئے

تیری بزم سے اٹھ کھڑا ہوتا:

ہم ایک رستہ گلی کا اس کی دکھا کے دل کو ہوئے پشیماں
یہ حضرت خضر کو جتا دو کسی کی تم رہبری نہ کرنا

مگر مجھے اس وقت یہاں مندرجہ بالا چیزوں میں سے کوئی بھی اور کسی کے متعلق کچھ نہیں کہنا بلکہ اس امر اور حقیقت کا اظہار کر کے معافی مانگنا ہے کہ میں اس وقت اگر کوئی چیز اچھی نہ لکھ سکوں تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ خط لکھنے میں سب سے بڑی دقت القاب کی ہوتی ہے کہ مکتوب الیہ کو کن الفاظ کے ساتھ یاد کیا جائے۔ میں اس مسئلے پر بھی دیر تک غور کرتا رہا اور اب اس نتیجے پر پہنچا کہ بہت مختصر مگر بامعنی القاب لکھنا چاہیے جو ایک طرف تو ان جذبات اور خیالات کا ترجمان ہو جو میرے دل میں جاگزیں ہیں اور دوسری طرف مکتوب الیہ کے دل پر بھی شاق نہ گزرے۔ دوسری حماقت یا بیوقوفی بلکہ بدتمیزی جس کے لیے مجھے تم سے دست بستہ معافی مانگنا ہے وہ یہ ہے کہ میں ایک پرائیویٹ خط اس قسم کے کاغذات پر رقم کر رہا ہوں جن کے استعمال کا کسی صورت میں مجاز نہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے گزارش کر چکا ہوں کہ میں اس وقت تمہیں خط لکھنے کے لیے نہیں بلکہ محض خط نہ لکھنے کی اطلاع کے لیے یہ سطور سپرد قلم کر رہا ہوں اس لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ موجودہ سوسائٹی میں خصوصاً پڑھے لکھے نوجوانوں میں یہ چیز شرافت اور تہذیب سے گری ہوئی تصور ہوتی ہے۔ اگرچہ میں کامل طور پر اس نظریہ سے متفق نہیں ہوں لیکن پھر بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک ایسی حرکت کا ارتکاب کر رہا ہوں جو مجھے نہ کرنی چاہیے۔ واقعی اگرچہ میرے پاس اس کے استعمال کے جواز میں دلائل کا کافی ذخیرہ موجود ہے پھر بھی اس بدتمیزی پر نہایت ہی ندامت سے معافی چاہتا ہوں۔

میرا یہ خط یقیناً پھیکا ہوگا۔ اس میں نمکینی اور لذت کی چاشنی کا ڈھونڈنا ایک لاحاصل کوشش ہوگی کیونکہ میں نے سرشام اپنے ایک دوست کی طرف سے اس قسم کا ایک خط دیکھا ہے جسے پڑھ کر مجھے سخت رنج و افسوس ہوا کہ وہ لوگ جنہیں میں آج تک اپنا سمجھا کرتا تھا، وہی میرے دشمن ہیں اور جن کی دوستی پر میں ناز کیا کرتا تھا وہ بیگانے ہو چکے ہیں۔ یہاں تمہارے نظریے کی تائید نہیں کر سکتا کہ "خلوص کمزور

آدمیوں کی میراث ہے۔" مجھے بھی اس قسم کے کئی مقولے یاد ہیں۔
میں بحث سے ڈرتا نہیں بلکہ اجتناب کرتا ہوں اور پہلو بچا بچا کر نکل رہا ہوں ورنہ تمہارے قول کے مطابق "بحث میری فطرت ثانیہ ہے۔"
دوستی کے جھگڑوں میں پڑ کر زندگی کو تلخ کرنا اگرچہ دانشمندی نہیں لیکن پھر بھی افسوس ضرور ہوتا ہے کہ انسانی زندگی جب کہ ایک عارضی چیز ہے پھر اس پر اس درجہ ناز و فراز چہ معنی دارد!
ساڑھے بارہ بجے رات تمہیں تمہارے وعدہ کی یاد دلانا چنداں ضروری نہیں سمجھتا۔

زیادہ آداب' عبداللہ بٹ!

اگست میں امرتسر میں ضمنی انتخابات کے سلسلے میں مجھے اور شورش کاشمیری کو اکٹھے کام کرنے کا موقع ملا جس سے ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ امرتسر میں میرے سسرال بھی رہتے تھے۔ اس وجہ سے شورش مجھ سے کچھ زیادہ بے تکلف ہو گیا۔ امرتسر میں یہ انتخابی معرکہ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لڑنے والے شیخ صادق حسین اور مجلس احرار کے رہنما چودھری افضل حق کے درمیان ہوا۔
1937ء کے عام انتخابات میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی تھی مگر ڈاکٹر سیف الدین کچلو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے تھے' اس لیے یونینسٹ شیخ صادق جو ان انتخابات میں شکست کھا گئے تھے انہوں نے عدالت میں عذرداری دائر کر دی جو منظور ہو گئی' اس طرح امرتسر کی اس شہری نشست پر دوبارہ انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخابی مہم کے لیے شورش کاشمیری اور میں نے دن رات امرتسر کے کوچہ و بازار میں بہت کام کیا۔ شورش جلسوں سے خطاب کرتا میں موثر انداز میں جلسے کا اہتمام کرتا۔ ابھی یہ معرکہ جاری تھا کہ 3 ستمبر 1939ء کو دوسری جنگ عظیم کا بگل بج گیا۔

شورش بنام عبداللہ

مجلس احرار نے اس جنگ کو سامراج کی جنگ قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف

تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ مجلس احرار کو اس امر کا یقین تھا کہ زود یا بدیر کانگرس بھی اس سامراجی جنگ کے خلاف تحریک چلانے پر مجبور ہو جائے گی' اس لیے کیوں نہ پہل کی جائے۔ ویسے بھی مجلس احرار کو اس امر کا احساس تھا کہ برطانوی سامراج کے خلاف برصغیر میں ایک عوامی تحریک ابھرنے والی ہے۔

انگریز حکومت کے لیے مجلس احرار کی یہ تحریک کانگرس کی مزاحمت سے کہیں زیادہ تشویش کا باعث تھی کیونکہ پنجاب فوجی بھرتی کا سب سے بڑا مرکز تھا' اس لیے یونینسٹ حکومت کسی صورت میں یہاں کوئی ایسی تحریک پنپنے نہیں دے سکتی تھی جو فوجی بھرتی پر اثر انداز ہو سکے۔ چنانچہ جیسے ہی مجلس احرار کے زعمانے اپنی شعلہ بیانیوں سے انگریز راج کے خلاف نفرتوں کو شعلہ جوالہ بنانے کی کوشش کی تو یہ تمام زعما سپرد زنداں کر دیئے گئے۔

ان زعما میں شورش کاشمیری بھی تھا۔ اس پر مقدمہ چلا' پھر نئی قسم کی رفاقت شروع ہو گئی۔ شورش جس جیل میں ہوتا' میں اس سے وہیں ملنے چلا جاتا۔ وہ جس عدالت میں پیش ہوتا میں وہاں موجود ہوتا۔ شورش جب بھی ایک جیل سے دوسری جیل منتقل ہوتا مجھے اس کی اطلاع ضرور دیتا۔ یہ اطلاع مختلف ملاقاتیوں کے ذریعے زبانی دی جاتی ورنہ زیادہ تر وہ مجھے خط لکھتا تھا۔ جیل سے شورش کاشمیری کے خطوط کا سلسلہ کوئی چھ ماہ تک دن رات جاری رہا' بعد میں تعطل پیدا ہو گیا۔ ان خطوط کا مطالعہ بڑا معلوماتی اور دلچسپ ہے کیونکہ یہ شورش اور میری زندگی کا ہیجان خیز دور تھا:

10 اکتوبر ڈسٹرکٹ جیل ملتان

بھائی---!

"تمہارا خط اگرچہ مختصر ہے لیکن جذبات و معانی کا ایک دلفریب ذخیرہ لیے ہوئے ہے۔ ہر جملہ ستائش طلب اور ہر فقرہ داد خواہ ہے' اللہ کرے زور قلم اور زیادہ! میرا جواب کیا ہو سکتا ہے! سفید کاغذ حاضر ہے' دستخط کیے دیتا ہوں' جو چاہو لکھ لو' مجھے اپنی تنگ دامانی الفاظ کا اعتراف ہے۔ تمہارے حسن نگارش نے مجھے ایک بار پھر اپنی شعری بے بضاعتی اور ادبی کم مائیگی پر مجبور ماتم کر دیا ہے۔

قانونی گرفت تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ مقامی مقدمہ کا فیصلہ اس ماہ کے اختتام پر

ہو جائے گا۔ مجھ پر تین مقدمات دائر کیے گئے ہیں۔ ملتان کے بعد لائل پور میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت میرے جرم و گناہ کی شنوائی ہوگی۔ تیسرا مقدمہ زیر دفعہ 124 (الف) و 153 (الف) منٹگمری میں زیر سماعت ہے۔ کوئی مقدمہ اور ہو تو میں کہہ نہیں سکتا' البتہ ایک بات ہے اور وہ بھی بہت پرانی' شاید مولانا محمد علی مرحوم نے فرمایا تھا اور اب میں کہنا چاہتا ہوں۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے ذوق گنہ یاں ہر سزا کے بعد

بیس پچیس روز میں تم نے ایک خط لکھا ہے۔ حالانکہ تم نے ہفتے میں دو خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس تساہل اور تغافل و تامل ہی کا نام تو بھول جاتا ہے۔ عزیزی عبدالروف کو دعا' بھائی عبد اللہ بٹ کا سکوت تعجب آفریں ہے۔ اگرچہ انہیں بھی خط لکھا چکا ہوں۔ آپ کی تالیف کہاں تک پہنچی؟

تمہارا بھائی--- شورش کاشمیری

لائل پور 23 اکتوبر 1939ء۔

"بھائی---

رفیق عزیز علاؤ الدین کی زبانی اور بھائی احسن عثانی کے خط سے آپ کی تکلیف کا سن کر طبیعت بے حد مغموم ہوئی۔ شاید یہ پہلی تکلیف تھی جس نے دل و دماغ میں ایک ناقابل اظہار احساس پیدا کیا--- جذبات و الفاظ کی تلاش میں ہوں۔"

"آپ کا ایک خط لائل پور جیل میں بھی آیا ہوا ہے۔ وہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگرچہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل عدالت آتے ہوئے پڑھنے کو دے رہے تھے۔ لیکن ایک محبوب خط اپنے لیے بہت کچھ چاہتا ہے۔ ابھی سماعت مقدمہ شروع نہیں ہوئی شاید دو بجے ہو' فیصلہ جو کچھ ہوگا' عزیز فللین بتا دیں گے' یہ پرزہ کاغذ جو ثانی درجہ رکھتا ہے ہتھکڑی لگے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ امید ہے قبول خاطر ہوگا۔ اس اختصار کو غنیمت سمجھو' باقی ملتان میں۔"

"آپ کا پریمی--- شورش کاشمیری"

25 اکتوبر 1939ء۔

"سلام مسنون! شاید میں نے آپ سے کسی خط میں وعدہ کیا تھا کہ میں اپنی آپ بیتی کا ایک ناتمام ورق عرض کروں گا۔ لیکن سوچنے پر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ حیران ہوں اپنی کہی ہوئی بات کو کیسے پورا کروں۔ دولت سے میں تہی دامن ہوں کہ کوئی رنگین بات کہوں۔ افلاس کی ہر ادا پھیکی ہوتی ہے۔ علمیت وہ میرے ہاں کہاں؟ غریب ذہن سے جدت کا پیدا ہونا پتھریلی زمین سے شاداب ٹہنیوں اور مہک آور پھولوں کی تخلیق کے برابر ہے ہاں ایک بات ہے جو ہندوستان کے مشہور صوفی منش شاعر حضرت بیدم شاہ وارثی رحمتہ اللہ علیہ نے شاید میری لیے ہی کہی تھی۔

عشق آیا ہے رفعت خیالی لے کر
حسن آیا ہے شوکت جمالی لے کر
ہر اہل کمال لے کے آیا ہے کمال
بیدم آیا ہے بے کمالی لے کر

میں جانتا ہوں کہ میں ابھی تک آپ کی نگارش جمیل کا جواب نہیں لکھ سکا ہوں۔ جو مجھے کہنا چاہیے تھا وہ ابھی تک دماغ و دل کے کسی نامعلوم گوشے میں بطور محفوظ پڑا ہوا ہے۔

آپ کی تصویر---؟ وہ تو کبھی کی پہنچ چکی ہے۔ ارمغان حجاز میں رکھی ہوئی ہے۔ ترجمان القرآن میں رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن "ملازم" کی شمشیر کفر ساز سے ڈرتا ہوں مبادا---!

برادرم عبداللہ بٹ نے اپنے ایک گرامی نامہ میں سوال کیا تھا کہ عبداللہ ملک سے خط کتابت کی رفتار فی گھنٹا کیا ہے۔ میں نے جواب میں مصلحتاً احتراز کیا۔ دراصل انہیں یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ فی سانس عبداللہ ملک کا نام کتنی بار ہونٹوں پر آتا ہے۔ میرے خیال میں یہ زیادہ موزوں ہوگا--- معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرے خطوط کی تشہیر کررہے ہیں---

شورش کاشمیری

ملتان ڈسٹرکٹ جیل یکم نومبر1939ء

شورش نواز بھائی!

"سلام شوق! میرے خیال میں تمہارے خط میرے خلش و اضطراب کی داستان کا دوسرا نام ہے۔ جو چیز میں کہنا چاہتا ہوں وہ تمہارے قلم سے ادا ہو رہی ہے۔

شاعر و ادیب انسانی فطرت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ تم ایک سحر کار نوجوان ادیب ہو اس لیے میرے احساسات و جذبات کا اظہار تمہاری زبان سے کچھ تعجب آفریں نہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں میرا رشک حسد نہ بن جائے۔ تمہاری خوبیِ اخلاق اور حسن محبت نے میری جراتوں کو دوچند اور میرے عزائم کو آہنی دیوار بنا دیا ہے۔ دعا کرو' مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ تمہارا یہ "بہادر" ساتھی آزمائش و امتحان میں ثابت قدم رہے گا۔

قید کے دن ہیں' غمگین لمحے ہیں۔ دو دیوانوں کا اجتماع ہے' تمام دن میں اور بھائی اقبال ایک "جدید افسانہ" کی تعمیر میں گزار دیتے ہیں۔ تمہارا تذکرہ محفل کی روح بن گیا ہے---- یہاں کی ہنگامہ آرائی بھی روز بروز ختم ہو رہی ہے۔ ایک دو اور ہونہار ذہن تھے وہ سزا یابی پر دوسری جیل میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اب ملازم کا چرچا ہے' نمازیں ہو رہی ہیں' مناجاتوں کا زور ہے۔ دعاؤں کا طوفان امنڈ رہا ہے۔ ساری عمر کی "بے دینی" نے دین کا لباس پہن لیا ہے۔

عزیزم عبدالرؤف کو بہت پیار۔ میرے خیال میں تمہیں اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ تمہاری کتاب (سرمایہ داری) کہاں تک پہنچی؟ ملتان کے ایک "دوست" آپ کا ایڈریس پوچھ رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا وہ کیوں' میں اس سلسلے میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن یہ باتیں میں اپنے قلم سے لکھوں گا۔ ہاں اتنا کہے دیتا ہوں کہ ملتان میں "برادران یوسف" کی کمی نہیں---

تمہارا پریمی شورش کاشمیری!

29 نومبر 1939ء

پیارے بھائی!

سلام محبت: عزیزی عبدالرؤف کے ہاتھوں کا لکھا ہوا خط پہنچا۔ طبیعت پہلے ہی اداس تھی' اور بھی متفکر ہوئی جب سے خط ملا ہے دعا کر رہا ہوں' خدا آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔

اس ماحول سے پرزہ کاغذ آپ تک پہنچ جانا بھی جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ محبت کو اپنی جان کا روگ نہ بناؤ۔ اس لطیف جذبہ کو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جگہ دو۔ صحت کا خاص خیال رکھو، تعلیم کو مقدم سمجھو' اس طرح رونے دھونے سے کیا حاصل؟ چھے سات سال کا زمانہ ہے' گزر جائے گا۔ اس تاریک مدت کے بعد زندگی نئی شاہراہ پر قدم رکھے گی۔ ہماری آنے والی صبح عروس حریت کے روشن چہرے سے زیادہ تابناک ہوگی۔

14 تاریخ کو ضرور آنا' اگر تمہاری کتاب چھپ گئی ہو تو لیتے آنا۔ اقبال کا کوئی خط آیا ہو تو بواپسی لکھو۔ اقبال اپنے مقدمہ میں تو بری ہو گیا تھا۔ آپ کا فوٹو' ترجمان القران میں رکھا ہوا ہے' کل ڈھونڈنے پر---؟ یہ اقبال کی شرارت ہے' میں اس غلطی کے لیے تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ جواب کا منتظر آپ کا بھائی---

شورش کاشمیری!"

لاہور 15 دسمبر 1939ء

پیارے بھائی!

"سلام شوق! میں خط لکھنا چاہتا ہوں لیکن مضمون کوئی نہیں---- آپ کی کتاب اول سے آخر تک پڑھی' اگر خوشامد خیال نہ کرو تو صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اٹھان ایک مستقبل کی علامت ہے۔ متوقع ہوں کہ اس ادبی و فکری کاوش کا نوجوانوں میں بلا تفریق افکار و خیال خیر مقدم کیا جائے گا۔ "مقدمہ" میں کتابت کی بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں جو ناگوار سی معلوم ہوتی ہیں۔ تفصیل سے دو تاریخ کو عرض کروں گا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے عزائم کو روشن و کامیاب کرے۔ آپ کے پاس "فن تقریر" ایک کتاب تھی۔ میں اسے دو ایک روز کے لیے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہو تو دو تاریخ کو لیتے آنا۔ محترمہ والدہ صاحبہ اور داداجی کی خدمت میں ہدیہ نیاز پیش کر دیں۔

"آپ کا غریب بھائی--- شورش کاشمیری!"

سعدی پارک لاہور 20 دسمبر 1939ء

پیارے بھائی!

سلام شوق! پرسوں میں نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں ایک مفصل

خط لکھوں گا۔ میرے نزدیک خط کتابت کا مشغلہ ایک بیکار سی چیز ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم دوستوں کو خط لکھے ہیں اور وہ بھی ایک دو بار سے زیادہ نہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا خط نہ آئے تو بے چینی سی محسوس ہونے لگتی ہے اور اگر میں تمہیں جواب نہ دوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ایک بہت بڑے خلوص سے غافل ہو رہا ہوں۔ یہ فرض مجھے تمہاری بلند سیرت سے بھی زیادہ پیارا ہے۔

آپ اپنا ذوق تصنیف و تالیف جاری رکھیں۔ دولت پیدا کرنا کوئی بری بات نہیں البتہ سرمایہ دارانہ نخوت بری شے ہے۔ مقام مسرت ہے کہ یہ غرور تم میں نہیں ہے۔ اسی باعث میں تمہیں اپنی طویل جستجو میں پہلا دوست سمجھتا ہوں اور اپنے اعتماد و یقین میں تم سے زیادہ کوئی حق دار نہیں پاتا ہوں۔۔۔

شورش کاشمیری!

یوسف کدہ' 9 جنوری 1940ء

"سلام محبت! تمہارے خط کے جواب میں خون کے چند قطرے بھیج چکا ہوں۔ میں جب مستقبل کی گوناگوں پابندیوں پر غور کرتا ہوں تو میرا دل بے اختیار ہو جاتا ہے' میں نے آج تک اپنے آنسوؤں کا تذکرہ نہیں کیا' لیکن رات کی حکایت کے اظہار پر مجبور ہوں' میری تمام رات روتے ہوئے گزری ہے یہ کیوں؟ اس لیے کہ کل کی ملاقات میں تمہارے چہرے کی اضطراری کیفیت اور تمہاری آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کی خاموش گویائی مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر چکی ہے۔"

"تم نے "اطمینان قلب" کے لیے دو راستے تجویز کیے ہیں۔" میں باہر آجاؤں یا تم اندر آجاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ میری دشواریاں مجھے کھل کر بات کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتی ہیں۔ خط لکھتا ہوں تو گرفت و تعزیر کا خوف دامن گیر ہوتا ہے۔ کاغذ ملتا ہے تو دوات و قلم کی تلاش ہوتی ہے۔ پھر تم تک ان بوسیدہ خیالات کا پہنچانا' آسمان سے ستارے توڑ لانے کے برابر ہے۔ سب سے زیادہ مشکل تو یہ ہے کہ تمہاری شگفتہ طرز نگارش کا جواب میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

میرا باہر آنا سات آٹھ برس سے ادھر ناممکن ہے۔ تم اندر آجاؤ' میرے پاس اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ فطرت مصائب کی

بھٹی میں سنورتی ہے۔ عشق فراق کی آگ میں جوان ہوتا ہے۔ زمانے کی شکایت فضول ہے۔ مصیبتوں کا شکوہ جوانمردی کی دلیل نہیں' میں تو آفات کو دعوت دے رہا ہوں اور ہر لحہ چشم عاشق کے مانند انتظار میں رہتا ہوں۔

بھائی! ماضی کی تلخ یاد کو بھول جاؤ۔ حالات سے سبق حاصل کرو مجھے مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ وہ وقت جو استقبال کے محمل میں بیٹھا ہوا ہے' ہم دورہ نوردان جادہ محبت و شوق کے لیے خوشگوار ہے۔ اگرچہ کہی ہوئی بات کا بار بار دہرانا ناموزوں ہوتا ہے لیکن مجھے کہنا ہی پڑتا ہے کہ میری بہت سی خوبصورت امیدیں تمہارے ساتھ وابستہ ہیں۔ میں تمہیں اپنا اول و آخر دوست سمجھتا ہوں۔ میں اس خط میں تمہیں کچھ اور کہنا چاہتا تھا' ارادہ کچھ اور تھا۔ یہ باتیں میں کیوں لکھ رہا ہوں' معاف کرنا میں خود بھی سمجھنا چاہتا ہوں۔

حالات نے بے وفائی نہ کی تو مذکورہ کتاب دو ایک روز تک بھجواؤں گا۔ جنگ و پیکار' چھ سات ماہ تک مرتب کر سکوں گا اول الذکر کا مقدمہ کوشش کروں گا کہ چوہدری افضل حق صاحب لکھ دیں۔ نظمیات کے مجموعے کی ترتیب و تقریب' جوش تک رسائی دشوار ہے۔ میں ہوتا تو ان سے مجبوراً لکھا لیتا۔ اب ایک صورت ہے خان کابلی سے کہوں گا۔ اگر اختر شیرانی رضامند ہو گئے تو بہتر ورنہ آگرہ کے ایک دوست نے سیماب صاحب کی طرف سے ہامی بھری ہے۔ فرمائیے آپ کا کیا ارشاد ہے؟

میں ایک بات تم سے کہنا چاہتا تھا اور میں نے کچھ غلط سے الفاظ میں اشارہ بھی کیا۔ وہ یہ کہ تم میرے لیے اپنا بہت سا وقت ضائع کر رہے ہو۔ والدہ مدظلہا بیمار ہیں ان کی خدمت تمہارا پہلا فرض ہے۔ دادا جان کا بڑھاپا بھی مستحق توجہ ہے۔ عبدالرؤف ابھی بچہ ہے' اس کی تعلیم و تربیت کا خیال بہت ضروری ہے۔ گھر کا تمام بار تمہارے کاندھوں پر ہے۔ تمہیں ان ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے مبادا میرے "دھندے" میں اپنے فرائض سے غافل ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایک مخلص دوست کی حیثیت میں کہوں گا کہ تم اگر کچھ وقت کے لیے مجھے بھول جاؤ تو یہ کوئی ایسی ہرج کی بات نہیں لیکن متذکرہ صدر فرائض سے تمہارا تساہل و تغافل اچھا نہیں۔ میں تمہیں اگلے خط میں بہت سی باتیں لکھ بھیجوں گا' ان پر خاص توجہ کرنی ہوگی۔ شاید میری خرافات

سے اکتا گئے ہو۔ میں ان خطوط کو ادب و شعر کی حیثیت میں پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں۔

"میں مجبور ہوں' تمہاری یاد میرے لیے ستم بالائے ستم ہو گئی ہے۔ میرے یہاں کے ساتھی مجھے پاگل کہتے ہیں۔ میں رات رو رہا تھا کہ ایک محافظ تسلی دینے لگے' ان کا خیال تھا کہ میں اس طویل بندش سے گھبرا گیا ہوں انہیں کیا خبر کہ دل کیا چاہتا ہے۔ نظریں کسے ڈھونڈتی ہیں۔"

دوست! تمہاری نگاہوں کی وہ خاموش گفتگو جو کل--- میرے غمگین دل سے ہو رہی تھی' مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ میں بھلانا بھی چاہوں تو یہ نہ بھولے گی۔ مجھے اس طرز تکلم میں تمہارے پیارے خطوں سے بھی زیادہ پیار نظر آتا ہے۔ میں پہلے بھی تمہیں اپنے نزدیک سمجھتا تھا لیکن کل سے میری کیفیت کچھ اور ہو گئی ہے۔ اب تم سے ہمیشہ یاد رکھنے کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ امید ہے تم میرے کاسہ شوق کا احترام کرو گے؟ احترام؟ شاید یہ لفظ میری زبان سے غلط ادا ہو گیا ہے۔ دراصل یہ جملہ یوں ہونا چاہیے تھا متوقع ہوں تم میرے شوق کو نامراد نہ رہنے دو گے۔

کفر و ایماں ہیں تری ایک نگاہ کے دو تیر
تو اگر چاہے تو کافر کو مسلمان کر دے

باقی کل' والدہ تک مجھ حقیر کا سلام پہنچا دیں۔ عبدالرؤف کو دعا---

تمہارا اختر

یوسف کدہ---11 جنوری 1940

"سلام نیاز! چار دن سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ میں یہ تیسرا خط لکھ رہا ہوں۔ ہر بار یہ خطرہ رہتا ہے کہیں تم میرے جذباتی خطوط پر ناراض نہ ہو جاؤ۔ میں نے آج تک جس قدر خط تمہیں لکھے ہیں' ان میں ایک خط بھی ایسا نہیں ہے جو سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہو۔ ہر خط میرے دیوانہ پن کی علامت ہے' میری وارفتگی کا نمونہ ہے' میری پریشانی کی علامت ہے۔

"تم نے میرے ساتھ دو وعدے کیے تھے: ایک تمہارے فوٹو کے متعلق تھا اور دوسرا ادب لطیف کے سالنامے کے بارے میں۔ اول الذکر وعدہ کے ایفا کے لیے دوبارہ عرض پرداز ہوں۔ ثانی الذکر ضرورت کوئی نہیں' کبھی مکتب والوں کے ہاں گزر

ہو تو مرزا ادیب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ اقبال کا کوئی خط آیا ہو تو فرمایئے۔ مجھے تو انہوں نے کئی دنوں سے کوئی خط نہیں لکھا۔ میرا چھوٹا بھائی کہیں مل جائے تو اسے کام کاج کی ہدایت دیں۔ والد محترم اس کی جدید روش سے بہت نالاں ہیں۔

آپ کا پریمی۔۔۔ اختر وارثی!"

سنٹرل جیل لاہور

30 جنوری 1940ء

شورش نواز بھائی!

"سلام محبت! کئی خط لکھ چکا ہوں لیکن سب پھاڑ دیئے ہیں۔ طبیعت کسی خط پر مطمئن نہیں ہوتی۔ شاید یہ دسواں خط ہے۔ کوشش میں ہوں یہ پرزہ کاغذ مکمل ہو جائے۔ میں بھی تمہاری طرح اپنے جنون پر ہنستا ہوں۔ خدا جانے میری دیوانگی کیا چاہتی ہے؟ آج کی ڈاک میں بہت سے خط آئے ہیں لیکن تمہارا کوئی خط بھی نہیں تھا۔ میرے لیے یہ تمام مکاتیب فضول ہیں' بے معنی ہیں' رائیگاں ہیں۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میرے ساتھ آج کل قضیہ شہید گنج کے ایک تازہ اسیر مسٹر محمد اکرم متعلم گورنمنٹ کالج لائل پور رہتے ہیں۔ ان سے عموماً ادبی و شعری گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ ایک دن کہہ رہے تھے کہ جس شخص کے بہت سے دوست ہوں' اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ میں یہ باتیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں اب اپنے دوستوں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی یگانگت میں بھی بیگانہ پن نظر آتا ہے۔ میں بہت دنوں سے اس کوشش میں ہوں کہ تمہیں اپنی کہانی کہہ سناؤں لیکن بہت سی باتیں ایسی ہیں جو خطوط میں نہیں کہی جاسکتی ہیں۔

میں تمہیں لاہور چھوڑ کر ملتان گیا تھا تو اس وقت مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تم میرے اس قدر نزدیک آجاؤ گے۔ میں تمہیں خط لکھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ میں نے جیل سے پہلا خط بھائی عبداللہ بٹ کے نام لکھا تھا جس میں تمہارے متعلق صرف یہ فقرہ تھا کہ "رفیق عبداللہ ملک آج کل کس رنگ میں بستے ہیں۔" کچھ دنوں بعد تمہارا ایک پوسٹ کارڈ میرے نام آیا۔ یہ ہمارے شوق کا آغاز تھا تم ملتان آئے لیکن تمہیں ناکامی ہوئی چونکہ

میں ایک دن پہلے لائل پور جا چکا تھا۔
تمہاری اس بے پایاں نوازش نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا کر دیا۔ میں قدرت کی اس رحمت پر خوش ہوں۔ اقبال شہادت دے سکتا ہے کہ ملتان میں تیرا جمیل تذکرہ ہر وقت ہوتا تھا اور اس سے میرے دکھے ہوئے دل کو تسکین ہوتی تھی۔ اب خطوں میں ادب و شعر تلاش نہ کرنا۔ یہ خط ایک ایسے شخص کی کہانی ہوں گے جو کچھ دنوں تک تمہارے شہر سے چلا جائے گا اور سات برس تک حوادث کی دردناک ٹھوکروں میں رہے گا۔ یہ سات برس عمر کا بہترین حصہ ہیں۔ تم اس مدت میں تعلیم سے فارغ ہو چکے ہو گے۔ عظمت تمہاری کنیز ہو گی' وقار تمہارا حامی ہو گا' ناموس و اقبال کی بلندیاں تمہارا نشیمن ہوں گی۔ شاہراہ حیات پر تمہیں بہت سے دوست ملیں گے۔ وقت تمہیں ان کی قابلیت و شہرت سے پیار کرنے پر مجبور و آمادہ کرے گا لیکن اس وقت اس غریب دوست کو نہ بھول جانا۔ یہ اب تمہارا ہے اسے بھی کبھی کبھی یاد کرتے رہو گے تو ایک انسانی زندگی کی حفاظت ہو گی۔ دوست کہو تمہیں میری ان لایعنی باتوں سے نفرت تو نہیں ہو گئی ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم ان کا جواب دو گے؟
آپ کا بھائی --- شورش کاشمیری!

30 جنوری 1940ء
پیارے بھائی!
"حسب الحکم اپنی واپسی کی رسید لکھ رہا ہوں۔ رات کے نو بج چکے ہیں لیکن میں جاگ رہا ہوں اور پورے پانچ گھنٹے کے بعد یہ دوسرا خط لکھنے بیٹھا ہوں۔ یہ دونوں خط تمہیں اکٹھے ملیں گے۔ دوست طالب علمانہ زندگی بھی عجیب زندگی ہے۔ ہمارے بورڈنگ ہاؤس کا ہر قانون انوکھا ہے۔ میں نے تمہیں ایک کتاب دی تھی وہ ہمارے ہاں کی صحیح تصویر تھی۔ روزنامچہ اگرچہ ایک ادبی چیز ہے۔ تمہاری "ٹھوسیات" اس میں نہیں۔ میرے ایک دوست میرے ساتھ تین گھنٹے سے اس تگ و دو میں ہیں کہ یہ خط تمہارے تک پہنچا دیئے جائیں۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ میں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ سردی بھی اچھی خاصی ہے۔ ہاتھوں میں سکت نہیں کہ سلاست و صفائی سے لکھ سکوں۔

تم مجھے جذباتی کہتے ہو' میں اس "ہاؤ ہو" کی دنیا سے الگ ہو جاؤں گا۔ تم نے شاعری سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ میرے لیے اب شعر کہنا حرام ہے۔ جنگ و پیکار کی ترتیب کا ارادہ بھی ترک کر چکا ہوں۔ جو نظمیں اکٹھی کی تھیں انہیں امروز و فردا میں پھونک دوں گا۔ یہ مبالغہ نہیں' حقیقت کہہ رہا ہوں۔ تم خود دیکھ لوگے۔

میں تمہارے سامنے کبھی بھی ایک سیاسی' ادبی اور شعری انسان کی حیثیت سے نہیں آیا۔ میرا دماغ سیاسی شعور کے اعتبار سے قرطاس ابیض ہے۔ ادبی شد بد بھی بمنزلہ صفر ہے۔ شعر سمجھنے کا ذوق ضرور رکھتا ہوں' لیکن کہنے کا سلیقہ بقول تمہارے وہی بات ہے۔

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے کنبہ جوڑا

ہاں میری بعض نظموں میں گداز اور روحانی خلش ضرور ہے لیکن کمیونزم کو قرآن سے زیادہ اہمیت دینے والی طبیعتیں اس میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ تمہارے لیے ان میں کچھ ہے۔ میں جب بھی کبھی تمہیں خط لکھتا ہوں اپنے علم و ادب کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ بھائی عبداللہ بٹ کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔ خدا جانے تم نے ایسے مخلص انسان کو کیوں ناراض کر لیا۔ بھئی اب کے 2 فروری کو اسے اپنے ساتھ ضرور لے کر آنا۔ یہ بات اچھی نہیں کہ عبداللہ بھائی ہم سے ناراض ہو جائیں۔ امید ہے تم انہیں لانے کی کوشش کروگے۔ وہ نہ آئیں تو منانے کی کوشش بھی کروگے۔ اقبال بھی تمہارے ہاں کھڑا ہوگا۔ خدا جانے یہ کیا ارادے لے کر آیا تھا۔ چونی لال واقعی بے نظیر آدمی ہے۔ گفتگو میں ابوالکلامیت ٹپکتی ہے لیکن چالبازی میں گاندھی کی سی نرمی اور حلم ہے۔ دشمن کو پیار اور محبت سے شکست دینا اس کا خاص وصف ہے۔ دو فروری کو ضرور آنا۔ دیکھو میں دوبارہ کہہ رہا ہوں' 2 تاریخ کو یاد رکھنا۔"

آپ کا مخلص بھائی!

31 جنوری 1940ء
چھ بجے صبح!
پیارے دوست!

"اب صبح ہو گئی ہے۔ رات کی ہر کوشش میں ناکام ہوں۔ بہت کوشش پر بھی وہ دو خط جو اس سے قبل لکھ چکا ہوں' ابھی تک میرے پاس پڑے ہوئے ہیں' ڈاک کے حوالے نہیں کیے جا سکے ہیں۔ اب یہ تیسرا خط لکھ رہا ہوں کہ جب تک یہ خط تم تک نہیں پہنچائے جاتے' میں ہر دو گھنٹے کے بعد تمہیں ایک خط لکھوں گا۔ خدا کرے یہ خط تمہیں مل جائیں۔ زمانے کی نظریں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں----

آپ کا بھائی!

سنٹرل جیل لاہور

یکم فروری 1940ء

ملک بھائی!

"سلام نیاز! آپ کے دولت کدہ پر بھی میرے دوست گئے تھے۔ آپ غائب تھے۔ خدا جانے آپ کہاں ہوتے ہیں۔ اقبال کل مجھ سے کسی کی سفارش پر مل گیا ہے۔ خدا جانے اس نے یہ اجازت کیسے حاصل کرلی؟ میں خود بھی حیران ہوں۔ کل دو تاریخ ہے۔ امید ہے آپ تشریف لائیں گے۔ فیصلہ گیارہ بجے سے قبل ہو جائے گا۔ آپ کو دس بجے آجانا چاہیے۔ "زندگی" پڑھ لیا ہو تو لے آئیں۔ ایک زندانی رفیق اسے پڑھنا چاہتے ہیں ورنہ کوئی خاص ضرورت نہیں۔ آپ سے ملاقات کے متعلق کل زبانی عرض کروں گا۔ خط کی فرصت تو شاید آج کل آپ کو نہیں؟ عبداللہ بٹ کو سلام۔

آپ کا بھائی!

بغیر تاریخ

میرے بہت ہی پیارے دوست!

"میرے خط تمہیں نہیں ملے یہ بھی ایک معما ہے۔ دو تاریخ کو آخری ملاقات ہوئی تم نے اس روز امرتسر جانا تھا۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو امرتسر ہو آؤ لیکن یہ حقیقت کہ تمہارے بغیر تسکین طبیعت ففرو ہو جاتی ہے۔ نہیں تمہیں اس روز نہیں جانا چاہیے۔ میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔ مجھے اس دن ضرور ملو۔ تمہارے بغیر میرا دن گزرنا محال ہے۔ تم نے مجھے آج شاعری پر جھاڑ پلائی ہے۔ میں اب شاعری سے

کنارہ کشی اختیار کر لوں گا۔ کہو مجھے اب کیا کرنا ہے۔ اشتراکیت کا مطالعہ میں شدومد سے کروں گا امید ہے تمہیں میرے اس اقدام سے اتفاق ہو گا۔ 'History of India' History of England یہ دونوں کتابیں یا ان میں سے کوئی ایک کتاب جو سکولوں وغیرہ میں ابتدائی دوسری کتب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہیں۔ اس روز ضرور لے آئیں تاکید ہے تم بھول بھی جایا کرتے ہو بھول جانا اچھا نہیں۔

تمہارے واپس تشریف لے جانے کے بعد بھائی ملک راج آ گئے تھے۔ میں ان سے دیر تک باتیں نہ کر سکا۔ تمہاری طرف بھی بھیجا تھا۔ امید ہے وہ تمہارے دولت کدہ پر آئے ہوں گے۔ عبداللہ بھائی' ایسے مخلص انسان تم بہت کم دیکھو گے' ان سے سلام محبت ضرور عرض کر دیں۔ انہیں ناراض نہ کریں۔ شاہراہ حیات پر نیک اور مخلص دوست بہت کم ملتے ہیں۔ عبداللہ بٹ ایک مخلص اور نیک دوست ہیں' تمہیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔ وہ مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ میں امروزہ خط میں انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔ انہیں اب کے تاریخ پر اپنے ہمراہ گھسیٹ لائیں۔ اشد تاکید ہے۔

دوبارہ تاکید ہے کہ 2 فروری 1940ء کو ضرور آئیں۔ امرتسر جانے کے لیے بہت دن پڑے ہیں۔ سات سال کی طویل مدت میں انسان کائنات ارض و سما کے ذرے ذرے کی سیر کر سکتا ہے۔ امرتسر میں شاید بھاوجہ کی کشش کھینچ رہی ہے یا کہیں پیرزادہ صاحب سے تو کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ یاد رکھو صام صاحب آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔ کسی کی ملکیت پر غیر حاضری میں قبضہ جمانا یہ بھی ایک قسم کی "سرمایہ داری" ہے جو قانون کی نظر میں ڈاکہ کہلاتی ہے۔ خیر' جس روز امرتسر تشریف لے جائیں تو وہاں کی جوان گلیوں اور شگفتہ راہوں کو میرا سلام کہنا اس لیے کہ ہم دونوں بھی ان راہوں پر گزرا کرتے تھے۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ وصل کے یہ مختصر لمحے جدائی کی طویل گھڑیاں بن جائیں گے۔ عزیزم عبدالرؤف کی تم نے کئی دن سے خبر نہیں دی ہے' کیا اسے ابھی اپنی طرح امتحان سے محروم کر رہے ہو۔ دیکھنا اس کی تربیت اچھی طرح سے ہونا چاہیے' کہیں اس باب میں بھی اپنی طرح غفلت نہ کر بیٹھنا۔ چونکہ مجھے یقین ہے کہ تم اب تساہل پسند ہو رہے ہو' والدہ محترمہ کو سلام عقیدت۔

آپ کا بھائی---!

رائے ونڈ اسٹیشن!
9 بجے شب
2 فروری 1940ء

"پیارے بھائی! لاہور چھوڑ جانے والے مسافر کا سلام قبول- تم میرے پاس سے چلے گئے ہو' خدا جانے اب کب ملاقات ہو! لاہور کے دو ماہ کتنی جلدی ختم ہو گئے! آج قدرت کتنی بخیل ہو گئی ہے کہ اس نے ابھی تک ہمیں کھل کر باتیں کرنے کی اجازت بھی نہیں دی-

قلم نہیں اور کاغذ بھی نہیں- سادہ لفافہ جس پر ایڈریس پہلے سے لکھ رکھا تھا- انور حقانی جیل میں مل گیا ہے- پنسل عاریتاً لے کر یہ خط لکھ رہا ہوں- لاہور کی جوان راہوں کو چھوڑتے ہوئے اب پھر دل برداشتہ جا رہا ہوں- اچھا' والسلام' پتو کی ریلوے سٹیشن-

تمہارا بھائی!

منٹگمری 16 فروری 1940ء

ہم نے کتنے ہی آشیاں بدلے
ابر کی برق باریاں نہ گئیں

"میرے پیارے عزیز عبداللہ! مجھے منٹگمری آئے چودہ دن ہو گئے ہیں- 3 فروری کے بعد تم نے کوئی خط نہیں لکھا- بایں ہمہ کہ ہم پر بہت زیادہ پابندیاں ہیں' کڑی نگرانی ہوتی ہے لیکن تین خط لکھ چکا ہوں' جواب ایک خط کا بھی نہیں ملا- اتنی جلدی یہ فراموشی اچھی نہیں- کچھ دیر بعد بھول جایئے گا تو بہتر ہے- خدا جانے آج کل تم کہاں ہو- منٹگمری سنٹرل جیل پنجاب کا "کالا پانی" ہے- جدھر دیکھو آسماں بوس دیواریں جبروت تعزیر کی خبر دے رہی ہیں- ہم تیرہ ساتھی ہیں لیکن سترہ تالوں میں بند' ہمارے رہنے کیلئے ایک چھوٹی سی بارک ہے لیکن چاروں طرف بلند دیواریں ہیں- جیل کے مین گیٹ تک آنے کیلئے ہمیں بہت سی پیچ و تاب کھاتی ہوئی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے- نظران "بھول بھلیوں" میں الجھ کر حیران ہوتی ہے- سارا دن ایک محدود فضا میں گزر جاتا ہے- یہاں وقت کی نبضیں عموماً ست رہتی ہیں- پھول پتی نام کو نہیں'

طبیعت اکتا جائے تو کمبل اوڑھ کے چپ چاپ سو جانے یا لیٹے رہنے کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔ کووں کی کائیں کائیں یا جرائم پیشہ قیدیوں کا شور و فریاد! بلبل کا نغمہ یا کسی خوش گلو پرند کی آواز ان باجبروت دیواروں تک آتے ہوئے لرزتی ہے۔ کوئی لطیف آواز بھی آ جائے تو فغان دل گداز یا نالۂ ماتم معلوم ہوتی ہے۔ میں نے تو کئی حسرت و نومید میں روتے ہوئے قیدیوں کی زبانی سنا ہے کہ خدا کی رحمت بھی ان دیواروں تک آتے ہوئے کانپتی ہے۔ میں اس کا قائل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا لطف کرم ہی ہم ناتواں بندوں کا غم خوار و مونس ہے ورنہ ارباب جبر و اختیار کی خون آشام روش کہاں جینے دیتی ہے۔

میں تمہیں قید کہانی سناتا ہوں۔ ہمارے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کشمیری پنڈت ہیں۔ پی سی ایس اور بی اے ایل ایل بی بھی ہیں۔ ہر وقت شراب میں مخمور رہتے ہیں۔ رفتار و گفتار میں رمزانہ سرمستی ہے۔ باتوں میں بھی بوئے بادہ مہکتی ہے۔ میں نے ایک دو بار جگر کے شعر سنائے تو جھوم گئے۔ مست اور نشیلی آنکھوں سے بھی داد دی۔ طبیعت کے نیک ہیں۔ غرض و ہوس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے ساتھ ونیرہ بھی اچھا ہے۔ خدا کا خوف بھی رکھتے ہیں لیکن اپنے ایک اسسٹنٹ پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ اس کی ہر کھری کھوٹی انہیں پسند ہے اور شاید اس لیے کہ ان کی نشہ پسند طبع انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

"ہمارے انچارج آفیسر ایک سکھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ رنگ روپ رات سے ملتا جلتا ہے۔ چہرے کی طرح دل کے بھی سیاہ ہیں۔ ہمیں تنگ کرنے میں انہیں خاصا مزہ ملتا ہے۔ میں نے کئی بار جیل کاٹی ہے لیکن ایسا تاریک ضمیر اور شرارتی آفیسر میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ ہماری ڈاک بھی سنسر کرتے ہیں اور بہت سے خط شیر مادر کی طرح ہضم کر جاتے ہیں۔ علم و ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔ ملاحظہ کو ملاخطہ اور چاقو کو چقو کہتے ہیں۔ یہی وہ اسسٹنٹ ہیں جو سپرنٹنڈنٹ کے محبوب نظر ہیں۔ چونکہ ایک پست آغوش میں پرورش پائی ہے' اس لیے اکڑفوں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ یار لوگوں نے بہت حد تک مزاج درست کر دیئے ہیں۔ امید ہے اور بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ کبھی تم آؤ گے تو دکھاؤں گا۔ تمہارا وہ خط بھی غصب کر رہے تھے جو تم نے لاہور ریلوے سٹیشن پر مجھے

دیا تھا' خیر' اپنی وضع کے خوب ہیں۔ خدا ایسے لوگوں سے بدنصیب ہندوستان کو چھٹکارا دے۔ آمین!

ہمارا دن کا پروگرام بھی دیدنی ہے۔ ہم تیرہ آدمی ہیں۔ ہم تمام دوست چرخہ کاتتے ہیں۔ قابل ذکر دوستوں میں مولانا گل شیر خان' میرداد خان کیمبل پور' کامریڈ کالی چرن آف لدھیانہ۔ برادر صوفی عنایت محمد پسروری' مولانا احسن عثمانی، حکیم غوث ہزاروی محمد اور سیتارام بندے ماترم وغیرہ۔

مولانا گل شیر خان کیمبل پور' میانوالی' سرگودھا میں بہت پر اثر ہیں۔ تازہ تازہ واردان میں سے ہیں۔ طبیعت بہت زیادہ نیک پائی ہے۔ چرخہ کاتنے میں ہم سے بہت زیادہ مشقت کرتے ہیں۔ دن رات پڑھتے رہتے ہیں۔ رات تین بجے کے قریب یاد الٰہی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور صبح کی نماز تک یہی شغل رہتا ہے۔ یہاتی حد درجہ سادہ دل ہیں۔ قید بھی پہلی دفعہ ہوئے ہیں۔ بعض اوقات شہری زندگی کے حالات سن کر متعجب ہوتے ہیں۔ چونکہ ہمارے بعض اشتراکی ساتھی خدا کے منکر ہیں' اس لیے جب انہیں یہ علم ہوا کہ دنیا میں ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جو خدا کی ہستی کے مطلق قائل نہیں ہیں تو آپ بہت زیادہ حیران ہوئے اور فرمایا کیا ہندوستان میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں۔ مسٹر محمد علی جناح کی بیٹی کی شادی کو ہمارا مخالفانہ پراپیگنڈہ سمجھتے ہیں۔ اس سادگی کے باوجود تنگ نظر ملا نہیں ہیں بلکہ ایک زندہ دل عارف ہیں' آپ کی سزا ڈیڑھ سال ہے۔

خان میرداد خان آف کیمبل پور مخلص اور درد دل رکھنے والے نوجوان ہیں۔ بہت زیادہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اشتراکی نظریات کے دلدادہ ہیں۔ طبیعت میں غصہ بھی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی سیر کر چکے ہیں۔ قانون نظربندی کی خلاف ورزی کے جرم میں ڈیڑھ سال قید بھگت رہے ہیں۔ آپ کی سرمایہ داری' انہیں بہت پسند آئی ہے۔ علاوہ بریں اور دوست بھی ہیں جن سے دن اچھی طرح گزر رہے ہیں۔ ہر شخص دن میں تین چار گھنٹے ضرور پڑھتا ہے۔ شام کو تمام افراد پنجابی کا ایک کھیل "کوکلہ چھپاکی" کھیلتے ہیں۔ رات کو دو تین گھنٹے تک گپ بازی بھی ہوتی ہے۔ غرض کہ مصائب کے ان زہرہ گداز دنوں کو خوش گوار بنانے کی ہر ممکن سعی کی جاتی ہے۔

آج میری رونمائی کی تاریخ ہے اور یہ خط بھی عدالت کے باہر ایک دکان پر بیٹھ کر لکھ رہا ہوں' 28 تاریخ کو صفائی کے گواہ پیش ہوں گے۔ اچھی خاصی چہل پہل رہے گی۔ اگر اس دن چھٹی ہو تو آجایئے گا' لیکن کالج سے غیر حاضر ہونے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ میں تمہیں سو بار کہہ چکا ہوں اور ہر بار کہتا ہوں کہ امتحان ضرور دو۔ اگر تم نے امتحان سے ذرہ بھر بھی کوتاہی کی اور یہ اچھے دن ضائع کر دیئے تو مجھے اس کا بے حد قلق ہو گا۔

دفتر احرار میں بھائی عبدالرحمٰن جامعی سے ملاقات ہو گی' میرا سلام بھی پہنچا دیجئے گا۔ سالنامہ احرار بھی آج کل میں چھپنے والا تھا لیکن ابھی تک اشاعت نہیں ہوئی' کیا وجہ ہے؟ عبداللہ بٹ سے کیسے تعلقات ہیں؟ اقبال کا کوئی خط؟ سنا تھا پشاور جا رہے ہو' کہئے ابھی تک آوارہ گردی کے اس حصے کی خانہ پُری ہوئی ہے یا کہ نہیں۔ تمہاری صحت آج کل کیسی ہے؟ کھانسی کی شکایت کس حد تک ہے؟ امرتسر جاؤ تو پھر ان بچھڑی ہوئی راہوں کو سجدہ نیاز کہنا۔ مجھے ان کی یاد ابھی تک آرہی ہے۔ اچھا دوست خدا حافظ--"

27 فروری 1940ء

میرے ملک---

میں نے ایک ہفتے سے تمہیں کوئی خط کیوں نہیں لکھا ہے' دوست ناراض نہ ہونا۔ یہ جیل ایسی ہے جو قیدیوں کے لیے رحم و کرم کا ایک لفظ بھی نہیں رکھتی۔ یہاں کی خاموش آگ دوزخ کے خوفناک شعلوں سے زیادہ تیز ہے۔

کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم نے 3 فروری سے لے کر 28 فروری تک مجھے ایک خط بھی نہیں لکھا۔ تمہارے بہت سے خط آئے ہوں گے لیکن مجھے ایک بھی خط نہیں ملا۔ تمہارے نام سے جیل والے سازش کی بو سونگھتے ہیں اور اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ تمہاری کوئی بھی خبر مجھ تک نہ پہنچنے پائے۔ ہاں اس سے زیادہ ستم اور کیا ہو سکتا ہے کہ چونی لال کے دو خط محض اس لیے رکے پڑے ہیں کہ ان میں تمہارا نام تھا۔ میں نے ایک خط جیل اتھارٹیز (Jail Authorities) کی معرفت بھی تمہیں بھیجا تھا' لیکن مجھے پتہ ہے کہ وہ خط اصل صورت میں تمہیں نہیں ملا ہو گا۔ اس پر احتساب کے موقلم سے

نقش و نگار بنائے گئے ہوں گے۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے ہیں۔ صبح 28 فروری 1940ء کو میری عدالت میں حاضری ہے۔ میں نے تمہیں اس دن آنے کے لیے لکھا تھا۔ اگر تم آ گئے تو بہت سی باتیں زبانی ہو جائیں گی۔ فوری طور پر جواب دو کہ تم نے مجھے آج تک کتنے خط لکھے ہیں اور ان میں کیا کچھ تھا تاکہ جیل والوں سے ان خطوط کا پرزور مطالبہ کیا جائے۔

دوسری بات جو تمہیں کرنی ہے اور بہت ضروری ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس سے غفلت نہ کرو گے یہ ہے کہ تم کوئی ایک نام اختیار کر کے وزیر اعلیٰ پنجاب سردار سکندر حیات' لالہ منوہر لعل' انسپکٹر جنرل جیل خانہ پنجاب' دیوان چمن لال ڈپٹی لیڈر اپوزیشن کو بزبان انگریزی اس غرض سے خط لکھو کہ وہ منٹگمری جیل کے سیاسی اسیروں کی مشکلات کو بنفس نفیس دیکھیں اور سنیں' مناسب عبارت آرائی تم خود کر لو گے لیکن پہلے خطوط میں امور ذیل کا تذکرہ بہت ضروری ہے:

ان گیارہ اسیروں کو سیاسی اسیروں سے علیحدہ منٹگمری ایسے Habitual Jail میں کیوں رکھا گیا؟

دوسرا اسیروں کا انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جو ہروقت شراب میں مگن رہتا ہے اور ہمیشہ ہتک آمیز لہجہ میں گفتگو کرتا ہے۔ اسیروں کی ذاتی ڈاک پر پابندی' سیاسی اسیروں سے اخلاقی مجرموں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ وزارت پنجاب کی تعلیمی مساعی کے باوجود اسیروں کے پڑھنے لکھنے کا کوئی معقول انتظام نہیں اور ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا جاتا ہے کہ اسیر ملنا نہیں چاہتے اور اسیروں سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری ملاقات کے لیے کوئی شخص نہیں آتا۔ جب خطوں کے متعلق پوچھا جائے تو کہا جاتا ہے تمہارا کوئی خط نہیں ہے' تمہیں کون خط بھیجے گا!

یہ تمام باتیں تمہیں ایک دو دن میں لکھ بھیجنا چاہئیں۔ خط میں کسی ایک اسیر کا نام بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خط اس انداز میں ہونا چاہیے جس سے فوری ایکشن کا مطالبہ نمایاں ہوں۔ دیوان چمن لال سے کہنا چاہیے کہ وہ اسمبلی میں ان مصائب کا ذکر کریں اور حکام متعلقہ سے دریافت کریں کہ ان گیارہ اسیروں کو فیروزپور کے سیاسی اسیروں سے علیحدہ منٹگمری ایسی سخت جیل میں کیوں رکھا گیا ہے اور ان کے ساتھ ہتک آمیز

سلوک کیوں کیا جارہا ہے؟

میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ تم اس راہ میں کوئی غفلت نہ کرو گے اور اس بات کو اپنے تک محدود رکھو گے۔ اس سے ہمارا مقصد جیل والوں کو ان کے کیے پر پشیمان یا پریشان کرنا ہے۔ انہیں یقیناً ہمارے سامنے سپر ڈالنا ہوگی۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے تم اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھو۔ تمہیں اطلاع ثانی تک ان ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر تم نے اس معاملے کو ادھورا چھوڑ دینا ہے تو پہلے ہی سے ان خطوط کو ترتیب نہیں دینا چاہیے لیکن اگر تم ہمارے لیے کچھ سہولتیں دیکھنا چاہتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ وہ لڑائی جو ہم شروع کر چکے ہیں اس میں وہ تمہیں ضرور کرنا چاہیے جو ہم آپ سے چاہتے ہیں۔ یہ ہمارا متفقہ فیصلہ ہے اور امید ہے کہ تم اس راز کو راز کی حد تک رکھو گے۔

خان میرداد صاحب امریکن تمہارے نظریات کے آدمی ہیں۔ ان سے تمہارا اکثر ذکر ہوتا ہے۔ ٹربیون میں "سرمایہ داری" پر ریویو دیکھا تھا۔ انہیں بہت پسند آیا ہے۔ یہ تمام رفیق آپ کو سلام کہتے ہیں۔ عبداللہ بٹ---؟ تمہارا امتحان---؟ تعلیم و ریاست----؟

آپ کا بھائی----

چلتی ہوئی گاڑی' اوکاڑہ ریلوے اسٹیشن!
ساڑھے دس بجے شب' 3 مارچ 1940ء
"پیارے بھائی عبداللہ ملک!

ایک بجے سے پانچ بجے تک شام تم میرے پاس رہے۔ میں اسے تمہارا احسان سمجھتا ہوں۔ میری ہر سانس تمہارے التفات کی ممنون ہے۔ ہمارا مستقبل انشاء اللہ نہایت روشن ہے۔ عبداللہ سفر حیات میں سب سے زیادہ دشواری دوستی کی منزل میں ہوتی ہے۔ دوستی ایک سہل ترین لیکن دشوار امر ہے۔ خدا ہمارے دل کے لطیف جذبوں کو تاریک نظروں سے محفوظ رکھے' آمین۔ صبا رفتار ٹرین میں یہ الفاظ وارفتگی محبت نے لکھوا لیے ہیں۔ ان کا مطالعہ تمہیں ایک ادیب و ناقد کی حیثیت سے نہیں بلکہ پیار کی نظروں سے کرنا چاہیے۔

آپ کا ناچیز غریب بھائی

منٹگمری 27 مارچ 1940ء

شورش نواز بھائی!

"خوش رہو' کامریڈ ہرنام سنگھ چمک ہمارا ساتھ چھوڑ کر تمہارے پاس آ رہے ہیں- انہیں تم سے غائبانہ تعارف ہے اور ملاقات کا اشتیاق- سیاسی طور پر تمہارے ہم عقیدہ ہیں- اپنی سنائیں گے تمہیں سنیں گے- یہ رقعہ تعارف کے طور پر دے رہا ہوں- تین خط بھیج چکا ہوں ایک خط میں ان کا ذکر بھی تھا- جواب ایک خط کا بھی نہیں ملا- خاکساروں کا ہنگامہ' لیگ کا رقص' امتحان کی تیاری-

پہلی دو باتیں تو کوئی خاص نہیں ہیں- تیسری بات البتہ اہم ہے خدا کرے ایسا ہو اور تم بی اے ہو جاؤ- تمہاری کتابیں ابھی تک میرے مطالعے میں نہیں آئیں- کچھ دوست پڑھ رہے ہیں- میں بھی پڑھوں گا--- چونکہ تم کہتے ہو- کتابوں کے ابتدائی صفحوں پر تم نے جو لکھا ہے وہ فلسفیانہ شاعری ہے- اقبال بھی یہی کہتا ہے- شراب ایک ہے لیکن پیالے دو ہیں- کارل مارکس کا ذہنی تصور مادیت کا دلدادہ ہے' اقبال کا دماغی ارتقاء روحانیت کا شیدائی ہے- تم وقت کے نشیب و فراز کو "ملائیت" کی پیداوار کہتے ہو- ہمارے نزدیک یہ سب کچھ مشیت ایزدی کا نتیجہ ہے اور قدرتی امر کہلاتی ہیں- حالات کا مطالعہ کوئی بڑا مقصد نہیں ہے- نظریں دیکھتی ہیں' دماغ سوچتا ہے- ہاں' سوچنے اور دیکھنے کی مقدار کا انحصار انسان کی اپنی قابلیت و قوت پر ہے-

مادی فلاسفر جو روحانیت کا قائل نہیں ایک ایسا ڈاکٹر ہے جو مرض کی تشخیص کرنا جانتا ہے لیکن علاج سے ناواقف ہے- مادہ پسند کہتا ہے مذہب نے انسانوں کو تباہ حال کر دیا ہے- روحانیت فضول ہے- وہ سب سے بڑا وہم ہے- وہ اپنے آپ کو ناقص العقل سمجھتے ہوئے بھی قدرت کاملہ کا انکاری ہے- سیدھی سادی سچائیوں کا حریف ہے- مرض کا علاج بتاتا ہے لیکن خود مرض میں مبتلا ہے- وہ کہتا ہے مذہب کی تلوار انسانی خون سے کھیلتی رہی ہے- لیکن خود یہ سب کچھ کر رہا ہے- وہ یہ نہیں جانتا کہ میں جو الزام مذہب کو دے رہا ہوں وہ اس سے زیادہ مجھ پر عائد ہوتا ہے- وہ دوسروں کی آنکھوں میں تنکا دیکھتا ہے لیکن اپنی نظر کے شہتیر سے بالکل غافل ہے-

تلوار اگر مذہب کے میان میں ظلم ہے تو اشتراکیت و اشتمالیت کی نیام میں بھی رحمت نہیں ہے--- "کتابیں قوموں پر حکومت کرتی ہیں۔" والٹیر کا یہ ارشاد بجائے خود درست ہے لیکن زندہ قومیں کتابیں بناتی ہیں۔ حالات کی رو میں بہتی نہیں' حالات پیدا کرتی ہیں۔ تاریخ پڑھتی نہیں' تاریخ بنتی ہیں۔

دماغی تربیت آزادی کا واحد ذریعہ نہیں۔ قلبی جرات کی بھی ضرورت ہے۔ فلسفہ' قوت' عمل اور طاقت کے اظہار کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ اصل چیز طاقت ہے جو دماغ میں نہیں' دل میں نشیمن رکھتی ہے۔ اکثر فلاسفر دماغی ابہام میں قلبی جرات کھو بیٹھتے ہیں۔ جب قومیں طاقت پالیتی ہیں تو دماغ کی راہیں خود بخود کشادہ ہونی شروع ہو جاتی ہیں اور سیاسی غلبہ معاشرتی' ارتقائی' ذہنی فکری ترقی کے لیے دلیل راہ بن جاتا ہے۔ میں تمہارے نظریات کا مخالف نہیں ہوں' تمہاری باتوں کو جھٹلا نہیں رہا ہوں۔ میں یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ معمولی اختلاف ہے' جزوی فرق ہے' مادیت میں روحانیت نہ ہو تو علم بغیر عمل کے رہ جاتا ہے یا ایک بے خوف فلسفہ ہے۔

تم والٹیر' روسو' کارل مارکس' اینگلز' سٹالن' لینن ایسے تازہ واردان فکر کے پیچھے جانا چاہتے ہو اور میں انہیں انسانوں کا محسن تو مانتا ہوں لیکن ان پر اعتماد و یقین نہیں کرتا۔ ان کی باتیں مجھے اسلام میں بھی ملتی ہیں' انہوں نے جو شراب نئے جاموں میں پلانی چاہی' وہ مے کدہ اسلام میں پہلے سے موجود ہے' البتہ پیالوں میں تفاوت ضرور ہو گیا ہے۔'

خیر تم اس خط کو کچھ بھی سمجھو لیکن میں یہ سب باتیں سمجھنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید بھی ہے کہ تم ان کا جواب دو گے۔ تمہاری صحت اب کیسی ہے؟ بھائی احسن' بھائی صوفی اور برادرم خان میرداد بھی سلام کہتے ہیں۔ مقدمہ کی تاریخ 12 اپریل مقرر ہوئی ہے۔

آپ کا---

8 اپریل 1940ء

عزیزی---

"سلام اور پیار! تمہاری بھیجی ہوئی کتابیں تمام دوستوں نے پڑھی ہیں' میں بھی

پڑھ چکا ہوں۔ آج میری تاریخ تھی۔ عبدالحفیظ کی معرفت یہ کتابیں واپس کر رہا ہوں۔ ایک دو دن میں تمہیں مل جائیں گی۔ "مدینہ" میں ابوالکلام آزاد" کا خطبہ صدارت چھپا ہو گا۔ میں نے یہ تم سے مانگ بھیجا تھا' ٹریبون اور "ویر بھارت" میں چھپا ہوا مل گیا ہے' اب کوئی ضرورت نہیں۔

تم امتحان دے رہے ہو گے۔ اپنا رول نمبر ہمیں بھی بتا دیں تاکہ "رزلٹ" دیکھ لیں۔ ہاں خان کابلی کو میرا سلام کہئے گا اور ان سے کہئے گا کہ وہ اپنے ہمراہ میرے اباجی کو لانے کی کوشش نہ کریں۔ لاہور سے کچھ دوست یہاں آنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر ملاقات کے لیے آنا چاہیں تو انہیں منع کر دیں۔

آپ کا بھائی---

منٹگمری 16 اپریل 1940ء

دوست---!

"تمہارے تازہ خط میں بہت سے فقرے دلفریب ہیں' اچھے ہیں' عمدہ ہیں۔ تم نے کہا۔" میں کبھی تمہارے دل میں دائمی یقین کا باعث بھی بن سکتا ہوں یا نہیں یا یہ انس و محبت راہ گزر پر رکھے ہوئے چراغ کی طرح رہے گا جسے ہر دم بجھ جانے کا ڈر لگا رہتا ہو۔

دل نہیں تو اعتبار کہاں؟ گھر نہ ہو تو اثاثہ کی تلاش فضول ہے۔ تمہاری محبت' راہگذر کا چراغ نہیں بلکہ صراحی میں رکھی ہوئی شراب ہے جو ہر پیمانے میں ڈھل جاتی ہے۔ میں تم سے کوئی تلخ بات کہتا ہوں تو مجھے زیادہ دکھ ہوتا ہے' لکھ دیتا ہوں لیکن راتوں کو جاگتا ہوں' سوچتا ہوں' پچھتاتا ہوں' یہ تو تم نے ہی کہا تھا کہ ہر بات پر سوچو' سوچنا بہت اچھی چیز ہے۔ اب اگر میں کچھ سوچتا ہوں تو تم وہم کہتے ہو۔ اچھا یونہی سہی! محبت کو فلسفہ کی میزان میں تولنا محبت کو ذبح کرنا ہے۔ محبت کوئی دلیل نہیں رکھتی ہے' وہ تو خود ایک کامیاب دلیل ہے۔

احسن بھائی کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ انسان دلیل پر ایمان لاتا ہے' انسان پر نہیں حالانکہ دلیل کا مصنف بھی انسان ہے۔ محبت دلیل کے ضابطوں سے آزاد ہوتی ہے۔ وہ فلسفی نہیں' شاعر ہے۔ تم نے جو یہ بے دلیل بات کہی ہے؟ مجھے بھلانا جتنا آسان تم نے

سمجھا ہے اتنا آسان نہیں۔ تم مجھے نہیں بھلا سکو گے۔ اس سے زیادہ سچی بات شاید تم نے آج تک نہ کہی ہو۔

تم اگر ہٹنا چاہو تو یقیناً اس بارے میں آزاد ہو۔ یہ فقرہ میں نے بھاری دل کے ساتھ پڑھا ہے۔ یقیناً تمہارے دماغ و دل نے ساتھ تو دیا ہے۔ یہ تم نے کوئی اچھی بات نہیں کی، تمہارا یہ فقرہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ بھائی! میرے بہت سے پرانے خط تمہارے پاس کہیں پڑے ہوں گے۔ انہیں ایک بار پھر پڑھ لو۔ تم ان الفاظ میں ایک سچے دوست کو دیکھو گے۔ وہ دوست جو سفر حیات میں بہت کم ملتے ہیں۔ یہ خط کچھ لمبا ہو رہا ہے۔ لیکن ہجر کی رات اس سے بھی کہیں زیادہ گزر چکی ہے۔ دن ہونے کو کچھ دیر باقی ہے۔ جسم افرنگ کا اسیر ہے، دل تمہارا قیدی ہے۔

رات بہت زیادہ گزر چکی ہے۔ دن ہونے کو کچھ دیر باقی ہے۔ ہمارا پہرہ دار "بول جوان" کہتا ہوا گزر جاتا ہے۔ ہر بارک سے "سب اچھا" کی آواز آتی ہے۔ ہم سب الگ الگ کوٹھڑی میں رہتے ہیں۔ محافظوں کی ہر گھنٹہ بعد "بول جوان" کی آواز آتی ہے۔ میں کئی راتوں سے نہیں سویا ہوں۔ جب ہمارا پہرہ دار میری کوٹھڑی پر صدا دیتا ہے تو زبان سب اچھا کہتی ہے لیکن دل کچھ اور کہتا ہے۔

"قائد دوست! میں اس خط کی طوالت پر معافی چاہتا ہوں۔ تمہارے تازہ سفر کا خرچ بہت ہوتا ہوگا یہ دس منٹ فضول گئے ہیں۔

تمہارا۔۔۔ جو کبھی تمہاری نظر میں بھی تھا۔۔۔

18 اپریل 1940ء

بھائی۔۔۔

"بے چین دن گزار رہا ہوں۔ میں خط لکھتا ہوں تم جواب نہیں دیتے ہو۔ مانا تمہارے خط لکھنے والوں میں اضافہ ہوگیا ہوگا۔۔۔ تم خط نہیں لکھو گے۔۔۔ اچھا نہ لکھو، تمہیں کچھ عرصہ بعد میری یاد ستائے گی۔ نئے ذوق اور نئے عزم پر مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے بھی اجازت رخصت دو۔ وقت کا فسانہ نگار ہاتھ داستان ہستی کا آخری پیرا لکھ رہا ہے۔۔۔" بہت زمانے بھر تم مجھے یاد کیا کرو گے۔۔۔

تمہارا۔۔۔۔



باب 4

سرمایہ داری

شورش کاشمیری کے یہ خطوط اس دور کے عکاس ہیں جب میں زندگی کی سیاسی اور سماجی ہنگامہ خیزیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ بظاہر ان دنوں میں اسلامیہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا بلکہ کالج میگزین "کریسنٹ" کے اردو سیکشن کا مدیر تھا۔ اس کے ساتھ سامراج دشمن سیاسی اور مذہبی تحریکوں کا بھی ایک حد تک پرجوش اور پرعزم کارکن تھا۔ سوشلزم کی طرف میں اس قدر مائل ہو چکا تھا کہ اس نظریئے کی اشاعت کے سلسلے میں ایک کڑی "سرمایہ داری" تحریر کی۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے +شورش کاشمیری گرفتار ہو چکا تھا۔ نومبر 1939ء میں مکتبہ اردو کے بانی چودھری برکت علی جن کا تعلق مجلس احرار سے تھا اور وہ ترقی پسند افکار کے زبردست حامی تھے' انہوں نے برطانیہ کی Penguin کی طرز پر کتابوں کا ایک سلسلہ "چھ پنس کی کتاب" کی طرح یہاں پر "چھ آنے کی کتاب" کے نام سے شروع کیا۔ ان کی پہلی کتاب "سرمایہ داری" تھی جو میری تحریر کردہ تھی۔ جبکہ ان کی دوسری کتاب کمیونسٹ کا مینی فیسٹو تھا جس کا باری علیگ نے ترجمہ کیا تھا۔

یہ کتاب میں نے شورش کاشمیری تک دسمبر کے اوائل میں پہنچائی۔ 15 دسمبر کے خط میں شورش کاشمیری نے "سرمایہ داری" کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا "یہ اٹھان مستقبل کی ایک علامت ہے۔ متوقع ہوں کہ اس ادبی و فکری کاوش کا نوجوانوں میں بلا تفریق افکار و خیال خیر مقدم کیا جائے گا۔ واقعی ایسا ہی ہوا کیونکہ اس کتاب پر جس طرح اخباروں اور رسائل میں تبصرے شائع ہوئے' وہ میرے لیے باعث افتخار

ہے۔ خاص کر خواجہ عبدالوحید کا لکھا انگریزی تبصرہ جس نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔

یہ خواجہ عبدالوحید کون تھے؟

خواجہ عبدالوحید کو جاننے سے پہلے مولوی عبداللہ (الخیر) اور سید عبداللہ کو جاننا ضروری ہے کیونکہ وہ میرے والد محترم کے ہم جولی اور دوست تھے۔ اس لیے ان سب سے گہری عقیدت اور دوستی تھی۔ اس طرح میری دوستیاں مختلف لوگوں میں بٹی ہوئی تھیں' اس کا بھی اپنا ایک پس منظر تھا۔

ایک بات مسلمہ ہے کہ میری تمام تعلیم و تربیت (سیاسی یا مذہبی) دادا جان کی مسلسل کوششوں اور میرے ردعمل کا نتیجہ تھی جو میں نے ظاہر کیا۔ میری ابتدائی تعلیم سے ہی باقاعدہ گھر پر پڑھانے کیلئے دادا جان نے کسی نہ کسی کو استاد مقرر کیا۔ اس طرح ہمیشہ کوئی نہ کوئی استاد میری زندگی پر اثرانداز ہوا۔ پرائمری سے مڈل تک کے اساتذہ میں ماسٹر پیراں دتہ' ماسٹر محمد علی' ماسٹر عبداللہ اور آٹھویں میں ماسٹر محمد دین جو کہ ہماری گلی میں رہتے تھے۔ خوب مشفق استاد تھے۔ مڈل کے زمانے میں میرے دادا کے ایک جاننے والے جو گجرات کے مولوی تھے ان کے بڑے بیٹے مولوی احسان الحق جو بی اے کرنے کے بعد لاہور میں قانون پڑھنے کیلئے لاء کالج میں داخل ہوئے تو دو ڈھائی سال تک ہمارے گھر میں رہے۔ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ بہت بڑے نامور وکیل بنے۔

مولوی احسان الحق خود بھی باقاعدہ پڑھائی کرتے اور اس کے ساتھ مجھے پڑھانے کی بھی انہیں ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ میں بہت جلد محسوس کرنے لگا کہ انہیں پڑھنے یا پڑھانے سے زیادہ دلچسپی محلے کی لڑکیوں سے تھی۔ اس لیے وہ جب بھی گھر میں ہوتے ہر وقت تانک جھانک میں مصروف رہتے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی بلا مقصد لڑکیوں میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ خاص کر کے محلے کی ان لڑکیوں میں جو میری والدہ سے قرآن مجید پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ ہمارے گھر میں پڑھنے والی لڑکیوں میں ایسی لڑکیاں جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کی وجہ سے بڑی شوخ اور شنگ تھیں ان میں عنایتی سب سے زیادہ چنچل تھی جس سے مولوی احسان الحق سب سے زیادہ دل لگی کرتے تھے۔ دوسری لڑکیوں میں شہزادی اور ویراں تھیں جنہیں میں تنگ کرتا تھا اور وہ مجھے ہمیشہ

شرارتی کہہ کر استانی جی سے پٹوانے کی دھمکیاں دیتی تھیں اور جب میں انہیں پوچھتا کہ تم احسان الحق کی شکایت کیوں نہیں کرتیں تو وہ جواب دیتی تھیں "تم بھی اسی طرح تنگ کرو نا۔" اس سے پہلے کہ میں احسان الحق سے یہ پوچھتا کہ وہ کس طرح سے لڑکیوں کو تنگ کرتے ہیں' کہ لڑکیاں ان کی شکایت نہیں کرتیں؟ احسان الحق نے میرے کان مروڑتے ہوئے کہا "بھئی تمہاری شکایت آئی ہے کہ تم لڑکیوں کو تنگ کرتے ہو' خبردار نہیں تو میں تمہارے دادا جان کو یہ سب کچھ بتادوں گا۔ اس کے بعد دادا جان کے خوف سے لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ تو دور کی بات ہے' تانک جھانک بھی چھوڑ دی۔

ایک دن علی الصبح شاہ عالمی سے گزر کر بازار ججی ہٹہ آ رہا تھا کہ راستے میں سگ زادوں کی جوڑی کو ایک عجب حالت میں دیکھا ارد گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ یہ تماشا بڑا ہیجان خیز تھا جس نے میرے اندر ترغیب کو بیدار کر دیا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ میں نے اس غرض سے کسی لڑکی کو پہلی بار کب چھوا اور اس نے کیا کہا لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اولین موانست اپنے محلے کے جمعدار (محمد دین) کی بیوی جو خود مہترانی تھی' اس کے ساتھ کی۔ اس روز ہمارے گھر مہترانی آئی تو میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنے قریب آنے کے لیے کہا۔ میرے اندر کے ڈر اور خوف نے میرا گلا دبا رکھا تھا کہ اس تک میری آواز نہ پہنچی ہو لیکن میں نے دیکھا کہ وہ دوڑتی ہوئی از خود میرے قریب آگئی۔

میٹرک میں دادا جان سوہا بازار کے اندر ایک گلی میں واقع ایک مکان میں ماسٹر اقبال کے ہاں چھوڑ آئے۔ انہی کی محنت اور رہنمائی میں' میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں' میں نے جتنی محنت کی وہ غالباً میں نے تمام عمر نہیں کی کیونکہ میں صبح اڑھائی تین بجے اٹھ کر سردیوں کے زمانے میں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ دراصل ماسٹر اقبال جس اسکول میں پڑھاتے تھے' وہاں انہیں گھر سے صبح دم نکلنا پڑتا تھا۔ ماسٹر اقبال کے والد بھی اسکول ٹیچر تھے اور وہ ہی میرے دادا کے واقف کار تھے۔ وہ اس وقت بھی پڑھاتے تھے لیکن پرائمری کے بچوں کو' اس گھر' خاندان کے ساتھ ہمارے گہرے تعلقات تھے۔

جب میں گورنمنٹ کالج میں دوسرے سال کا طالب علم تھا تو میرے دادا نے مجھے حافظ شفیع محمد کے پاس ٹیوشن کے لیے بھیج دیا۔ حافظ شفیع محمد اندرون موچی دروازہ کے

رہنے والے تھے۔ ان کے والد ٹھیکیدار تھے۔ حافظ شفیع محمد نے اپنی محنت اور لگن سے ایم اے کیا تھا۔ وہ اپنے والد سے الگ ایک بیٹھک میں رہتے تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے تین یا چار سال بڑے ہوں گے۔ ان کا کام صرف ایف اے اور بی اے کے طلباء کو ٹیوشن پڑھانا تھا۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اسی سے اپنا اور اپنی پڑھائی کا خرچ پورا کرنے لگے۔ اکثر دوست آتے کھانا کھاتے' تاش کھیلتے اور گپ لگاتے تھے۔ اس سب کچھ کے باوجود پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیلنے کے وقت کھیل ان کا اصول تھا۔ اس طرح ایک حلقہ یہ تھا جو اسلامیہ کالج کی طالب علمی تک بلکہ اس کے بعد بھی میں اس حلقہ کی زنجیر بنا رہا۔

گورنمنٹ کالج کی فضا نے میرے اندر کے آوارہ گرد کو اور ہوا دی کہ میں اب بگولوں کی طرح ادھر ادھر رقص کرنے لگا۔ ہوا یہ کہ کالج کی طرف سے جب میرا انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لیے داخلہ نہ بھیجا گیا تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔ دوستوں نے سمجھایا کہ دیکھو کالج کی طرف سے تم سپلیمنٹری کے امتحان کی درخواست پرنسپل کو دو تاکہ تم سپلیمنٹری امتحان میں بیٹھ سکو۔ چنانچہ میں نے پرنسپل کے نام درخواست لکھ کر سری نگر اور کشمیر جانے کا پروگرام بنایا۔ اس سفر میں میرا کلاس فیلو مغنی' اس کی بھاوج اور ہمارا ایک دوست شریف مٹھی شامل تھے۔

ہمارا پہلا قیام پہلگام میں تھا جہاں ہم ایک ماہ تک خیمہ زن رہے۔ اس زمانے میں کشمیر امراء کا مرکز تھا۔ ان میں زیادہ تر پنجابی ہوتے۔ یہاں بنگال ہی نہیں مدارس اور بمبئی کے امراء اپنے خاندان کے ہمراہ گرمیاں گزارنے آتے تھے۔ اس طرح گرمیوں میں اس حسین وادی کے حسن پر اور نکھار آ جاتا۔ اس دوران میری بہت سے لوگوں سے دوستی ہوئی خاص کر گورنمنٹ کالج میں کشمیری طلباء سے بڑی ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلگام سے ہم سری نگر چلے گے۔ اس طویل سفر کے باعث گھر والوں ہی نے نہیں کئی دوستوں نے بھی خط لکھنے شروع کر دئے۔ ان خطوط میں گورنمنٹ کالج سے ذوالفقار علی بخاری کا بھی ایک خط تھا جس میں اس نے خفگی کا اظہار کیا تھا کہ کشمیر اور سری نگر تم اکیلے کیونکر چلے آئے جبکہ مجھے بھی ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔

حافظ محمد شفیع کے بھی کئی خط موصول ہوئے جس میں انہوں نے واضح طور پر مجھ

سے خفا ہو کر لکھا تم پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے ہو' تمہارے دل دماغ میں ہر وقت آوارگی سمائی ہوئی ہے۔ تم بڑی بے دردی سے اپنے قیمتی وقت کو ضائع کر رہے ہو۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب یہ وقت گزر جائے گا تو پھر تم پچھتاؤ گے' میں اُن سے انگریزی پڑھتا تھا اس لیے انہیں ہمیشہ انگریزی میں خط لکھتا تھا۔ اب کے بار ان کا جو خط آیا اس میں انہوں نے کہا' میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ تمہاری اردو' تمہاری انگریزی سے بہتر ہے اور مجھے اس پر رشک آنے لگا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں تمہیں انگریزی میں لکھا کروں اور تم مجھے اردو میں جواب دو۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ تمہاری دادی کہتی ہیں کہ تمہارے دادا جان بیمار تھے اور وہ خط نہیں لکھ سکتے تھے' اب وہ بہتر ہیں اس لیے وہ تمہیں خط لکھیں گے۔ ایک بات جو انہوں نے تحریر کی یہ بات کوئی عام ملنے اور تعلق رکھنے والا نہیں لکھ سکتا۔ گو یہ خط ایک سال کے بعد لکھا گیا' اس بات کا تمہیں شاید احساس نہیں ہے کہ کس طرح تمہارے والد کی وفات کے بعد تمہارے رشتے دار اس تاک میں تھے کہ تم تباہی کے راستے پر چلو اور وہ تمہاری جائیداد ہتھیالیں اور شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہارے دادا' دادی نے کن صعوبتوں اور محنتوں سے اس جائیداد کو تمہارے لیے محفوظ کیا۔ لیکن اگر تم خود ہی اسے تاش کھیلنے' سیر کرنے اور کپڑے پہننے میں اڑا دو گے تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔ دیکھو' خود پر غور کرو ورنہ اگر تم خود کنویں میں کودنا چاہتے ہو تو تمہیں کون روک سکتا ہے۔

یہ سب گورنمنٹ کالج کی آوارگیاں تھیں۔ اسلامیہ کالج تک پہنچتے ہوئے میرے اندر بے شمار تبدیلیاں آگئی تھیں لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ چور چوری سے تو جائے' ہیرا پھیری سے نہ جائے' اپنی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی اور اس حالت کے لیے ہم مجبور تھے۔ اگرچہ ہمیں نیا طریقہ اور سلیقہ آگیا تھا۔ ایک طرف اگر سیاسی ہنگامہ خیزی تھی تو دوسری طرف ان دوستوں سے گپ شپ لگانا اور تاش کھیلنا تھا جو ہمارے محلے دار یا پڑوسی تھے۔ اس کے ساتھ ہی خواجہ عبدالوحید' ابوالخیر عبید اللہ اور سید عبد اللہ جن سے عقیدت تھی' احترام بھی تھا اور دوستی بھی جیسے دوستوں میں گپ شپ لگانا۔

ابو الخیر عبد اللہ کے والد خلیفہ سعد الدین ہماری دادی جان کے والد کی مسجد کے امام تھے۔ اس زمانے میں ہر مسجد اپنے امام کے نام سے جانی جاتی تھی' اس لیے یہ مسجد

سعد الدین کہلاتی تھی۔ عبد اللہ (ابوالخیر) اسی مسجد میں رہتا تھا اور والد صاحب کا ہجولی تھا اور دوسرے سید عبداللہ جن کا تعلق حویلیاں (ہزارہ) سے تھا' انہوں نے ایبٹ آباد سے نویں جماعت پاس کر کے میٹرک کے لیے لاہور میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی دروازہ میں داخلہ لیا۔ یہ 1920ء کے اپریل کا واقعہ ہے' لاہور میں انہوں نے اپنے چچا سید لال شاہ کے ہاں جو سریانوالہ بازار کی مسجد کے امام تھے' قیام کیا۔ اگلے سال وہ مدرسہ رحمانیہ جس میں مولانا غلام مرشد عربی اور منطق پڑھاتے تھے داخل ہوئے۔ اس کے بعد مولانا احمد علی کے قرآن وحدیث کے درس میں شریک ہوتے گئے۔ دوسرے سال سید عبداللہ کے چچا نے انہیں اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ کے نامور ہیڈ ماسٹر شیخ محمد دین سے انگریزی اور دینی علوم کے لیے مسجد چینیاں والی میں داخل کرا دیا۔ خواجہ عبدالوحید لاہور کے بھاٹی دروازہ کے اندر تحصیل بازار میں محلہ "بھڑیاں بھابھڑیاں" میں للی لاج (Lily Lodge) میں خواجہ کریم بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ سے میٹرک کیا اور 1924ء میں اے جی آفس میں ملازم ہو گئے۔ مولانا احمد علی کے درس میں باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے۔ 1928ء میں ابوالخیر عبد اللہ' سید عبد اللہ اور خواجہ عبدالوحید نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔

جون 1939ء میں انجمن "خدام الدین" نے لاہور سے پندرہ روزہ انگریزی اخبار "اسلام" جاری کیا اور خواجہ اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ انگریزی حکومت پر اس اخبار میں شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ خواجہ سرکاری ملازم تھے اس لیے بہ حیثیت ایڈیٹر خواجہ محمد رشید وائیں کا نام شائع ہوتا تھا۔ وائیں صاحب لاہور کی آسٹریلیا فیملی کے سربراہ تھے اور دینی تحریکوں میں بڑے سرگرم رہتے تھے۔

عبداللہ بٹ بنام عبداللہ ملک

1939ء میں جب میں اسلامیہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا تو دادا کے کہنے پر ابوالخیر عبداللہ سے میں نے فارسی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ بی اے کے امتحان کے بعد عبد اللہ بٹ اسلامیہ کالج کو خیرباد کہہ گئے تھے۔ اب وہ زیادہ وقت آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جس کا مرکزی دفتر انہوں نے اپنے گھر 13۔ برانڈرتھ روڈ پر بنا رکھا

تھا' وہیں پر گزارتے تھے۔
اسلامیہ کالج میں کریسنٹ کے اردو سیکشن کی ادارت ہو یا آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی جنرل سیکرٹری شپ اس کے پیچھے عبداللہ بٹ کا بڑا عمل دخل تھا۔ لیکن میں نے کریسنٹ کے مدیر اور آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا جس کے متعلق شاید عبداللہ بٹ نے سوچا نہ ہو۔ شاید اس کا خیال ہو کہ میں فیڈریشن کا کٹھ پتلی جنرل سیکرٹری ثابت ہوں گا لیکن بہت جلد میرے سیاسی نظریات اور سیاسی دوستیاں کھل کر سامنے آنے لگیں جس کی وجہ سے عبداللہ بٹ مجھ سے دور ہو تا گیا۔

عبداللہ بٹ میرا ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا۔ عرب ہوٹل سے نگینہ بیکری تک ادیبوں' شاعروں' صحافیوں اور دانشوروں میں اس کا عام چرچا تھا۔ بے ساختہ جملہ چسپاں کرنے کی اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس مہارت نے اسے بڑا نقصان پہنچایا۔ اس کے بڑے دوست' دشمن بن گئے۔ عبداللہ بٹ عوامی سیاست جسے ہم جوڑ توڑ یا اقتدار کی سیاست کہتے ہیں اس کا بڑا سرگرم رکن تھا۔

شورش کاشمیری گرفتار ہو کر جب جیل پہنچتا ہے تو وہاں سے مجھے پہلے پہل 10 اکتوبر 1939ء کو خط لکھتا ہے۔ نومبر میں میری کتاب "سرمایہ داری" شائع ہو کر آتی ہے تو اس پر خواجہ عبدالوحید ایسے جید عالم انگریزی میں تبصرہ کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات حوصلہ افزائی کے ساتھ میری سرپرستی کی بھی دلیل ہے۔ ان دنوں عبداللہ بٹ کا رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ 15 دسمبر کے خط میں شورش کاشمیری میری کتاب "سرمایہ داری" کے متعلق رائے دیتے ہیں جبکہ عبداللہ بٹ کے 15 دسمبر 1939ء کے خط میں جو لکھا ہے' ملاحظہ ہو۔

پیارے عبداللہ!

"یہ خط آپ کے لیے یقیناً تعجب کا باعث ہو گا لیکن مجھے اس کے لکھنے پر کوئی تعجب نہیں کیونکہ یہ میری آخری گستاخی ہو گی۔ امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ مجھے معلوم نہیں میں کیا لکھوں گا اور نہ ہی اس خط کے لکھنے کی ضرورت میرے ذہن میں واضح ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ شاید دو تین صفحے سیاہ کرنے کے بعد مجھے نیند آ

سکے گی۔ اس وقت آدھی رات بیت چکی ہے۔ میرے ذہن میں ہولناک تصاویر گھوم رہی ہیں۔

مجھے نہ تو زبان دانی کا دعویٰ ہے نہ اہل قلم ہونے کی غلط فہمی' غلط سلط ہندوستانی میں جو کچھ بن پڑا لکھوں گا۔

مجھے محض زیب داستان کے لیے تو کچھ لکھنا نہیں البتہ ایک دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔ خود اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ کہیں حضرت آدم کے قصے کا اعادہ نہ ہو جائے اور مجھے بھی یہ مصرع پڑھ کر کوچہ چابک سواراں سے بھاگنا نہ پڑے۔

بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

یہ خدشہ اس لیے پیدا ہوا کہ اگر ملک صاحب کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ریلوے روڈ پر کھڑے ہو کر رات کے گیارہ بجے لوگوں کو اکٹھا کر کے گالیاں سنا سکتے ہیں اور اپنی پوری قوت گفتار کو استعمال کر سکتے ہیں اور نہایت فصیح و بلیغ قسم کی مرغن صلواتیں سنا سکتے ہیں اور ان کی طاقت لسانی یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ فلیمنگ روڈ اور برکت علی روڈ اور پھر موچی گیٹ تک اس "وعظ" کو جاری رکھ سکتے ہیں تو پھر یہ کیوں ممکن نہیں کہ وہ میرے پیچھے لٹھ لے کر کوچہ چابکسواراں سے ہوتے ہوئے مجھے اپنے گھر تک پہنچا جائیں کیونکہ بزرگوں کا قول ہے کہ برے کو اس کے گھر تک پہنچانا چاہیے' ورنہ مجھے آپ کی مہمان نوازی' بلند اخلاقی' خوش طبعی اور وسیع ظرفی کا یقین ہے بلکہ اگر حقیقت کہوں تو وہ یہ ہے کہ میں آپ کی مہمان نوازی اور نوازشات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا۔ یہ آپ کی بندہ پروری تھی جس کے لیے میں آپ کا بہت ہی شکر گزار ہوں۔ کاش کہ میں بھی اس قابل ہوتا کہ آپ کی نوازشات کا شافی و کافی جواب دے سکتا۔ ہماری دوستی تو ایک حادثہ تھی لیکن اس کی انتہا ایک سانحہ ہے۔ شاید اس سے بڑھ کر اور کوئی آفت یا عذاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب اس کا فائدہ؟ رونے سے موت زندگی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ میں خود آپ کو کھو چکنے کے بعد حاصل نہیں کر سکتا۔ حاصل کیا بھی تو نتیجہ کیا ہو گا؟ یہ آپ خود جانتے ہیں۔

اگر ہم دوستی کو ایک منزل قرار دیں اور دو مخلص دوستوں کو اس منزل تک پہنچانے والے مسافر سمجھ لیں تو پھر ہماری انتہا بہت بری نہیں رہتی۔ آج کل ترقی کا

زمانہ ہے چلنے پھرنے' بولنے چالنے' کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے اور سوتے جاگتے میں ترقی ہو چکی۔ لوگ مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طے کرنے لگے۔ ہاتھ کی لڑائی کی جگہ بندوق نے لے لی۔ اس ترقی سے ابھی تک دوستی کا میدان خالی تھا چنانچہ ہم نے یہ چیز یہاں بھی رائج کر دی ہے اور سالہا سال کی مسافت کو مہینوں میں طے کر لیا ہے۔

میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں کہ مذاق مذاق میں کچھ ایسی باتیں زبان سے نکل گئیں جن پر کوئی شریف آدمی فخر نہیں کر سکتا۔ آپ کے امتحان کے دن ہیں اور آپ کو طویل خط لکھنا اس وقت ایک اخلاقی جرم ہے اس لیے میں اس پر اکتفا کرتا ہوں۔

آپ سے یہ درخواست ضرور ہے کہ آپ مجھے اس چیز کی اطلاع دیں کہ آپ نے میری گزشتہ فروگزاشتوں کو نظرانداز کر دیا ہے تاکہ میرے دماغ سے ایک بھاری بوجھ دور ہو سکے۔ میں ہوں آپ کا عبداللہ بٹ (جسے کبھی آپ کی دوستی کا شرف حاصل تھا)
ڈھائی بجے صبح...

پانچ دن کے بعد ایک اور خط لکھا۔

20 دسمبر 1939ء

پیارے عبداللہ... سلام ممنون!

"انگریزی میں ایک خط لکھ کر ضائع کر چکا ہوں۔ ارادہ تھا کہ خط نہ لکھتا مگر اس ڈر سے کہ کہیں غلط فہمیاں بہت نہ بڑھ جائیں یہ خط روانہ کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں آپ کے خلاف مختلف قسم کی باتیں کر رہا ہوں' یہ بہت بڑا بہتان ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ میری اور آپ کی دوستی پہلے پہل سیاسی عقائد کی وجہ سے تھی بعد میں یہ سیاسی دوستی روحانی دوستی بھی ہو گئی اور میرا خیال تھا کہ اب ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے سیاسی اختلافات کے باوجود بھی یہ دوستی قائم رہ سکتی ہے۔

میں شروع میں یہ سمجھتا رہا کہ سائیکل کا واقعہ بس اسی رات تک رہے گا۔ صبح کو ہم پھر ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ مگر دوسری رات جب میں' سید عبداللہ صاحب اور مولوی ابوالخیر صاحب اور خواجہ صاحب ایک مشاعرے سے واپس آ رہے تھے کہ خواجہ صاحب نے مجھے کہا کہ آپ فیڈریشن کی طرف سے ایک بیان شائع کریں۔ اس پر

ابوالخیر صاحب نے فرمایا کہ اب عبداللہ ملک سے ضرور پوچھ لیا جائے کیونکہ اب وہ پہلی سی بات نہیں ہے۔ ورنہ عبداللہ ملک ناراض ہو جائے گا۔ اس فقرے سے میں تمام واقعہ سمجھ گیا اور جب خواجہ صاحب نے کہا کہ عبداللہ ملک خود کہا کرتے ہیں کہ بٹ سے لکھوا لیا جائے تو اس میں حرج کیا ہے' تو اس پر بھی ابوالخیر نے کہا آپ نہیں جانتے آپ عبداللہ ملک سے ہی بیان لکھوائیں۔ جہاں تک فیڈریشن کا تعلق ہے میں نے حتیٰ المقدور اس کی خدمت کی۔ مجھے نہ تو اس سے کوئی مالی فائدہ پہنچا اور نہ پہنچنے کی توقع تھی۔ یہ تو محض اس لیے تھا کہ میں فیڈریشن کا سیکرٹری رہ چکا تھا۔ یہ محبت کی محنت تھی جو ہمیشہ رائیگاں جاتی ہے۔ میں تو شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے یہ چیز کہہ کر مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔

دوسرے جو غلط فہمی ہے کہ میں آپ کے متعلق باتیں کہتا ہوں یہ بھی غلط ہے۔ میں اس قسم کی حرکت کو کمینہ پن سمجھتا ہوں۔ دوستی آپ کے اور میرے درمیان ایک معاہدہ تھا جسے ہماری باہمی محبت والفت نے قائم رکھا۔ اب وہ معاہدہ ٹوٹ چکا ہے' ہم اس پر قائم نہیں رہے۔ اس میں دوسروں کو دخل دینے کی ضرورت ہی کیا ہے! یہ ہمارا ذاتی فعل ہے اور ہم انفرادی طور پر اس کے ذمہ دار ہیں۔ باقی رہا پروپیگنڈہ کا معاملہ تو یہ لوگ کرتے رہیں گے۔ مجھے آپ کی طرف سے بدگمان کیا جائے گا اور آپ کو میری طرف سے۔ افسانے گھڑے جائیں گے۔ کہانیاں آپ کو سننا پڑیں گی۔

میں تو آپ کو اپنی طرف سے یقین دلا سکتا ہوں کہ اس رات کے واقعہ سے پہلے میرے اور آپ کے جو تعلقات تھے وہ اگرچہ ختم ہیں لیکن ان کی روح باقی ہے اور ہمارے جدا ہونے سے میرے نزدیک آپ کی عزت اور محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پہلے ان چیزوں کا اظہار ہوا کرتا تھا' اب نہیں ہو گا۔ بس یہی فرق ہے۔ آپ کو معلوم ہے صفدر صاحب سے میری خاصی دوستی تھی۔ اس کا جو حشر ہوا وہ بھی آپ پر واضح ہے کہ جب صفدر صاحب پھر آئے اور انہوں نے مجھے تمام قصہ سنایا تو معلوم ہوا کہ "یاران طریقت" کا اس میں ہم دونوں سے زیادہ حصہ تھا۔

ہماری محبت اگرچہ عرب ہوٹل کی ایک ہی نشست میں ختم ہو گئی لیکن انجام محبت میں بھی تو وہی کیف و مستی ہے جو آغاز محبت میں ہوا کرتی ہے۔

اب میں دوستی کے سب دروازے بند کر رہا ہوں میرا ارادہ ہے کہ اب زندگی بغیر دوستی کے بسر ہونی چاہیے۔ حقیقت میں تنہائی کی لذت دوستی کے لطف سے کہیں زیادہ ہے۔ امید ہے کہ آپ میری ذہنی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے خط کی ادبی غلطیوں کو نظرانداز کر دیں گے۔

یکے از رفتگان

عبداللہ بٹ!

شورش کاشمیری اور عبداللہ بٹ کے خطوط میں یہ دوستی کے دو مختلف رویئے تھے جس کا مجھے ان دنوں سامنا تھا۔ شورش کاشمیری نے اپنے پندرہ دسمبر اور پھر بیس دسمبر کے خطوط میں مجھے ذوق تصنیف و تالیف کو جاری رکھنے کو کہا لیکن 9 جنوری کے طویل خط میں جس طرح انہوں نے میری دوستی کے جواب میں اپنی دوستی کے جذبات کو الفاظ دیئے یہ انہی کا کام تھا۔ اس کے ساتھ اس نے مجھے پڑھائی کے ساتھ اپنے گھر کی ذمہ داریاں خاص کر کے والدہ محترمہ جو ان دنوں بیمار تھیں اور پھر دادا جان کے بڑھاپے کی طرف خاص توجہ دلائی اور مجھے ایک مخلص دوست کی طرح مشورہ دیا کہ تم اگر کچھ عرصہ کے لیے مجھے بھول جاؤ تو یہ کوئی ہرج کی بات نہیں۔

میرداد

فروری میں شورش کاشمیری جب منٹگمری سنٹرل جیل میں منتقل ہوا تو منٹگمری جیل میں ایک نوجوان سیاسی قیدی میرداد اور اس کے اشتراکی نظریات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میری کتاب "سرمایہ داری" اسے بہت پسند آئی۔

میں منٹگمری جیل میں شورش کاشمیری سے ملاقات کے لیے گیا تو جیل حکام کی اجازت سے میرداد سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے کے خدوخال اور وضع قطع نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ گورا چٹا رنگ، بھورے بال، گھنی لمبی داڑھی جس کی دیکھ بھال بھی خاص طور پر کی گئی تھی، بلوری آنکھیں اور مجسمہ عیسیٰ کے مانند اگر اس قیدی کی کوئی تصویر ہوتی تو میری اس بات کی تصدیق کر دیتی۔

میرداد سے میں جیل کے دفتر میں کوئی آدھ پون گھنٹہ مصروف گفتگو رہا۔ اس کا لہجہ

نہایت دھیما اور محبت سے بھرپور تھا اس لیے اس کی گفتگو دل میں اترتی جارہی تھی۔ وہ پٹھانی اردو بول رہا تھا' اگرچہ یہ ملاقات بہت مختصر اور ہنگامی تھی مگر اس کی کشش بے پایاں تھی۔

میں مارکسزم سے بھی نہ صرف مانوس بلکہ متاثر ہو چکا تھا اور اس کے لیے تھوڑا بہت عملی کام بھی کر رہا تھا۔ کمیونسٹ حلقوں میں بھی میرا اٹھنا بیٹھنا تو پہلے سے ہی تھا۔ فیروز الدین منصور اور فضل الٰہی قربان سے نہ صرف عزیزداری تھی بلکہ وہ میرے والد کے سکول کے ساتھی اور دوست تھے۔

میرداد سے ملاقات کے بعد اس کی ذات اور اس کے کردار کی چمک اور عمل کی پختگی نے مجھے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا کیونکہ میرداد کمیونسٹ تحریک کے لیے ہندوستان میں خفیہ طریقہ سے پہنچا تھا اور آتے ہی کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ کیا۔

کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون تھی۔ کانگرس میں کمیونسٹ ویسے تو شریک تھے لیکن اس کی سرمایہ دار قیادت اور کمیونسٹوں اور ان کے حامیوں میں زبردست کشمکش جاری تھی اور یہ مٹھی بھر کمیونسٹ ہی تھے جو کانگرس کی قیادت اور گاندھی جی کے خلاف سینہ سپر تھے اور کانگرسیوں نے بھی وزارتیں سنبھالتے ہی سب سے پہلے کمیونسٹوں کو ہی مشق ستم بنایا۔ کمیونسٹوں کے خلاف مہم میں خود گاندھی جی بھی شریک ہو گئے' اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ بات بالکل صاف ہے کیونکہ ہندوستان کا بورژوا طبقہ ان کی طاقت اور مقبولیت سے پریشان ہو رہا تھا اور وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کانگرس کے اندر کمیونسٹوں اور ان کے ہم خیال لوگوں کی آواز روز بروز زیادہ سے زیادہ دھیان سے سنی جانے لگی ہے۔

امرتسر میں کسان کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی صدارت مشہور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر اشرف کے ذمہ تھی۔ وہ کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے تو مقامی منتظمین نے میرداد کو جو وہاں کرتار سنگھ کے نام سے شامل ہوا' صدارت کے لیے کہا کرتار سنگھ (میرداد) جونہی اسٹیج پر آئے تو پولیس کی بھاری تعداد نے کانفرنس کے پنڈال کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہوتے ہی کرتار سنگھ (میرداد) کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ

لاہور میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ تین ماہ تک قید رہا۔ اس دوران پولیس تشدد کے باوجود صرف اس کے نام کے سوا کوئی بھی بات نہ اگلوا سکی۔ بالاخر تنگ آ کر اسے شاہی قلعہ سے نکال کر اس کو اس کے آبائی گاؤں میں نظر بند کر دیا۔

میرداد اس چھوٹے سے گاؤں میں جس کا نام "ملو" تھا پیدا ہوا۔ یہ وہی علاقہ ہے جو "چھچھ" کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں خدائی خدمت گار تحریک اور عبدالغفار خان کے نام لیوا بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ میرداد کا والد بہت چھوٹا کسان تھا اور یہ کنبہ بھی مختصر تھا۔ ایک مختصر سا کچا مکان اور دس کنال چاہی اراضی تھی جس پر اس خاندان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ میرداد کے باپ کا دل پسند مشغلہ بٹیر پکڑنا اور انہیں پالنا تھا۔ یہ مشغلہ اس کی آمدن کا بھی ذریعہ تھا جس سے ان غریب کسانوں کے نمک مرچ کا گزران ہو جاتا تھا۔

میرداد نے اپنا بچپن اسی ماحول میں اور اسی دھندلکے میں گزارا۔ وہ باپ کا ہاتھ کھیتی باڑی میں ہی نہیں بلکہ بٹیر کے شکار اور ان کی فروخت میں بھی بٹاتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت بصد مشکل بارہ تیرہ سال ہوگی۔ ایک دن اس کے باپ نے میرداد کو دن بھر کے شکار کیے ہوئے بٹیر تحصیل حضرو میں فروخت کرنے کے لیے بھیجا۔

میرداد یہ بٹیر لے کر حضرو روانہ ہوا۔ راستے میں وہ کھیلتا کودتا جا رہا تھا کہ اس کو خیال آیا کہ یہ حساب تو لگا لیا جائے کہ ان میں کتنے بٹیر نر اور کتنے مادہ ہیں۔ اس غرض سے اس نے تھیلے کا منہ کھولا' اور اس میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ پانچ بٹیر پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ بس پھر کیا تھا' میرداد کے اوسان خطا ہو گئے۔ بارہ تیرہ سالہ میرداد کی آنکھوں کے سامنے باپ کے جبر و قہر کا نقشہ گھوم گیا۔ میرداد کو آناً فاناً فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ واپس جا کر باپ کے غصے اور پٹائی کو برداشت کرے یا اس طرف کا کبھی رخ نہ کرے۔ اس ننھی سی جان نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو لامتناہی تلخیوں اور محرومیوں کے وسیع سمندر کے حوالے کر دیا۔ اس طرح باقی ماندہ بٹیر فروخت کر کے گاؤں واپس جانے کے بجائے کیمبل پور کا رخ کیا۔

کیمبل پور حضرو سے قریباً سولہ سترہ میل کے فاصلے پر تھا' بارہ برس کا یہ بچہ اپنی پہلی طویل مسافت پر پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔ یہ اس کی پہلی بغاوت اور پہلی عظیم ابتلا و

آزمائش تھی۔ اپنے سفر کے دوران اسے پہلی بار ریل کی پٹڑی نظر آئی۔ وہ اس کی سیدھ پر چلتے چلتے آخر کیمبل پور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ پہلی بار اس نے ریل گاڑی کو رواں دواں دیکھا تھا۔ اسٹیشن پر سواروں کی آمدورفت دیکھ کر وہ مبہوت رہ گیا۔ بالاخر وہ بھی ایک گاڑی پر سوار ہو گیا۔ یہ ننھا مسافر اپنی منزل سے بے خبر حیران و پریشان اسی چلتی گاڑی کی روانی کو محسوس کر رہا تھا' کبھی وہ اردگرد کے مسافروں دیکھتا اور کبھی گاڑی کی تیز رفتاری کو' اس وقت اگر اسے کوئی خوف تھا تو وہ صرف ایک کہ سخت گیر باپ کہیں اس کو یہاں پہنچ کر پکڑ نہ لے' اس ننھے مسافر کو ابھی ٹکٹ کلکٹر کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کو گاڑی میں کوئی سیٹ نہ ملی چنانچہ وہ اس سہولت سے بے نیاز سیٹ کے نیچے ڈبے کے فرش پر ہی پڑ کر سو گیا۔ اس نے قریباً بہتر گھنٹے بغیر کچھ کھائے پیئے اس گاڑی میں گزار دیئے۔ گاڑی جب بمبئی پہنچی تو اس وقت بھی میرداد نشست کے نیچے سو رہا تھا۔ بالاخر صفائی کرنے والے عملے نے اسے جگا کر ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا۔

پولیس نے اس بھوکے پیاسے بارہ سال کے خوبرو پٹھان لڑکے کو روٹی کے بجائے بیٹروں کی فروخت کی حاصل کی ہوئی پونجی سے محروم کر کے ریلوے سٹیشن سے باہر نکال دیا۔

اس طرح میرداد بمبئی ایسے وسیع و عریض شہر اور انسانوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کبھی وہ برتن مانجھ کر اپنا پیٹ پالتا' کبھی بوٹ پالش کر کے اور کبھی ہوٹلوں کے باہر پھینکے ہوئے چاول اور چپاتیوں کے ٹکڑوں پر اپنی گزر بسر کرتا۔ بہرحال اس ماحول نے اسے بڑا سخت جان بنا دیا اور وہ وقت سے پہلے جوان ہونے لگا۔ جیسے جیسے وہ اپنی رگوں کو جوان ہوتے دیکھتا ویسے ہی وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا۔ اس طرح اس نے اس شہر کے حسن و دلفریبی سے بے نیاز محنت و مشقت کی سختیاں جھیل کر پانچ برس گزار دیئے لیکن ان پانچ برسوں میں اس نے گھر جانے کا کبھی خیال تک نہ کیا۔ اسے صرف ماں کی یاد آتی۔ اس کی شفقت' اس کا پیار لیکن باپ کی سخت گیری کے سامنے یہ ساری شفقت اور ماں کی ممتا اوجھل ہو جاتی۔ باپ کا خوف اسے ہر لمحے ڈراتا رہتا۔ اسے ہر وقت صرف یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اگر کسی واقف کار نے اسے دیکھ لیا تو وہ اسے پکڑ کر

فوراً گاؤں بھیج دے گا۔ اسی خوف میں اس نے پورے پانچ برس گزار دیئے۔ اب وہ سولہ سترہ برس کا نوجوان تھا۔ سرخ و سپید رنگ' بلوری آنکھیں' بھورے بال یہ سب اسے پرکشش بنا رہے تھے۔ یہ پٹھان نسل کی عام خصوصیات ہیں۔ انہی خصوصیات کی بنا پر اس کو کچھ دوسرے نوجوان پٹھانوں نے ایک بحری جہاز پر جو امریکہ جا رہا تھا' کوئلہ ڈالنے کے کام پر بھرتی کروا دیا۔ اس طرح سے کیمبل پور کے پسماندہ ضلع کی ایک تحصیل حضرو کے ایک گاؤں کا غریب کسان بچہ کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ جب یہ بحری جہاز امریکہ کی ایک بندرگاہ پر پہنچا جہاں جہاز نے پندرہ دن قیام کرنا تھا' میرداد حجامت بنوانے کے لیے بندرگاہ سے نکل کر ایک حجام کی دکان پر پہنچا۔ حجام لڑکی نے جب میرداد سے پوچھا تم آئرلینڈ کے باشندے ہو یا اطالیہ کے؟ تو میرداد نے بے دھڑک جواب دیا "میرا آئرلینڈ سے تعلق ہے نہ اطالیہ سے۔ میں خالص ہندوستانی ہوں۔"

یہ سنتے ہی اس گوری حجام لڑکی نے میرداد پر ٹھڈوں اور ٹھوکروں کی بارش برساتے ہوئے اسے دکان سے باہر نکال دیا۔ میرداد بڑا حیران ہوا۔ اپنی حیرانی میں گم ایک پارک میں جا بیٹھا۔ اسے بہت جلد نیند آ گئی۔ یکلخت بچوں کے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خواب دیکھتے ہوئے اپنے گاؤں پہنچ گیا لیکن یہاں کھیتوں کے بجائے سرسبز میدان ہیں جہاں بچے کھیل ہیں اور اپنی مادری زبان پنجابی بول رہے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد اسے ایک شخص جو سکھ تھا یقین دلا رہا تھا کہ وہ اس وقت امریکہ ہی کے ایک پارک میں ہے اور یہ بچے اس لیے پنجابی بول رہے ہیں کہ ہم پنجاب سے یہاں روٹی روزگار کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

میرداد نے اس سکھ خاندان کو اپنی ساری "رام کہانی" سنائی اور آخر میں اس گوری حجام عورت کی مارپیٹ کا قصہ اس لیے سنایا کہ آخر اس حرامزادی نے مجھے کیوں پیٹا اور میری حجامت بھی نہیں بنائی۔ سکھ نے اسے بتایا کہ تم ہندوستان کے باسی ہو جو برطانیہ کا غلام ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کے برابر کیسے ہو سکتا ہے! تم عزت کے تبھی قابل ہو گے جب تم غلامی کو "آزادی" میں تبدیل کر دو گے۔

یہ 27-1926ء کا زمانہ تھا۔ اس سکھ کا تعلق غدر پارٹی کے مارکسی گروہ سے تھا۔ یہ لوگ کیلیفورنیا اور دوسرے علاقوں میں کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہ متمول لوگ تھے'

چنانچہ انہوں نے میرداد کو بحری جہاز کی مزدوری سے نکال کر پھر کھیتی باڑی میں شریک کر لیا۔ ساتھ ساتھ اس کی سیاسی تعلیم بھی ہونے لگی۔ مارکسی تعلیمات ہی نہیں بلکہ عمومی تعلیم بھی میرداد نے حاصل کرنا شروع کر دی۔ انگریزی کے ساتھ پنجابی (گورمکھی) بھی پڑھنے لگا۔

انگریزی سیکھنے کے بعد اس پر نئی دنیا کے دروازے کھل گئے۔ ان نئے دروازوں کے وا کرنے میں امریکہ میں بسنے والے ان سکھوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا اور یہ سچ ہے کہ یہ ماجھے اور دو آبے کے سکھ ہی تھے جنہوں نے متحدہ پنجاب میں کمیونزم کا پرچم بلند کیا۔ یہ سکھ ہی تھے جنہوں نے غدر پارٹی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور 1913ء سے ہندوستان کی آزادی کے لیے روپیہ فراہم کرتے رہے۔ یہی غدر پارٹی کے نمائندے تھے جنہوں نے بہت حد تک کمیونزم کو قبول کیا اور اس کو پنجاب کے جاٹوں میں مقبول بنانے میں بھرپور کوشش کی' چنانچہ یہ تھا وہ گروہ جس کی وساطت سے میرداد کمیونزم کی طرف مائل ہوا۔ اس نے ان سکھوں کے ساتھ چار پانچ برس کیلیفورنیا میں گزارے اور پھر پاؤں کا چکر اسے دنیا کے دوسرے ممالک میں لے گیا۔ غدر پارٹی کے انقلابیوں کے تعارفی خطوط اس کے بہت کام آئے ہوں گے کیونکہ وہ فرانس میں بھی رہا اور وہاں مزدور تحریک میں حصہ لیتا رہا۔ اسی طرح انگلستان میں بھی کچھ دیر قیام کیا۔ بالآخر سوویت روس میں چار پانچ برس تک زیر تعلیم رہا اور وہیں اس نے انقلابی کام کیا اور اس کے داؤ پیچ سیکھے۔

ایک سال وہ چین میں بھی رہا جہاں اس نے چینی کمیونسٹ قیادت کو قریب سے دیکھا حتیٰ کہ ماؤزے تنگ سے بھی ملا۔ میرداد گرفتار ہو کر جب پورے بارہ برس کے بعد گاؤں میں داخل ہوا تو گاؤں کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا۔ بڑھاپے اور بیوگی نے ماں کی کمر دہری کر دی تھی' فاقوں نے اس کے چہرے پر جھریاں ڈال دی تھیں۔ میرداد کی طویل جدائی نے اسے قریب المرگ کر دیا تھا۔

میرداد نے آہستہ آہستہ گاؤں میں سیاسی کام کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے کسانوں کی تنظیم بنائی اور اپنے علاقے کے کئی زمیندار خاندان جو شمس آبادی ملکوں اور کھٹڑ سرداروں کے تھے ان کے دبدبے اور رعب کو کھوکھلا کیا۔ انہوں

نے سرکار دربار میں میرداد کے خلاف رپورٹیں بھیجنا شروع کیں۔ ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر ٹیلر نے احکام صادر کر دیئے کہ جیسے ہی میرداد رات کو گاؤں سے باہر قدم رکھے اسے گرفتار کرلیا جائے۔ ضلع حکام نے حضرو تھانہ کے انچارج سے کئی بار کہا کہ نظر بندی کی خلاف ورزی کے جرم میں مقامی گواہ تلاش کرکے میرداد کو گرفتار کرلیا جائے مگر پولیس کو میرداد کے خلاف گواہی کے لیے ایک بھی کارندہ نہ مل سکا۔ آخر کار میرداد سرکاری مخبروں کے ذریعے گرفتار ہو کر ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیلر کے سامنے پیش ہوئے جنہوں نے انہیں اٹھارہ ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی۔ میرداد کو سیدھا کیمبل پور جیل بھیج دیا گیا لیکن جیل کے حکام کو میرداد کے حوصلوں اور ولولوں کا علم تھا' اس لیے انہوں نے میرداد کو کسی دوسری جیل میں منتقل کرنے کی درخواست کی۔ اس طرح میرداد کو پنجاب کے "کالا پانی" یعنی منٹگمری جیل بھیج دیا گیا۔

خاکسار علامہ المشرقی

لاہور اس وقت مجلس احرار کے سرخ پوشوں اور اتحاد ملت کے نیلی پوشوں کے سیاسی تصادم کے ساتھ ساتھ کانگرس اور یونینسٹ پارٹی کے سیاسی پینتروں کے بعد خاکساروں کی "چپ راست" کی زد میں تھا۔

خاکسار تحریک کے بانی علامہ المشرقی کی رعب دار داڑھی' دراز قامت' قراقلی ٹوپی' خاکی شلوار قمیص کی وردی اور کندھے پر بیلچے والی شخصیت اس قدر متاثر کر رہی تھی کہ دیکھتے دیکھتے لاہور کے گلی کوچوں میں نوجوان ہی نہیں بوڑھے اور بچے بھی خاکی رنگ کی وردیاں سلوانے اور بیلچے خریدنے کے ساتھ سرشام گلی کوچوں میں چپ راست چپ راست (پریڈ) بڑے منظم طریقے سے کرتے دکھائی دینے لگے۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے عوام جنگ کی نئی صورتحال سے باخبر ہو رہے تھے۔ یورپ میں ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی کے جیالوں کی فوجی پریڈ کی تصویریں بھی روزانہ اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی یورپ میں برطانیہ کو للکار رہی تھی۔ ہندوستان میں وہ عوام جو برطانوی سامراج سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے' ان کے لیے ہٹلر اور اس کی نازی

پارٹی یورپ میں ایک مثالی کردار ادا کر رہے تھے' چنانچہ اس طرح ہندوستان میں ایسی سیاسی تنظیم کی سخت ضرورت تھی۔ خاکسار تحریک نئی سیاسی صورتحال میں ہندوستان کے تمام صوبوں خاص کر کے سرحد اور پنجاب میں بے حد اثرانداز ہوئی۔

خاکسار تحریک اگرچہ غلبہ اسلام کا نعرہ لگاتی تھی' لیکن اس کا اسلام ان روایتی مولویوں اور ملاؤں ایسا نہ تھا' جن کی تحریکیں اور جماعتیں مختلف نوعیت کے چندوں کے ذریعے آگے بڑھتی اور منظم ہوتی تھیں' خاکسار تنظیم کے ہر کیمپ اور ہر پریڈ کے اخراجات منتظم اور کارکن خود برداشت کرتے تھے۔ اگرچہ خاکساروں کا کھانا پینا مشترکہ تھا' لیکن ان پر پابندی تھی کہ ہر خاکسار اڑھائی آنے سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔

خاکساروں کی اس حکمت عملی نے دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے کارکنوں کو بھی متاثر کیا کیونکہ ہر جماعت کے قائدین پر "چندہ خوری" کے الزامات عائد ہونا شروع ہوگئے تھے۔ مجلس احرار کے قائدین اور علما سب سے زیادہ ان الزامات کی زد میں آنے لگے۔ مجلس احرار پر چندہ خوری کا سب سے موثر حملہ یونینسٹ پارٹی پنجاب اور اس کے حامی اخبارات کر رہے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی پنجاب کے امراء اور جاگیرداروں کی پارٹی تھی اور انگریزوں کی زبردست حامی تھی' جب کہ مجلس احرار پنجاب میں انگریز دشمن اور امراء روسا اور جاگیرداروں کی زبردست مخالف تنظیم تھی' اس لیے مجلس احرار پنجاب کے دیہات اور شہروں کے نچلے درمیانہ طبقے میں سب سے مقبول جماعت تھی' جسے بہت جلد سیاسی عروج حاصل ہوا۔

مجلس احرار کے سیاسی عروج میں بعض اخبارات نے اس جماعت کی حمایت میں خاص نمبر بھی شائع کیے۔ مجلس احرار نے جب 1934ء میں قادیان میں احمدیوں کے خلاف اپنی پہلی کانفرنس منعقد کی تو روزنامہ "احسان" نے ایک خاص نمبر نکالا' جس کے پہلے صفحے پر مرتضیٰ احمد میکش کی تصویر شائع کی۔ یہ نمبر اس قدر مقبول ہوا کہ اخبار ایک ایک روپے میں فروخت ہوا لیکن بعد میں اسی اخبار نے شہید گنج تحریک کے دوران مجلس احرار پر چندہ خوری کے الزامات مسلسل لگانے شروع کر دیئے۔

مجھے یاد ہے کہ لاہور کے میونسپل کمیٹی کے انتخابات کے موقع پر اندرون موچی دروازہ محلہ شیعاں کی وارڈ میں مولوی مظہر علی اظہر امیدوار تھے۔ انتخابی مہم کے سلسلے

کے اجلاس میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تقریر کر رہے تھے کہ کسی منچلے نے آوازہ کس دیا۔ "پہلے چندے کا حساب دو۔" اس کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن نے نہایت پر اعتماد انداز میں کہا۔ "ہاں برخوردار ہم چندہ کھاتے ہیں۔ چندہ نہ کھائیں تو کہاں سے کھائیں' اس کے بدلے میں ہم تمہارا اور قوم کا کام کرتے ہیں۔ ملک کی آزادی کے لیے سربکف رہتے ہیں۔ اس کے صلے میں ہی قوم ہمیں چندہ دیتی ہے' جس سے ہم اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتے ہیں اور جماعت کا کاروبار بھی چلاتے ہیں۔ آپ بتائیں کیا ہم کوئی غلط کام کرتے ہیں؟

پنجاب میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے پنجاب مسلم لیگ کی قیادت سنبھال کر مسلم لیگ کو ایک روشن خیال جماعت بنانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں تصادم کی بنیاد 1936ء میں سر فضل حسین اور محمد علی جناح کے درمیان ہونے والی ملاقات سے پڑی۔ یہی وہ دور تھا' جب مسلم لیگ اور جناح نے مجلس احرار سے دوستی بڑھائی' لیکن ذاتی مفادات کے پیش نظر دیکھتے دیکھتے دونوں جماعتوں میں بعد پیدا ہونا شروع ہوا۔ عجیب دور تھا' اس کے بعد سکندر اور جناح پیکٹ بھی ہوا۔

خاکسار بھی اسی دور میں ایک طوفان کی طرح اکٹھے ہوئے اور پنجاب بلکہ سارے ہندوستان کو جنگ آزادی کے لیے متحرک کیا' لیکن خاکسار تحریک بالاخر مسلم لیگ اور جناح کی قیادت کے سامنے دم توڑ گئی اور اسی دور میں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت عوامی شخصیت میں تبدیل ہو گئی۔

1937ء کے انتخابات کے بعد ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے نو صوبوں میں کانگرس کی حکومت تھی' جبکہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی حکومت بنانے میں کامیاب ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں کانگرس والے عدم تشدد کی بات کرتے تھے' جبکہ انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد تیز کرنے والی کئی مسلم اور غیر مسلم سیاسی اور مذہبی جماعتیں تشدد کی حامی تھیں' بالخصوص طلبہ تنظیمیں!

خاکساروں میں ایک شدت تھی' وہ عدم تشدد کی نہیں "خدمت" کی بات کرتے تھے' لیکن خدمت کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار "مولوی" کے خلاف نعرے لگا کر کر لیتے

تھے۔ وہ ہٹلر کی تصویروں کی بھی پرستش کرتے' جرمن فاشسٹوں کے کیمپوں سے بھی متاثر تھے' اس لیے اس دور میں شمالی ہندوستان میں کم از کم مسلمانوں کی کوئی جماعت خاکساروں کے سامنے ٹھہرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

خاکسار جس طبقے کو متاثر کر رہے تھے' ان میں اعلیٰ سطح کے سرکاری ملازم اور اوپری طبقے کے زمیندار نہ تھے' بلکہ شہروں کے بے کار نوجوان یا پھر بہت چھوٹے دکاندار' آڑھتیوں کی دکانوں پر کام کرنے والے نیم خواندہ منشی اور بعض چھوٹے زمیندار جن میں جوان خون جوش مارتا تھا۔ ان میں بعض ایسے متمول اور کھاتے پیتے زمیندار بھی تھے' جنہوں نے غلبہ اسلام کے لیے اپنی "اراضی اور جائیدادیں" بیت المال کو دے ڈالیں۔ شہروں کے بے روزگار نوجوان علامہ المشرقی کی علمیت سے بھی متاثر تھے۔ ولائیت کا پڑھا لکھا سرکاری اعلیٰ افسری چھوڑ کر خاکی وردی پہنے کوچوں میں خاکساروں کے ساتھ خاک چھان رہا ہے' خدمت خلق' اخوت اور مساوات کا عملی ثبوت دے رہا ہے۔ اس تحریک میں سندھ کے جانے پہچانے تالپور خاندان کے میر علی احمد تالپور کی شمولیت اور حیدر آباد دکن کے نواب یار جنگ بہادر کی شرکت نے بھی بڑا تہلکہ مچا دیا تھا' پھر اس دور کے ابھرتے شاعرن۔ م۔ راشد کی اس تحریک سے وابستگی نے بھی اس تحریک کو بہت شہرت بخشی۔ اور تو اور جی۔ ایم۔ سید بھی کچھ دن اس تحریک سے وابستہ رہے "چپ راست" کرنے والے نوجوانوں کی ٹولیوں نے فوراً عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

فوجی وردی' ہتھیار کے طور پر بیلچہ' بازو پر خدمت خلق کا نشان' کوئی چندہ نہیں' سادگی اختیار کرو' مولوی کا اعتبار نہ کرو اور اس کے کہنے پر نہ چلو' بلکہ خود پر ایک "امیر" مقرر کرو اور اس کا ہر حکم بجالاؤ۔ "امیر" کے آگے کوئی دلیل نہیں۔ رضاکار کا کام صرف اس کے حکم کو بجالانا ہے۔

خاکسار تحریک بظاہر ایک غیر سیاسی تحریک تھی۔ صرف "خدمت خلق" ہی اس کا کام تھا' اس لیے اس تحریک نے دن دگنی رات چوگنی ترقی کی' منزلوں کو طے کیا۔ کم از کم پنجاب کے شہروں کے متعلق تو لوگوں کو یاد ہو گا کہ اس تحریک کی مخالفت میں لب کشائی مشکل بلکہ ناممکن تھی۔

خاکساروں کا نعرہ تھا کہ "خدمت خلق" کے ذریعے ہی اسلامی حکومت قائم ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہندوستان میں ہٹلر کی نازی جماعت کی عسکری پریڈ کی بڑی بڑی تصویریں تقسیم کرتے تھے۔ خاکسار تحریک کا ترجمان "الاصلاح" اپنے جذباتی اداریوں کے ذریعے خاکساروں کا خون گرماتا تھا۔ ہٹلر کی نازی جماعت کے پراپیگنڈہ سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ جس طرح ہٹلر نے جرمنی کو جنم دیا ہے' اسی طرح یہاں پر اسلامی حکومت کے لیے خاکسار تحریک کام کر رہی ہے۔

برطانیہ کے خلاف عوام میں جو نفرت پائی جاتی تھی' اسی جذبے نے ہٹلر کو عام لوگوں کا محبوب بنا دیا۔ خاکسار قائد نے خاکساروں اور نازیوں میں مماثلت کو نمایاں کرنے کے لیے اپنی ایک تصویر' جو انہوں نے ہٹلر کے ساتھ کھنچوائی تھی' 8-1937ء کے زمانے میں لوگوں میں تقسیم کی۔ خاکساروں کی "چپ راست" نے جہاں مسلمانوں کے دلوں میں سامراجی حکمرانوں کا خوف دور کیا' وہاں غیر مسلموں کے دل میں تشویش پیدا کر دی اور وہ خوف زدہ دکھائی دینے لگے۔ اس طرح ان کی بھی رضاکار جماعتیں متحرک ہونے لگیں۔ 1939ء میں دوسری جنگ عظیم نے ہندوستان کا سیاسی منظر نامہ یکدم تبدیل کر کے رکھ دیا۔

برطانوی حکومت ہندوستان میں کسی بھی جماعت کے رضاکاروں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی' بالخصوص پنجاب فوجی بھرتی کا سب سے اہم صوبہ تھا۔

تحریکوں کی بقا کے لیے نعروں کے ساتھ مثبت نقطہ نظر کی بھی ضرورت ہوتی ہے' بالاخر عوام کا کثیر طبقہ سیاسی مستقبل کے متعلق بھی سوچنے لگتا ہے۔ چنانچہ جس وقت جنگ کے بادل امنڈنے لگے' اور ہندوستان کی آزادی کی باتیں زیادہ واضح ہونے لگیں تو مسلم لیگ کی کامیابی اور مقبولیت بڑھنے لگی' کیونکہ ہر مسلمان کی زبان پر یہ سوال تھا کہ آزاد ہندوستان میں ہمارا کیا مقام ہو گا؟ یہ آئین کی بات تھی' اس لیے مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ مسلم لیگ کی طرف مائل ہونے لگا۔ اسے اپنی روزمرہ زندگی میں ہندو اکثریت کے ظلم و ستم سہنے پڑتے تھے' اس لیے جب لیگی رہنما اکثریت کے مظالم کی داستان بیان کرتے اور مسلمانوں کو الگ قوم بتاتے تو پڑھے لکھے مسلمانوں کو اپنے تجربے کی بنا پر بھی یہ بات اپیل کرتی۔ وہ اس بات پر متفق تھے کہ کانگرس اور برطانیہ سے نپٹنے کے لیے

ایک منظم اور متحدہ مسلم جماعت ضروری ہے اور یہ ضرورت صرف مسلم لیگ پوری کر سکتی ہے۔ چنانچہ روز بروز مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھنے لگی' لیکن یہ مقبولیت خاکساروں کے امیر کو ایک نظر نہ بھائی۔ جنگ کے بادل جب منڈلاتے دیکھے تو خاکساروں کے رہنما نے اپنے انداز اور نعرے فوراً تبدیل کر دیئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کسی طرح خاکساروں کو فوج میں بھرتی کروا کر برطانوی حکومت کو اپنا ممنون کریں گے اور اس طرح وہ حکومت سے اپنے حق میں چند اختیارات حاصل کریں گے۔ خاکسار تحریک کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ عوام کو مسلم لیگ کے اثرات سے محفوظ رکھیں' اس لیے انہوں نے اقلیت اور اکثریت کے نعروں کو ایک مختلف رنگ میں پیش کیا' کیونکہ مسلم لیگ مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم قرار دیتی تھی اور وہ اس طرح آزاد ہندوستان میں اس کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرنے کا کہتی تھی۔

خاکساروں کے امیر "المشرقی" نے اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے لیے مطالبہ کیا' تاکہ مسلمانوں میں مسلم لیگ کا اثر جو روز بروز بڑھ رہا تھا اسے زائل کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے یوپی میں کانگرس وزارت کے خلاف تحریک چلائی اور کانگرس حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا' لیکن چند روز بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ لاہور کے خاکسار اس پر بڑے اترا رہے تھے کہ کانگرس خاکساروں سے خائف ہے' اس لیے اس نے "المشرقی" کو جلد رہا کر دیا ہے۔ ہمارے محلے میں فتح دودھ دہی والے کی دکان خاکساروں کا گڑھ کہلاتی تھی۔ وہاں پر روزانہ سہ پہر کو خاکسار فالودہ پیتے اور گپیں لگاتے۔ میں جب بھی وہاں جاتا تو وہ مجھے "احراری" ہونے کے ناطے شہید گنج تحریک سے زچ کرتے اور میں بھی انہیں "المشرقی" کی کہہ مکرنیوں سے مشتعل کرنے کی کوشش کرتا۔ میں اخبارات کا باقاعدہ مطالعہ کرتا تھا' "المشرقی" کی یوپی میں کانگرس کے خلاف تحریک اور اس کی گرفتاری کے بعد رہائی کے متعلق خبریں شائع ہونے لگیں' ان خبروں میں یہ بھی تاثر دیا جا رہا تھا کہ المشرقی کی رہائی اس کے معافی نامے کی بدولت ہوئی ہے۔ جب میں یہ خبریں فتح دودھ دہی والے کو بتاتا تو وہ مجھے احراری ہونے کے ناتے جھوٹی افواہیں پھیلانے والا قرار دیتا۔ لیکن میں جب انہیں ان خبروں کے سچ ہونے کا یقین دلاتا تو کہتے' ہمیں کوئی ثبوت دو کہ "المشرقی" نے کانگرس سے معافی مانگ کر رہائی حاصل کی ہے۔ چنانچہ فتح

دودھ والے سے میری پانچ روپے کی شرط لگ گئی کہ میں انہیں ایک دو ہفتے میں ثبوت نہ دے سکا تو شرط کے ساتھ معافی مانگوں گا۔

دراصل میں کانگرس کی طرف سے شائع ہونے والے "خبرنامے" کے انتظار میں تھا۔ 1937ء کے انتخابات کے بعد جب کانگرس نے صوبوں میں وزارتیں قائم کیں تو میرا رابطہ آل انڈیا کانگرس کے مرکزی دفتر سے تھا جو انند بھون الہ آباد میں تھا۔ وہ مجھے اپنا ہفتہ وار یا پندرہ روزہ "خبرنامہ" باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے تھے' چنانچہ جب نیا "خبرنامہ" موصول ہوا تو اس میں "المشرقی" کی یوپی تحریک میں گرفتاری اور رہائی کی تفصیل شائع ہوئی' جس میں المشرقی کا معذرت نامہ بمع دستخط شائع ہوا۔ میں وہ "خبرنامہ" لے کر فتح دودھ دہی والے کی دکان پر چلا گیا۔ جب چند پڑھے لکھے خاکساروں نے اس خبر کی تصدیق کر دی تو فتح دودھ دہی والے نے شرط کے پانچ روپے ادا کرتے ہوئے کہا: "باؤ! شرط میں ہار گیا واں پر میرا دل مندا اے نہ دماغ۔" (بابو شرط تو میں ہار گیا ہوں لیکن میرا دل و دماغ اسے تسلیم نہیں کرتا۔)

اخبارات میں جب اس معذرت نامے کی عام تشہیر شروع ہونے لگی تو علامہ المشرقی نے نہ صرف اس معذرت نامہ سے انکار کر دیا' بلکہ دوبارہ کانگرس وزارت کے خلاف تحریک چلانے کے لیے یوپی پہنچ گئے' جہاں پر انہیں دوبارہ گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل میں ہی تھے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ علامہ المشرقی نے لکھنؤ جیل سے وائسرائے ہند کو تار بھیجنے کی کوشش کی۔ اس تار میں مادر وطن کی حفاظت کے لیے پچاس ہزار سپاہیوں (خاکساروں) کی بغیر شرط کے پیش کش کی گئی' جسے بعد میں پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔

اس پمفلٹ میں بعض دلچسپ چیزیں اور بھی تھیں' جن میں مختلف اخباروں کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ حکومت ہند اس پیش کش کو قبول کرنے کے حق میں ہے اور یہ بھی کہ پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات بھی حکومت ہند پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر کے خاکساروں کو علاقائی فوج میں شامل کر دے۔

اس پمفلٹ کی اشاعت سے غیر مسلموں اور ان کی فرقہ ورانہ جماعتوں میں اچھی خاصی تشویش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس کا پنجاب میں خاصا اثر ہوا اور دیکھتے دیکھتے کئی ایک

عسکری تنظیمیں ابھرنی شروع ہوگئیں اور پنجاب کے اکثر شہروں میں مختلف فرقوں اور قومیتوں کے جوان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر فوجی طرز کی پریڈوں میں مارچ کرتے نظر آنے لگے۔ پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں سکھوں کے نمائندہ سردار انوپ سنگھ نے ایک قلیل المہلت سوال پوچھا کہ کیا وزیراعظم اس امر پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ پنجاب میں فوجی طرز کی جو کئی ایک تنظیمیں قائم ہو رہی ہیں' ان کے نام کیا ہیں اور ان کی سرگرمیوں کے متعلق حکومت کی پالیسی کیا ہے۔

اس کے جواب میں وزیراعظم نے چودہ عسکری تنظیموں کے نام بتائے: (1) خاکسار' (2) جیش احرار اسلام' (3) اتحاد ملت' (4) اکالی سینا' (5) اکالی فوج' (6) شکتی دل' (7) اگنی دل' (8) راشٹریہ ایکتا دل' (9) گنتی دل' (10) مہابیر دل پنجاب' (11) پراونشل مہابیر دل' (12) مرکزی مہابیر دل (13) بجرنگ اکھاڑ (14) غازی فوج۔

پالیسی کے متعلق وزیراعظم سر سکندر حیات نے ایوان اسمبلی میں اعلان کیا کہ حکومت پنجاب ان تنظیموں کی سرگرمیوں کا بنظر غائر مطالعہ کر رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے متعلق اعلان کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد ہندو پریس میں خاکساروں کے خلاف پراپیگنڈہ اور تیز ہوگیا اور یہ جنگ ایک طرح سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی معلوم ہونے لگی۔ وزیراعظم پنجاب سر سکندر حیات نے خاکساروں کے قائد علامہ عنایت اللہ المشرقی کو ملاقات کی دعوت دی اور انہیں بتایا کہ حکومت پنجاب تمام فوجی طرز کی تنظیموں پر پابندی لگانے کا ارادہ رکھتی ہے' اس لیے کہ ہندوؤں اور سکھوں کی فوجی تنظیمیں روزبروز ابھر رہی ہیں اور اس سے صوبے میں صورتحال قابو سے باہر ہونے کا احتمال ہے۔ چنانچہ علامہ المشرقی نے اس بات پر اصرار کیا کہ اگر ان کی وردی اور اخوت کا نشان برقرار رہنے دیا جائے تو وہ بیلچہ پریڈ پر پابندی کو قبول کرلیں گے اور کسی قسم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔

وزیراعظم کو اس سے یک گونہ اطمینان ہوگیا تو انہوں نے ہندو پریس کی مہم کو روکنے کے لیے خاکساروں کا شائع کردہ پمفلٹ "اکثریت یا خون" ضبط کر لیا۔ اس پمفلٹ کی ضبطی کے احکام نے ایک طرف اگر ہندو پریس کو مطمئن کیا تو دوسری طرف عام خاکساروں کو یہاں تک مشتعل کر دیا کہ خود علامہ المشرقی کے لیے خاکساروں کو قابو

میں رکھنا محال ہو گیا۔ دراصل اس صورتحال سے سکندر وزارت کے اندر اور باہر کے مخالف گروپ نے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاکساروں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ سکندر وزارت اگر خاکساروں پر ہاتھ ڈالے گی تو مسلمانوں میں اس کی ساکھ ختم ہو جائے گی اور اگر ہاتھ نہ ڈالے گی تو ہندو اور سکھ اراکین اسمبلی وزارت سکندر کا تختہ الٹ دیں گے۔

پمفلٹ کی ضبطی کے خلاف خاکساروں نے احتجاجی مظاہرہ کیا۔ پولیس نے مظاہرین کو منتشر کر دیا۔ ایک طرف یہ مظاہرے ہو رہے تھے' دوسری طرف آل انڈیا مسلم لیگ لاہور میں اپنا سالانہ اجلاس کر رہی تھی۔ پنجاب میں سر سکندر حیات آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستان کی سطح پر استعمال کرنا چاہتے تھے اور کسی حد تک اس بات کے لیے بھی آمادہ تھے کہ مسلم لیگ بوقت ضرورت کانگرس سے گفتگو کرتے ہوئے سکندر وزارت کو استعمال کرے' لیکن جہاں تک پنجاب کے وزارتی اور سیاسی معاملات کا تعلق تھا' اس میں سر سکندر حیات مسلم لیگ کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

اس ضمن میں ملک برکت علی اور ان کے ہمنواؤں کی' جو اسمبلی کے اندر بہت ہی اقلیت میں تھے' خواہش تھی کہ یا تو سر سکندر حیات مسلم لیگ کے ڈسپلن کو صوبے کے اندر اور باہر تسلیم کریں' ورنہ یہاں پر ایسی وزارت ہو جو مسلم لیگ کے تابع ہو' چنانچہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونا قرار پایا تو ایک قسم کی یہ کش مکش جاری تھی۔

ملک برکت علی اور ان کے حامیوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ ہائی کمان پر یہ واضح کیا جائے کہ سر سکندر مسلمانان پنجاب میں مقبول نہیں اور مسلم لیگ سے ان کی وابستگی پنجاب میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے بجائے غیر مقبول بنانے کی موجب ہو گی۔ اس کے علاوہ اسمبلی کے اندر کچھ اراکین کی بھی یہ خواہش تھی کہ پارلیمانی بحران پیدا کیا جائے' تاکہ سر سکندر سے مراعات حاصل کی جاسکیں۔ اس میں کانگرسی' اکالی اور کچھ یونینسٹ مسلم اور غیر مسلم رکن شامل تھے۔

19 مارچ کا سانحہ

28 فروری 1940ء کو حکومت پنجاب نے تمام فرقہ وارانہ رضاکار جماعتوں پر پابندی عائد کردی۔ پابندی کے چند روز بعد علامہ المشرقی دہلی روانہ ہوگئے۔ اغلب تھا' دوسری جماعتوں کی طرح خاکسار بھی اس پابندی کو وقتی طور پر برداشت کرلیں گے' لیکن ایک ہفتے کے بعد جب خاکساروں کا ترجمان "الاصلاح" شائع ہوا تو اس میں پنجاب حکومت کی پابندی کے خلاف کئی ایک مضمون شامل تھے۔ سکندر حیات وزارت کے لیے پھر ایک نیا چیلنج سامنے آیا۔ اس کے حامیوں نے علامہ المشرقی سے رابطہ قائم کرکے انہیں ان اشتعال انگیز تحریروں سے منع کیا' جس سے حالات خراب ہونے کا اندیشہ تھا' جبکہ سکندر حیات کے مخالفوں نے علامہ المشرقی اور خاکساروں کی حمیت کو للکارتے ہوئے کہا کہ اگر انہوں نے اس وقت سکندر حیات وزارت سے ٹکر لی تو اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو سکندر حیات وزارت الٹ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ بری طرح تذبذب کا شکار ہوگی' اس کے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ رہ جائے گا: یا تو وہ خاکساروں کا ساتھ دے یا پھر مسلمانوں میں اپنی مقبولیت کھو دے۔ یہی سوچ کر خاکساروں نے 19 مارچ کو تین سو تیرہ خاکساروں کا جیش نکالنے کا منصوبہ بنالیا۔

حکومت پنجاب کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے علامہ المشرقی کو دہلی سے بلانے کی کوشش کی۔ حکومت کے حمایتی اخبارات نے اس سلسلے میں خاکسار رہنماؤں سے اپیلیں کیں۔ روزنامہ "انقلاب" جو سکندر حیات وزارت کا زبردست حامی تھا' اس نے اداریے لکھے' جن میں علامہ المشرقی سے درخواست کی کہ وہ موجودہ صورتحال کے پیش نظر لاہور پہنچ کر حالات پر قابو پانے کی کوشش میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

اس طرح لاہور کی سیاسی فضا میں خاکساروں کا احتجاجی مظاہرہ اور 23 مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بڑی اہمیت اختیار کرگیا۔ لاہور کی نگینہ بیکری ہو یا عرب ہوٹل' وہاں پر اس نئی سیاسی فضا کے متعلق دانش مندانہ بحث و مباحثہ کی رونق بڑھنے لگی۔

19 مارچ کی سہ پہر جب میں عرب ہوٹل پہنچا تو مولانا چراغ حسن حسرت' مستری عبدالواحد' عبداللہ بٹ اور شاہجہاں بیٹھے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔ اچانک ایک شخص ہوٹل میں داخل ہوا اور اس نے ہیرامنڈی میں خاکساروں پر پولیس کی فائرنگ کے متعلق اطلاع دی۔ کسی نے بھی اس اطلاع کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ہم عرب ہوٹل سے نکلے تو ہر طرف لوگوں کو ہیرا منڈی میں خاکساروں پر پولیس کی زبردست فائرنگ کے متعلق چہ میگوئیاں کرتے سنا' چنانچہ مولانا چراغ حسن حسرت' عبداللہ بٹ' مستری عبدالواحد اور میں نے پیدل ہیرامنڈی جانے اور صحیح صورتحال کا پتا لگانے کا ارادہ کیا۔ جوں جوں ہم ہیرامنڈی کی طرف بڑھ رہے تھے' توں توں صورتحال کی سنگینی کا احساس بڑھ رہا تھا۔

چراغ حسن حسرت نے کہا۔ "ہمیں کسی نے روکنے کی کوشش کی تو ہم تھانہ ٹبی کے انچارج آغا خادم حسین بٹالوی سے ملنے تھانے پہنچ جائیں گے۔"

آغا خادم حسین بٹالوی' عاشق حسین بٹالوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ عاشق حسین بٹالوی بڑے سرگرم ادیب اور سیاسی کارکن تھے۔ ان کا شمار مشہور افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا جنہوں نے پہلی بار اپنے افسانوں میں مسلمانوں کے نچلے درمیانے طبقے کی گھریلو زندگی اور ان کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ وہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے فعال کارکن کبھی نہیں رہے' لیکن فکری طور پر وہ ترقی پسند حقیقت نگار تھے۔

مولانا صلاح الدین اور عاشق حسین بٹالوی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ہر جگہ یہ دونوں ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے' جس طرح علمی حلقوں میں سید عبداللہ اور ابوالخیر محمد عبداللہ یک جان اور دو قالب تھے اور جن کو دیکھ کر مولانا چراغ حسن حسرت نے عاشق حسین بٹالوی اور مولانا صلاح الدین پر پھبتی کستے ہوئے کہا تھا۔ "آپ دونوں میں ایک دوسرے کا ابوالخیر کون ہے؟"

عاشق حسین بٹالوی کے والد بھی پولیس آفیسر تھے۔ ان کا ایک بھائی آغا ذوالقرنین خفیہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا' جبکہ ان کا سب سے چھوٹا بھائی آغا بابر فوج میں تھا اور فوجی اخبار کا مدیر تھا۔

جب ہم باتیں کرتے ہوئے پیدل پانی والے تالاب کے قریب پہنچے تو پولیس نے

ہمیں آگے جانے سے روک دیا' کیونکہ اس وقت تک حکومت نے کرفیو نافذ کر کے شہر کو پولیس اور فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ صبح کے اخبارات میں بھی اس خونی سانحے کے متعلق کوئی تفصیل نہ تھی' کیونکہ اخباروں پر زبردست سنسرشپ لگا دی گئی تھی۔

خادم حسین بٹالوی انچارج تھانہ ٹبی جو اس سانحہ کا عینی شاہد تھا' اس نے سانحہ کا جو پس منظر اور پیش منظر بیان کیا' وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 1940ء کے ابتدائی مہینوں میں مجھے تھانہ ٹبی کا انچارج لگایا گیا۔ اس وقت پابندیوں کی وجہ سے شہر کی فضا میں ایک کھچاؤ موجود تھا۔ خاکسار سب سے زیادہ پر جوش تھے۔ علامہ المشرقی اور حکومت پنجاب کے درمیان مذاکرات کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ "الاصلاح" کے 6 مارچ کے شمارے میں علامہ المشرقی کا اعلان شائع ہوا۔ "میں جانبازوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ لاہور پہنچ کر اپنی لاشیں سر سکندر حیات کی چارپائی کے چاروں طرف بچھا دیں۔" بس پھر کیا تھا! خاکسار جانباز لاہور میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ یہ نئی صورتحال دیکھ کر ایس ایس پی مسٹر گنیش فورڈ نے پولیس افسران کی میٹنگ بلائی۔ میں بھی اس میٹنگ میں شامل تھا۔ میٹنگ کے دوران سب انسپکٹر پولیس اچھرہ کے چودھری عبدالمجید نے کہا۔ "اگر خاکساروں نے عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کی اور پولیس کا سامنا ہوا تو خاکسار تشدد سے کام لیں گے۔ لیکن ڈی ایس پی نے اس خدشے کو بے بنیاد قرار دیا۔ اس طرح یہ میٹنگ کوئی قطعی لائحہ عمل مرتب کیے بغیر ختم ہو گئی۔

19 مارچ کو صبح مجھے اطلاع ملی کہ خاکسار اسی روز نماز ظہر کے وقت پابندیاں توڑنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اس غرض سے وہ اونچی مسجد اندرون بھاٹی گیٹ کے سامنے ایک مکان میں جمع ہو گئے ہیں۔ میں نے فوراً ڈی ایس پی کو اطلاع دی۔ دس بجے کے قریب ایس ایس پی مسٹر گنیش فورڈ نے مجھ سے ٹیلیفون پر اس اطلاع کی تصدیق کی اور کہا۔ "اچھا میں آ رہا ہوں۔"

آدھ گھنٹہ کے بعد مسٹر گنیش فورڈ ڈپٹی کمشنر لاہور مسٹر بورن اور ڈی آئی جی پولیس مسٹر ویسی تینوں تھانہ ٹبی پہنچ گئے۔ میں نے مسٹر گنیش فورڈ کو بتایا۔ "خاکسار سڑکوں پر مارچ کرتے ہوئے شاہی مسجد میں جائیں گے' وہاں نماز ظہر ادا کریں گے' اس کے بعد منٹو پارک میں خاکسار باقاعدہ پریڈ کریں گے۔ تمہاری کیا تجویز ہے؟"

"جب خاکسار منٹو پارک میں پریڈ کے لیے جمع ہوں تو انہیں محاصرہ کر کے گرفتار کر لیا جائے۔"

مسٹر گنیش فورڈ نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے پہلے مسٹر مارگن سپرنٹنڈنٹ ایڈیشنل پولیس کو شاہی قلعہ میں اور پھر مسٹر بینی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ٹیلی فون پر حکم دیا کہ وہ دونوں اڑھائی اڑھائی سو کی نفری لے کر' جن میں چند ایک آتشیں اسلحہ سے لیس ہوں' فوراً تھانہ ٹبی پہنچ جائیں۔

اس کے بعد اے ایس پی لاہور مسٹر اولیور کو ٹیلی فون پر ہدایت دی کہ وہ ڈیڑھ دو سو جوان لے کر بھاٹی دروازہ کو روک لیں۔

میں ان تینوں افسروں کے ہمراہ اونچی مسجد پہنچا۔ خاکساروں کو ہماری آمد کی اطلاع ہو چکی تھی' چنانچہ انہوں نے جو کہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے' چار چار کی قطار بنالی۔ ہر ایک خاکسار کندھے پر بیلچہ اٹھائے اور سر پر کفن باندھے ہوئے تھے۔ سب سے آگے ضیغم نامی نوجوان ہاتھ میں جھنڈا تھامے کھڑا تھا۔

ڈپٹی کمشنر مسٹر بورن نے اس سے کہا۔ "آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس نے جواب دینے کے بجائے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مسٹر بورن نے ضیغم سے دوبارہ یہی سوال کیا۔ جواب میں پہلے جیسی بے نیازی اور خاموشی تھی۔

سالار جیش فرمان شاہ جو صفیں درست کر رہا تھا' اس نے ضیغم کو آواز دی۔ علم بردار پیچھے آجاؤ۔" یہ سن کر ڈپٹی کمشنر فرمان شاہ کے قریب پہنچا اور کہا۔ "آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"اطاعت امیر!" سالار جیش کا جواب تھا۔

یہ سن کر تینوں افسروں نے علیحدگی میں کوئی صلاح مشورہ کیا اور پھر مسٹر گنیش فورڈ مجھے لے کر تھانے آگئے۔ تھانے میں واپس آئے تو ابھی تک کہیں سے کوئی پولیس فورس نہیں پہنچی تھی۔ مسٹر گنیش فورڈ نے مجھے تھانہ کے ملازمین کو فراہم کرنے کی ہدایت کی۔ تھانے میں صرف اکیس ملازمین تھے' جن کے پاس فقط لاٹھیاں تھیں' مسٹر گنیش فورڈ اور میں نے اپنے اپنے ریوالوروں میں گولیاں بھریں۔

مسٹر گنیش فورڈ نے مجھ سے کہا" تھانے کے سامنے والی سڑک روک لی جائے۔

چنانچہ میں نے اپنے اکیس آدمیوں کو دو قطاروں میں کھڑے ہو کر سڑک روکنے کا کہا' چنانچہ راستہ بالکل بند ہوگیا۔ میں اپنے ملازمین کو آخری ہدایت دے رہا تھا کہ بازار حکیماں کی طرف سے خاکسار بھاگتے آتے دکھائی دیئے اور پھر ہمارے قریب تقریباً تیرہ گز کے فاصلہ پر تھے کہ سالار جیش کی بلند آواز سنائی دی۔

فید ربدست!

خاکساروں نے بیلچے کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لیے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ مسٹر گنیش نے ان کے ارادے بھانپتے ہوئے کہا" خادم حسین! ان کو روکو!"

یہ سن کر خاکساروں نے پولیس کی رکاوٹ توڑنے کے لیے زور لگایا' لیکن جگہ تنگ تھی اس لیے وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ دو تین بار زور لگانے کے بعد جب وہ راستہ بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے تو سالار جیش کی آواز گونجی۔

"فید ربزن"

بس پھر کیا! بیلچے چمکتے ہوئے ہوا میں لہرائے اور پولیس پر برسنا شروع ہوگئے۔ ہم اس غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔

مسٹر گنیش فورڈ نے خول میں سے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی' تو اس پر بیک وقت تین چار خاکساروں نے حملہ کردیا۔ وہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مجھ پر بھی تین چار خاکساروں نے حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی' لیکن دیوار سے ٹکرا کر گر گیا۔ میں سنبھل کر اٹھنے لگا تھا کہ ایک خاکسار نے پورے زور سے بیلچہ میرے بائیں پہلو پر دے مارا۔ میں دوبارہ گر پڑا۔ میں نے اپنے بائیں پہلو پر ہاتھ پھیرا' کہیں خون تو نہیں تھا' لیکن اندر سے مجھے اپنی پسلیوں کے ٹوٹنے کا یقین ہوگیا۔ میں نے شدید درد سے کراہتے ہوئے اپنے قریب سپاہی نیت رام کو گرتے دیکھا اور دیکھتے دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔ اکیس آدمیوں میں سے سولہ آدمی زخمی ہو کر زمین پر گرے پڑے تھے اور تمام خاکسار پولیس کی رکاوٹ توڑ کر بازار ہیرا منڈی کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں درد سے نڈھال اٹھا اور مسٹر گنیش فورڈ کو گھسیٹ کر تھانے کی طرف جانے والی سڑک کی طرف بڑھا۔ میری نظر ڈپٹی کمشنر کے ڈرائیور پر پڑی' جو ایک سکھ

نوجوان تھا۔ اس کی مدد سے مسٹر گنیش کو موٹر میں ڈال کر ہم ہسپتال کی طرف چل دیئے۔

جب ہماری موٹر گیتی تھیٹر کی طرف مڑی تو ہم نے دیکھا' سامنے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے فوراً موٹر موڑ کر چیت رام روڈ پر ڈال دی اور چند لمحوں میں میو ہسپتال پہنچ گئے۔ مسٹر گنیش فورڈ کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا جہاں سرجن کرنل میراج ڈیوٹی پر تھے۔ وہ زخم سی رہے تھے' میں پاس کھڑا تھا۔ میرے بائیں پہلو میں درد شدت اختیار کر رہا تھا اور چند لمحوں کے بعد میں درد سے نڈھال ایک کرسی پر گر گیا۔ ایک نرس بھاگ کر کافی کی پیالی لے آئی' جبکہ ایک نوجوان ڈاکٹر نے میرا معائنہ کر کے بتایا کہ میرے بائیں پہلو کی چند پسلیاں ٹوٹ چکی ہیں چنانچہ مجھے سٹریچر پر ڈال کر فیملی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ اس اثناء میں مسٹر بیٹی بری طرح زخمی ہو کر ہسپتال پہنچا۔ مجھے ستائیس دن ہسپتال میں رکھا گیا اور اس کے بعد ڈاکٹر نے مجھے دو مہینے کے آرام کی سفارش کی اور میں رخصت پر چلا گیا۔

ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر بیٹی جنہیں مسٹر گنیش فورڈ نے اڑھائی سو مسلح جوانوں کے ساتھ تھانہ ٹبی پہنچنے کا حکم دیا تھا' اس نے بتایا جب ایس ایس پی کی ہدایت کے مطابق اڑھائی سو سپاہیوں کو لے کر ہیرا منڈی بازار تک پہنچے تو ہم پر حملہ ہو گیا۔ پولیس کے جوان' خاکساروں سے مڈبھیڑ کی وجہ سے بکھر گئے۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ میں چند آدمیوں کے ساتھ ٹبی تھانہ پہنچنا چاہتا تھا' لیکن خاکساروں نے مجھ پر بھی حملہ کر کے مجھے شدید زخمی کر دیا۔ دوسری طرف جب پولیس پر خاکساروں نے ایک زوردار ہلہ بولا تو پولیس والے شاہدرہ جانے والے تانگوں کے اڈے کی طرف چلے گئے۔ وہاں پر ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو للکارا اور پلٹ کر خاکسارں پر گولی چلانا شروع کر دی۔ اس کی تقلید میں باقی سپاہیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ اس دوران مسٹر مارگن سپرنٹنڈنٹ ایڈیشنل پولیس شاہی قلعہ اڑھائی سو جوانوں اور ڈی آئی جی پولیس ڈی ہوم وہاں پہنچ گئے۔ اندھا دھند گولی چلتی دیکھ کر خاکساروں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ لاہور کے جو خاکسار لاہور کی گلیوں اور بازاروں سے خوب واقف تھے' وہ تو ان گلیوں اور بازاروں میں گم ہو گئے' لیکن وہ

خاکسار جن کا تعلق پنڈی اور پشاور سے تھا' انہیں جائے پناہ ڈھونڈنے میں مشکلات پیش آئیں۔ بعض تو رنڈیوں کے کوٹھوں پر چڑھ گئے' چنانچہ پولیس نے رنڈیوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر خاکساروں کو تلاش کر کے کئی ایک کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور پھر انہیں سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دیا۔

اس خونی کھیل میں بڑے اندوہ ناک واقعات دیکھنے میں آئے۔ ایک آنریری مجسٹریٹ جو مسلمان تھا' ہیرا منڈی پہنچا تو اس نے ایس پی مسٹر مارگن کو جو بڑی دیدہ دلیری سے نہتے خاکساروں پر گولی چلا رہا تھا' روک کر اس سے پوچھا "آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟"

"میں آنریری مجسٹریٹ درجہ اول!"

"اوہ!" مسٹر مارگن نے اپنا ریوالور خول میں ڈالا' اور باقاعدہ اٹینشن ہو کر سلیوٹ کیا اور اس کے بعد پھر سے اپنا پستول نکال کر ایک نوجوان خاکسار کے سینے میں گولی مار کر کہا "میں ڈیوٹی دے رہا ہوں۔"

آنریری مجسٹریٹ کھسیانہ ہو کر وہاں سے چل دیا۔ تحقیقاتی کمیشن کے روبرو مسٹر مارگن سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ جب آپ نہتے خاکساروں پر فائرنگ کر رہے تھے اور ایک آنریری مجسٹریٹ نے جب آپ کو ایسا کرتے دیکھا اور آپ سے پوچھا تو آپ نے ان کے سامنے ایک اور نہتے خاکسار کو گولی کا نشانہ بنایا؟

مسٹر مارگن نے اس واقعہ سے انکار کر دیا۔

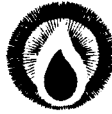
19 مارچ کے اس سانحے میں حکومت نے مرنے والے خاکساروں کی تعداد 36 بتائی' جبکہ پولیس کے صرف دو آدمی ایک سپاہی سیت رام اور دوسرا ڈی ایس پی مسٹر بٹی ہلاک ہوئے۔

اس خونی سانحہ کی تمام ذمہ داری حکومت نے پولیس پر ڈال دی۔ اس سے عوام میں خاکساروں کے لیے عام ہمدردی کے جذبات کا سیلاب امڈ آیا۔ عوام نے پولیس کے اس رویئے کے خلاف نفرت اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے ہر پولیس افسر کا نام "امام دین" رکھ دیا۔ اس طرح جہاں سے بھی کوئی پولیس افسر گزرتا دکھائی دیتا "امام دین" کا

آوازہ اس کا پیچھا کرتا۔

اس سانحہ کے احتجاج میں شہر میں زبردست ہڑتال ہوئی' حکومت پنجاب نے دفعہ 144 نافذ کر کے شہر میں کرفیو لگا دیا۔ اخبارات پر سنسر بٹھا دیا۔ پورے شہر میں فوج گشت کرتی دکھائی دینے لگی۔ چاروں طرف دہشت کا سماں تھا۔

باغوں کا شہر لاہور جہاں مارچ کے مہینے میں بہار اپنے رنگ اور خوشبوئیں ہر سو بکھیرتی تھی' خون میں ڈوب گیا۔ پھولوں کی جگہ زخم کھل اٹھے' غنچوں کے چٹکنے کی آواز آتشیں اسلحہ کی گھن گرج میں ڈوب گئی۔



باب 5

قرارداد لاہور

اس فضا میں ستم یہ کہ صرف تین روز بعد لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منٹو پارک میں منعقد ہونے والا تھا۔ قائداعظم صرف دو روز بعد بذریعہ اسپیشل ٹرین لاہور پہنچ رہے تھے۔ اہل لاہور ان کے عظیم الشان استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔ نئی سیاسی صورتحال کے پیش نظر پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے لیے مسلم لیگ کا یہ اجلاس بھی تشویش کا باعث تھا کہ کہیں مسلم لیگ بھی سرسکندر حیات کے خلاف مظاہرہ نہ کردے' چنانچہ اندر کھاتے سرسکندر حیات نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کو ملتوی کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہوں نے قائداعظم سے بھی ٹیلی فون پر بات چیت کی' لیکن قائداعظم نے ان پر واضح کردیا کہ خواہ کچھ بھی ہو مسلم لیگ کا یہ اجلاس ملتوی نہیں ہو گا۔

سرسکندر حیات نے اجلاس کے التوا کی ناکامی کے بعد قائداعظم کو استقبالیہ جلوس کی قیادت نہ کرنے کے لیے رضامند کرلیا' چنانچہ مجلس استقبالیہ کے صدر نواب شاہنواز ممدوٹ نے اعلان کردیا کہ 19 مارچ کے حادثہ کی وجہ سے 21 مارچ کی صبح کو قائداعظم کی آمد کے سلسلے میں استقبالیہ جلوس کا پروگرام ملتوی کردیا گیا ہے' لیکن اکیس مارچ کو قائداعظم علی الصباح جب اسپیشل ٹرین کے ذریعے لاہور پہنچے تو اسٹیشن پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ہجوم کا یہ عالم تھا کہ اسٹیشن سے باہر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ پولیس کی بہت بھاری جمعیت موجود تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ عوام مشتعل نہ ہو جائیں' یا خاکسار کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھائیں۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم نمبر ایک جہاں قائداعظم کی گاڑی

رکی تھی، وہاں مسلح پولیس کی بھاری نفری متعین تھی، کیونکہ انہیں قائداعظم سے زیادہ وزیراعظم سر سکندر حیات اور ان کی کابینہ کی حفاظت مقصود تھی۔

سر سکندر حیات نے قائداعظم کا استقبال کیا۔ اس موقع پر میاں عبدالحئی، نواب سر شاہنواز ممدوٹ، نواب مظفر خان، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، راجہ غضنفر علی، میاں امیرالدین، عاشق حسین بٹالوی اور فیروزالدین احمد پیش پیش تھے۔

قائداعظم سے کہا گیا کہ وہ ایک آراستہ کھلی موٹر کار میں بیٹھیں اور جلوس کی صورت "ممدوٹ ولا" چلیں لیکن قائداعظم نے انکار کر دیا اور بند موٹر میں ممدوٹ ولا تشریف لے گئے۔ وہاں اخباری نمائندے موجود تھے جنہیں قائداعظم نے بتایا، "مسلم لیگ کا یہ سیشن اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کرے گا۔" 19 مارچ کے سانحہ کے متعلق کہا "مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ کئی جانیں ضائع ہو گئیں اور کئی لوگ زخمی ہوئے، لیکن ہمیں اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے اور مجھے امید ہے کہ ہم صحیح حل دریافت کر لیں گے۔ اسی دن چار بجے شام وہ اجلاس کے بڑے پنڈال میں پہنچے اور پرچم کشائی کی تقریب میں شرکت کی۔ ادھر پرچم کشائی کی رسم ادا کی جا رہی تھی ادھر شہر میں خاکساروں اور پولیس میں مقابلہ ہو رہا تھا، کیونکہ کرنال کے آٹھ خاکساروں نے انارکلی میں پریڈ کرنی شروع کر دی تھی، جیسے ہی خاکسار بارونق بازار میں یکدم نمودار ہوئے، انارکلی میں دہشت پھیل گئی۔ دیکھتے دیکھتے تمام دکانیں بند ہونے لگیں۔ پولیس بھی فوراً پہنچ گئی۔ انہوں نے جیش کے سالار کو منتشر ہونے کے لیے کہا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا تو آنسو گیس چھوڑ کر ان کو گرفتار کر لیا گیا۔

22 مارچ کی سہ پہر کو آل انڈیا مسلم لیگ کا کھلا اجلاس شروع ہوا۔ نواب شاہنواز ممدوٹ خطبہ استقبالیہ پیش کرنے کے لیے اٹھے۔ کھڑے ہو کر انہوں نے لاہور کی تاریخی اہمیت اور یہاں کی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہی مسجد کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ سر سکندر حیات کی مساعی سے مسجد کی مرمت شروع ہو گئی ہے۔

سر سکندر حیات کا نام آتے ہی ہجوم میں اشتعال پھیل گیا اور آوازیں آنی شروع ہو گئیں "ہم نہیں سنتے، سکندر حیات کا نام مت لو۔"

نواب شاہنواز مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے، انہوں نے سیاست کی پرپیچ

وادیوں میں کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ بیچارے پریشان ہو گئے۔ اتنے میں سر سکندر جو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، مجمع کا عالم دیکھ کر خاصے ہراساں ہو گئے اور چپکے سے پچھلے دروازے سے باہر کھسک گئے۔

قائداعظم کھڑے ہوئے تو مجمع پر بالکل سکوت چھا گیا۔ قائداعظم نے پانچ دس جملے اردو میں کہے۔ اس کے بعد وہ انگریزی میں تقریر کرنے لگے۔ قائداعظم نے اس خطبے میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا ذکر نہیں کیا تھا، لیکن انہوں نے یہ بات واضح کردی کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں، اور ہندوستان کا آئینی مستقبل برطانوی جمہوریت نہیں ہو سکتی۔

برٹش گورنمنٹ حقیقتاً خلوص کے ساتھ اس براعظم کے باشندوں کی خوشی اور امن پسندی کی متمنی ہے تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان کو خود مختار ریاستوں میں تقسیم کرکے دو اہم قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) کو اپنے آپ علیحدہ ہو جانے دے۔ یہ ریاستیں کسی اعتبار سے ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوں گی، بلکہ اس کے برعکس ایک قوم کا دوسری قوم پر سیاسی اقتدار اور معاشرتی نظام مسلط کرنے کا حریفانہ اور قدرتی جذبہ فنا ہو جائے گا۔ ان دونوں کے درمیان بین الاقوامی معاہدہ کے ذریعے دوستانہ مراسم بڑھیں گے اور دونوں قومیں اپنے ہمسایوں کے ساتھ کامل امن پسندی سے رہیں گی۔ اس کے علاوہ یہ چیز دوستانہ طور پر اقلیتوں کے مسئلہ کو بالفعل طے کرنے، ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں ان کے متعلق ہم آہنگی پیدا کرنے میں بہت مد ثابت ہوگی اور یہ طریقہ ایسا ہوگا جس کے ذریعے مسلمان اور دیگر اقلیتوں کے حقوق اور تحفظات کا نہایت موثر اور تسلی بخش انتظام ہو سکے گا۔

رات کو دس بجے کے قریب مجلس منتظمین کا اجلاس شروع ہوا۔ یہ اجلاس آٹھ بجے شروع ہونا تھا، لیکن سر سکندر حیات اور ان کے ہمراہی وقت پر نہ پہنچ سکے۔ قائداعظم اس اجلاس میں سر سکندر حیات کی موجودگی ضروری سمجھتے تھے۔ کئی اور لوگ بھی اس بات پر مصر تھے کیونکہ وہ خاکساروں پر گولی کے سلسلے میں تحریکیں لانا چاہتے تھے، اس لیے کئی بار سکندر حیات کو ٹیلی فون کیا گیا۔ شروع میں تو انہوں فضا کی خرابی کا بہانہ کرکے اور یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کوئی خاکسار ان پر حملہ نہ کر دے، لیکن جب نہایت

اصرار کیا گیا تو سکندر حیات بڑی خاموشی سے ساڑھے دس بجے اجلاس میں شامل ہوئے۔ اس اجلاس میں نوابزادہ لیاقت علی خان نے "قرارداد لاہور" پیش کی۔ اس پر سر یامین خان' چودھری خلیق الزمان اور پنجاب سے میر مقبول محمود نے تائید میں تقریریں کیں۔ پنجاب کے ایک مندوب کی طرف سے ایک ترمیم پیش کی گئی کہ اس قرارداد میں واضح طور پر صوبوں کا نام لیا جائے تاکہ ہمارا موقف بالکل واضح اور دو ٹوک ہو جائے' لیکن نواب زادہ لیاقت علی خان نے اس ترمیم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم اپنے خطوں میں دہلی اور علی گڑھ جیسے اسلامی تہذیبی مرکز بھی شامل کرنے کے متمنی ہیں۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی۔

سر سکندر حیات اس قرارداد کے کلی طور پر حامی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی لیے انہوں نے کھلے اجلاس میں اس کی تائید کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی آئینی مسئلے کے متعلق اپنی ایک اسکیم بھی تھی' چنانچہ یونینسٹ ممبروں کی طرف سے دو سیاسی قراردادوں کے نوٹس بھی دیئے گئے۔ ایک قرارداد میاں مشتاق احمد گورمانی اور سید امجد علی کی طرف سے بھیجی گئی اور دوسری میاں مشتاق احمد گورمانی اور صوبہ سرحد کے ضیاء الدین کی طرف سے ارسال کی گئی' لیکن ان قراردادوں کے پیش ہونے کی نوبت ہی نہ آئی اور "قرارداد لاہور اتفاق رائے سے منظور ہو گئی۔"

23 مارچ کو کھلا اجلاس شروع ہوا۔ اس میں قرارداد لاہور پیش کرنے کا سہرا بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کے سر بندھا۔ مولوی ظفر علی خان نے اس کی تائید کی۔ اس طرح اس قرارداد کی قریب قریب ہر صوبے کے نمائندوں کی طرف سے تائید ہوئی۔ اس اجلاس میں پہلی بار نواب بہادر یار جنگ بھی شریک ہوئے اور اہل لاہور نے پہلی بار ان کی فصاحت کا لوہا مانا۔

نواب بہادر یار جنگ ریاستوں کی مسلم لیگ کانفرنس جو مسلم لیگ کے پنڈال میں ہونا تھی' اس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور ایسی جگہ انہوں نے پہلی بار تقریر کی تھی۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے ہر اجلاس میں ان کی تقریر ایک لازمی جزو بن گئی تھی۔

اس تاریخی اجلاس کے بعد قائداعظم تین دن لاہور میں رہے۔ انہوں نے ان تین دنوں میں لاہور کی مسلم طالبات اور طلباء سے خطاب کیا۔ مس فاطمہ جناح نے

خواتین کے اجلاس میں شرکت کی اور جناح صاحب 26 مارچ کو اسمبلی کا اجلاس دیکھنے تشریف لائے۔ اسی دن مسٹر گابا نے خاکساروں پر گولی چلانے کے خلاف ایک تحریک التوا پیش کی۔

خاکساروں کے ہنگامے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پر تبصرہ شورش کاشمیری نے 27 مارچ 1940ء کو منٹگمری جیل سے کامریڈ ہرنام سنگھ چمک کے ہاتھوں ایک رقعہ کے ذریعے پہنچایا جس میں انہوں نے لکھا۔ "خاکساروں کا ہنگامہ' لیگ کا رقص' امتحان کی تیاری' پہلی دو باتیں تو کوئی خاص نہیں' تیسری بات البتہ اہم ہے' خدا کرے ایسا ہو اور تم بی اے ہو جاؤ۔"

ٹیپوڈے

16- اپریل کو عبداللہ بٹ نے مجھے پھر سے آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے پیڈ پر خط لکھا۔ اس خط میں دوستی والا کوئی القاب نہ تھا' بلکہ یہ خط بالکل دفتری نوعیت کا تھا۔ لکھتے ہیں۔

مکرمی السلام علیکم!

آپ کو اخبارات کے ذریعے معلوم ہو چکا ہو گا کہ فیڈریشن "ٹیپوڈے" منا رہی ہے۔ ابھی فیڈریشن کے نئے انتخاب عمل میں نہیں آئے' اس لیے اخبارات میں پروپیگنڈہ (تشہیر) کے لیے آپ کا نام استعمال کرنے کی ضرورت ہو گی۔ امید ہے کہ آپ یہ اجازت مرحمت فرمائیں گے۔ "ٹیپوڈے" کے بعد فیڈریشن کے نئے انتخابات عمل میں آئیں گے۔ فیڈریشن آپ کی مالی امداد کی ازحد مستحق ہے۔ امید ہے کہ آپ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

اتوار 21 اپریل کو ڈاکٹر تاثیر اور مولانا محمد علی صاحب کا فوٹو ہو گا۔ آپ سے شرکت کی استدعا ہے' عدم شرکت کی صورت میں اطلاع ضرور دیں۔

(عبداللہ بٹ)

میں نے عبداللہ بٹ سے مل کر "ٹیپو ڈے" کے لیے تفصیل سے بات کی۔ "ٹیپو ڈے" کی صدارت کے لیے ایسی شخصیت کو منتخب کرنے میں دیر نہ لگی' کیونکہ پنجاب

سٹوڈنٹ یونین جو آل انڈیا سٹوڈنٹس کی پنجاب شاخ تھی' اس پر کانگرس سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی اور طلبا مسلط تھے۔ ان طلباء کی پشت پناہی سب سے زیادہ میاں افتخارالدین کر رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پنجاب کے مسلمان امراء اور زمیندار نوجوانوں کو کیمونزم کی طرف راغب کرنے میں میاں افتخارالدین نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت میاں افتخارالدین پنجاب کانگرس کے صدر اور پنجاب اسمبلی میں پارلیمنٹری کانگرس پارٹی کے سیکریٹری تھے اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ میں اور عبداللہ انہیں اپرمال روڈ پر دیوان چمن لال کی کوٹھی میں ملے' جہاں وہ ایک کرایہ دار کی طرح رہائش پذیر تھے۔ بعد میں وہ 21-اسکیم روڈ پر آ گئے۔

میاں افتخار الدین نے میرے کیمونسٹ نظریات اور میری کھدرپوشی کو داد بھری نظروں سے دیکھا۔ ہم نے جب ان سے آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کی طرف سے "سلطان ٹیپو شہید ڈے" منانے کی بات کی تو انہوں نے سب سے پہلے بڑی بے تکلفی سے پنجابی میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے متعلق پوچھا۔ ہم نے انہیں پنجاب میں سب کچھ تفصیل سے بتایا' جسے انہوں نے دلچسپی سے سنا۔ جب صدارت کے لیے درخواست کی تو انہوں نے کہا۔ "دوستو! میں تو "سلطان ٹیپو" کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتا' اس لیے کیا صدارت کروں گا!" یہ سنتے ہی عبداللہ بٹ نے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے بارے میں بتانے کے لیے مجھے اشارہ کیا' چنانچہ میں نے انہیں بتایا کہ برصغیرپاک و ہند کی تاریخ میں سلطان ٹیپو پہلا شخص تھا جو ریاست میسور کے والی کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوا۔ یہ سن کر میاں افتخار الدین نے "ٹیپو ڈے" کی صدارت کرنے کی ہامی بھرلی۔ چنانچہ آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کا "سلطان ٹیپو شہید ڈے" لاہور کی اس سیاسی فضا میں ایک کامیاب جلسہ تھا۔

"ٹیپو ڈے" کی زبردست کامیابی کے بعد سیاسی حوالے سے میرا نام ایک نئی سج کے ساتھ نمایاں ہوا۔ مجلس احرار کے حوالے سے شورش کاشمیری کی قربت اور دوستی نے احرار کے سیاسی کارکنوں میں حسد کے جذبات کو ابھارا۔ شورش کی گرفتاری اور جیل

یاترا نے ہماری دوستی کو ایک نیا رنگ دیا' جس کے متعلق ہمارے دوستوں اور دشمنوں میں پہلے چہ میگوئیاں ہوئیں اور اس کے بعد ہمارے درمیان مختلف نوعیت کی غلط فہمیوں کو ابھارا گیا' جن کا ذکر شورش کاشمیری نے اپنے خطوط میں واضح طور پر لکھا۔ "ٹیپو ڈے" کے بعد مجلس احرار کے قائد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بیٹے عزیز الرحمٰن جامی نے مجھے مجلس احرار کی از سرنو تشکیل کے لیے ابھارا۔

مجلس احرار سے ہمدردی ہمارا خاندانی رویہ تھی' اس لیے میں انکار نہ کرسکا' چنانچہ "مجلس احرار نونہال کانفرنس" کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی اور مجھے مجلس استقبالیہ کا صدر نامزد کیا گیا۔ اس کانفرنس کی صدارت کے لیے ایک نوجوان بلکہ نوخیز لڑکے حافظ محمد رضی کا نام تجویز کیا گیا۔ حافظ محمد رضی الدین میرٹھ کے ایک مذہبی مدرسے کے طالب علم تھے۔ انہوں نے نہایت شعلہ بیانی کے ساتھ موثر اور مدلل تقریر کی' میں نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ یہ کانفرنس جون میں بیرون دہلی دروازہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے بھی مجھے بڑی شہرت دی۔ عزیز الرحمٰن جامی اور حافظ محمد رضی الدین سے نئے طور سے تعلقات استوار ہوئے۔

ستیہ گرہ

اس زمانے میں ایک اور ہنگامہ عرب ہوٹل میں بیٹھنے والوں کے ساتھ ہوا۔ دراصل کانگرس کے بائیں بازو اور مجلس احرار کے زیر اثر کانگرس اور گاندھی جی نے انفرادی طور پر "ستیہ گرہ" کا اظہار کیا' تو میاں افتخار الدین نے اپنے خاص علاقے باغبانپورہ میں ایک بڑے جلسے میں دھواں دھار تقریر کی' اور اپنی گرفتاری پیش کی۔ میاں افتخار الدین کی جلسہ عام میں یہ غالباً پہلی تقریر تھی جو میں نے سنی۔ اسی بناء پر میاں صاحب کو چھ ماہ کی سزا اور جرمانہ ہوا اور محمود علی قصوری نے اس کے خلاف عدالت میں رٹ کردی۔

کانگرس کی اس انفرادی "ستیہ گرہ" سے حکومت خوفزدہ ہوگئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں سوشلسٹ اور کیمونسٹ بھی اس تحریک میں شامل نہ ہو جائیں' چنانچہ حکومت ہند نے ہندوستان گیر سوشلسٹوں کیمونسٹوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا۔ بعض

کمیونسٹ انڈر گراؤنڈ چلے گئے' لیکن عرب ہوٹل میں بیٹھنے والے کمیونسٹ فیروزالدین منصور اور کرم سنگھ مان گرفتار کرلیے گئے۔ ایک اور سوشلسٹ عبداللہ صفدر گوالمنڈی میں رہتے تھے۔ رات کو پولیس انہیں پکڑ کر تھانہ میں لے گئی اور صبح جیل میں منتقل کرنے کے لیے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا لیکن رات کو ہی عبداللہ صفدر تھانے سے فرار ہوگیا۔ پولیس اسے دوبارہ گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے بعد آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ عبداللہ صفدر کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

جون کے مہینے میں لاہور کی عجیب کیفیت تھی۔ حکومت پنجاب کا خاکساروں کے ہیڈکوارٹر واقع اچھرہ پر مکمل قبضہ تھا۔ علامہ المشرقی کو گرفتار کر کے لاہور لایا جا چکا تھا۔ لاہور کی تمام قابل ذکر مسجدوں میں خاکساروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے' ان کا صدر مقام سنہری مسجد اور کشمیری بازار تھا' جہاں ایک آتش بیاں مقرر عبدالجبار سارا سارا دن اسپیکر پر حکومت کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔ مسجدوں میں مقیم خاکساروں کو لوگ باقاعدہ کھانے پینے کی اشیاء فراہم کر رہے تھے۔ جب حکومت نے ان لوگوں کا محاسبہ شروع کیا تو عورتوں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی' برقعوں میں چھپا کر کھانا لانا شروع کر دیا۔ یہ صورتحال حکومت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ غیر مسلم رہنما اور پریس حکومت سے نہایت سخت قدم اٹھانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ خاکسار بھی کسی محلے یا بازار میں اچانک نمودار ہو کر پریڈ شروع کر دیتے۔

آخرکار حکومت نے خاکساروں سے مسجدیں خالی کرانے کا فیصلہ کر لیا' چنانچہ ڈی آئی جی مسٹر بینٹ کی سرکردگی میں مسجدوں پر نصف شب کے قریب چھاپے مارے گئے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ پولیس کی کافی جمعیت مسلح ہو کر مسجد کے سامنے نصف شب کے قریب پہنچتی' باہر سے آنسو گیس کے بم مسجد میں پھینکتی اور جب خاکسار نڈھال ہو جاتے تو پولیس والے دیواریں پھاند کر اندر داخل ہوتے اور موجود خاکساروں کو گرفتار کر لیتے۔

محلہ کندی گراں میں پولیس کو خاصی مشکل پیش آئی' کیونکہ یہاں مسجد ایک گلی میں تھی' جہاں چاروں طرف مکان پھیلے ہوئے تھے۔ جب نصف شب کو وہاں پولیس پہنچی تو محلے والوں نے ان پر پتھراؤ شروع کر دیا' بہرحال پولیس نے بڑی مشکل سے اس

مسجد کو خالی کرایا۔ مسجدوں سے گرفتار ہونے والوں میں ایسے لوگ بھی بڑی تعداد میں تھے' جو باضابطہ خاکسار جماعت کے ممبر نہ تھے۔ محض ان سے ہمدردی کی وجہ سے ان کی طاقت کو ابھارنے کے لیے مسجدوں میں رہنے لگے تھے۔ ان لوگوں کو جلد رہا کر دیا گیا۔

خاکساروں سے عام لوگوں میں ہمدردی کا جذبہ 19 مارچ کے خونی سانحہ کے بعد شدت اختیار کر گیا تھا۔ اس سانحہ کے بعد پورے پنجاب کی فضا بہت جلد تبدیل ہو گئی۔ صوبائی دارالحکومت لاہور میں پورا غم و غصہ اور غیظ و غضب سر سکندر حیات کی ذات تک محدود ہو گیا۔ سر سکندر حیات مسلم لیگی زعماء میں شامل تھے۔ قائداعظم بھی اس نازک صورتحال کو بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے بھی لاہور میں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے زخمی خاکساروں کی ہسپتال میں عیادت کی۔ 21 مارچ کو جب پرچم کشائی کی تقریب ہوئی تو انہوں نے بتایا۔ "میں ابھی ابھی ان زخمیوں کو میو ہسپتال میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ لوگ ایک رنجیدہ واقعہ کا شکار ہوئے ہیں' یہ واقعہ حقیقتاً بہت ہی افسوس ناک ہے' جس کے نتیجے میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ ہمیں ان زخمیوں اور مرنے والوں کے لواحقین سے پوری پوری ہمدردی ہے اور ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔"

میرداد کا فرار

جولائی تک خاکساروں کے دلوں میں مسلم لیگ کے لیے دائمی گرہ پڑ گئی۔ اس نے حکومت اور خاکساروں کے درمیان مفاہمت کی کوئی ہمدردانہ کوشش نہیں کی' اس کی تمام کوششیں سیاسی نوعیت کی تھیں۔ خاکساروں کی مسلسل سرکشی اور پھر کانگرس کی انفرادی طور پر "ستیہ گرہ تحریک" اور دیگر سیاسی تحریکوں نے حکومتی اداروں میں خاصا ہیجان برپا کر دیا۔۔۔ اس پر جلتی کا کام کمیونسٹوں کی ہندوستان گیر گرفتاری نے کیا۔ انہی دنوں کا ذکر ہے ایک دن اخبارات میں ایک نہایت مختصر خبر شائع ہوئی' ایک کمیونسٹ قیدی' جسے لاہور سنٹرل جیل سے کہیں دوسری جیل میں منتقل کرنے کے لیے ٹرین کے ذریعے لے جایا جا رہا تھا' اس نے چلتی ٹرین سے مع ہتھکڑی چھلانگ لگا دی۔ اس کی گرفتاری کے لیے ٹرین کو روکا گیا' لیکن وہ قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس

قیدی کا نام "میرداد" بتایا جاتا ہے۔

اس خبر نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً کمیونسٹوں سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن تمام کمیونسٹ یا تو گرفتار ہو چکے تھے یا پھر انڈر گراؤنڈ چلے گئے۔ میں نے پھر بھی اس خبر کی تصدیق مختلف لوگوں سے کر لی۔ کمیونسٹ فکر رکھنے والے نوابزادہ مظہر علی اور ان کے بڑے بھائی نوابزادہ محمود علی بھی گرفتار کر لیے گئے تھے' اگرچہ یہ دونوں سر سکندر حیات کے بھتیجے تھے۔

میرداد کا ہتھکڑی کے ساتھ چلتی ٹرین سے کودنا بڑا جرات مندانہ اقدام تھا۔ میرداد سے میری منٹگمری جیل میں شورش کاشمیری کے حوالے سے ملاقات ہو چکی تھی۔ میرداد کیمبل پور جیل سے باآسانی فرار ہو سکتا تھا' کیونکہ امرتسر ضلع میں کسان کانفرنس میں جب وہ کرتار سنگھ کے نام سے صدارت کرنے اسٹیج پر آیا تو خفیہ پولیس کانفرنس کے بعد اسے گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور لے آئی' جہاں اسے تین ماہ رکھا گیا' لیکن پولیس سوائے اس کے اصل نام "میرداد" کے کچھ نہ اگلوا سکی۔ آخر کار اسے اس کے آبائی گاؤں میں نظر بند کر دیا۔

میرداد نے بہت جلد یہاں کے روایتی جاگیردارانہ ماحول میں جہاں زمیندار کا روایتی ظلم و ستم اپنے عروج پر تھا' کمیوں (نائی' مراثی' لوہار' ترکھان) یعنی محنت کش طبقہ میں ایک برادری و خودداری کا احساس پیدا کیا۔ اس سے خوفزدہ ہو کر علاقے کے زمینداروں نے میرداد کے خلاف ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیلر کو شکایات پہنچانا شروع کر دیں۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے میرداد کی گرفتاری کے احکام جاری کرتے ہوئے حضرو تھانے کو ہدایت کی کہ میرداد کو نظر بندی کی خلاف ورزی کے جرم میں گرفتار کیا جائے' لیکن تھانہ حضرو کو میرداد کی نظر بندی کی خلاف ورزی کی ایک بھی شہادت نہیں مل رہی تھی' کیونکہ میرداد کے بارے میں متعدد دلچسپ واقعات ہر طرف پھیل چکے تھے' جیسا کہ ایک غریب محنت کش (نائی) کا قصہ جو ساہوکار کا مقروض تھا اور ساہوکار نے اسے دھمکی دی کہ اگر کل اس کے روپے واپس نہ کیے گئے تو وہ اس کی بیٹی کو اٹھوا لے گا۔ آخر وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر میرداد کے حجرے میں پہنچا اور میرداد سے کہا کہ کامریڈ آج مجھے ساہوکار نے یہ دھمکی دی ہے اب میں کیا کروں؟

یہ سن کر میرداد کی آنکھوں میں غصہ اتر آیا۔ کچھ سوچ کر پوچھا۔ "کتنے روپے دینے ہیں؟"

"تیس روپے۔"

یہ سن کر میرداد فوراً اپنے مکان کے اندر گیا اور ماں کو وہ زیور جو اس نے میرداد کی شادی کے لیے بنا رکھے تھے' دینے کو کہا۔ ماں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا' لیکن میرداد نے ماں کی بہت منتیں' خوشامدیں کیں' جن پر ماں کا دل پسیج گیا اور اس نے وہ زیور بیٹے کے حوالے کر دیئے۔ چنانچہ میرداد نے ایک نوجوان طالب علم کو کیمبل پور یہ زیور فروخت کرنے کے لیے بھیجا۔ اس طرح اسی دن شام تک نائی نے ساہوکار کا قرض چکا دیا۔ اس واقعہ کے بعد ساہوکار کے خلاف آگ بھڑک اٹھی' جبکہ عام لوگوں میں میرداد کے اس جذبے اور خلوص نے ایسا گھر کیا کہ وہ میرداد تک پہنچنے والی ہر آنچ کے خلاف دیوار بن گئے۔ ایسی فضا میں میرداد کے خلاف کوئی شہادت تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ نجف خاں جو میرداد کے قرابت دار تھے' انہوں نے پولیس کے ساتھ بڑا تعاون کیا' یہاں تک کہ انہوں نے اپنے مزارعین کو میرداد کی گرفتاری کے لیے مجبور کیا' لیکن پورا گاؤں اس کے خلاف ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنے گاؤں سے ایسا بھاگا کہ میرداد کی گرفتاری کے بعد گاؤں واپس آیا۔ میرداد کی گرفتاری کے لیے شاہ جی نام کے تھانیدار کا تقرر کیا گیا۔ شاہ جی تشدد اور سخت گیری میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ شاہ جی نے میرداد کی گرفتاری کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہوئے تھانہ حضرو کا چارج سنبھالا۔

ایک صبح تھانیدار شاہ جی نے' اپنے پانچ چھ سپاہیوں کے ساتھ میرداد کے حجرے کو گھیر لیا۔ میرداد مطالعے میں مصروف تھا کہ تھانیدار نے اسے آسانی سے دبوچ کر سپاہیوں سے کہا کہ وہ ہتھکڑی پہنا دیں۔

میرداد نے کوئی مزاحمت نہ کی اور خاموشی سے ہتھکڑی پہن لی۔ تھانیدار نے بڑے فخر سے ہتھکڑی کی زنجیر کو اپنی پیٹی سے باندھ دیا اور کمرے سے باہر آگیا۔ میرداد کو گرفتار دیکھ کر پڑوس کی عورتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ آناً فاناً پولیس کے اردگرد مردوں کا ایک ہجوم راہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مردوں میں سب سے آگے میرداد کا کامریڈ

حجام تھا' جو میرداد کے کسی بھی اشارے کا منتظر تھا۔ یکدم میرداد نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیتے ہوئے حجام سے کہا۔ کامریڈ! دیکھتے کیا ہو' نکالو اپنا استرا!"

میرداد کا اتنا کہنا تھا کہ فوراً حجام نے استرا ہوا میں لہرایا۔ تھانیدار کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میرداد کے ایک زوردار جھٹکے سے تھانیدار کی پیٹی سے بندھی ہتھکڑی کی زنجیر آزاد ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ ہتھکڑی کی زنجیر ہوا میں لہرا کر تھانیدار کے جسم کا حلقہ بنتی' تھانیدار نے مع سپاہیوں کے فرار کی کوشش کی' لیکن آنکھ جھپکتے ہی گاؤں کے تمام لوگ برچھیاں بھالے اور لاٹھیاں لے کر پولیس پر چڑھ دوڑے' یہ دیکھ کر پولیس سر پر پاؤں رکھ کر یوں بھاگی کہ تھانے میں آ کر دم لیا۔

تھانیدار نے ہیڈکوارٹر کو ساری صورتحال سے مطلع کیا' جس سے پوری ضلعی انتظامیہ میں افراتفری مچ گئی۔ تمام تھانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ پولیس کی بھاری نفری سے موضع ملہو کو اپنے گھیرے میں لے کر کسی فرد کو گاؤں میں آنے اور گاؤں سے باہر نکلنے نہ دے۔ اس طرح تین چار بجے تک پورا گاؤں پولیس کے گھیرے میں تھا۔ تمام گاؤں مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ کسی بھی قیمت پر میرداد کو پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شام ہو چکی تھی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس فائرنگ کرنا چاہتا تھا لیکن مجسٹریٹ فائرنگ کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ دراصل ڈی ایس پی پولیس کی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ مجسٹریٹ کا تعلق بیدی خاندان سے تھا اور وہ مونا سکھ تھا اور انقلابی تحریکوں سے ہمدردی رکھتا تھا' بلکہ خفیہ طور پر انہیں مالی مدد بھی دیتا تھا' بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ بعض روپوش انقلابی سیاسی کارکن اُس کے ہاں پناہ بھی لیتے تھے۔

مجسٹریٹ نے آگے بڑھ کر میرداد کے کان میں کچھ کہا تو میرداد نے کہا۔ "ہرگز یہ لوگ مقابلہ نہیں کریں گے۔ آپ صرف مجھے ان سے بات کرنے کی اجازت دیں۔"

مجسٹریٹ نے پولیس کو پیچھے ہٹ جانے کو کہا۔ پولیس کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد میرداد نے لوگوں سے کہا۔ "مجسٹریٹ نے میرے کان میں لینن کا قول دہرایا ہے کہ "ایک قدم آگے بعض دفعہ دو قدم پیچھے۔" اس لیے میری پرامن گرفتاری سے پورا علاقہ تشدد سے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ میرا کیا ہوا تمام کام تہس نہس ہو جائے گا۔ میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتا ہوں۔"

اس طرح میرداد مجسٹریٹ بیدی کی موٹر سے کیمبل پور پہنچا جہاں اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹیلر خود ہی مدعی تھا' خود ہی منصف تھا۔ عدالت میں مسٹر ٹیلر نے میرداد سے پہلا سوال کیا۔ "کیا تم کمیونسٹ ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ میں کمیونسٹ ہوں یا کوئی اور شے!"

"کیا تم انقلاب کی تبلیغ کرتے ہو؟"

"انقلاب تو قدرت کا قانون ہے۔"

"کیا تم نظربندی کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے' دوسرے گاؤں تک گئے تھے؟"

"اگر برطانوی فوج اس ملک کے ہر حصے میں گھوم سکتی ہے تو میں اس ملک کا باشندہ ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ یہ میرا وطن ہے۔"

"اچھا' کیا تم مسلح جدوجہد پر یقین رکھتے ہو؟"

"میں ہر اس ذریعے اور طریقے میں یقین رکھتا ہوں' جس سے ہندوستان کی آزادی ہو سکے یا تحریک آزادی کو مدد مل سکے۔"

"کیا تم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہو؟"

"صفائی کیسی؟"

ڈپٹی کمشنر نے صرف دو ساعتوں کے بعد اپنا فیصلہ سناتے ہوئے میرداد کو اٹھارہ ماہ قید بامشقت کی سزا دی۔

فیصلہ سن کر میرداد نے مسکرا کر کہا۔ "مسٹر ٹیلر! یہ اٹھارہ ماہ تو میرے لیے اٹھارہ دن ہیں' آپ خوش ہیں کہ آپ نے انقلابی کو زنجیر پہنا دی' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں انقلاب کو گاؤں کی گلیوں اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر آزاد چھوڑ آیا ہوں' انقلاب زندہ باد' اونچا رہے گا لال جھنڈا ہمارا۔

یہ سن کر پبلک پراسیکیوٹر نے غصے میں آکر مسٹر ٹیلر سے درخواست کی کہ ملزم کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ قائم کیا جائے' لیکن مسٹر ٹیلر خاموش رہا اور عدالت برخواست کر دی۔ میرداد کو کیمبل پور جیل لے جایا گیا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ عاشق صادق جو میرداد کی جرات' حوصلے اور ولولوں سے آگاہ تھا' اسے یقین تھا کہ جیل کی یہ

سربفلک دیواریں اس کے سامنے بہت چھوٹی ہیں' اس لیے اس نے اپنی عافیت اسی عمل میں سمجھی کہ جلد سے جلد اسے کسی دوسری جیل میں منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اسے منٹگمری جیل جو پنجاب کا کالا پانی کہلواتی تھی' بھیج دیا گیا' جہاں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ہی میں کمیونسٹ پارٹی کا جز وقتی سیاسی کارکن بن گیا تھا۔

جون کے مہینے میں جب پورے ہندوستان میں کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو ان کا مقصد صرف انقلابی عناصر کو متاثر کرنا تھا کہ وہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے کوئی بڑے پیمانے پر تحریک شروع کرنے سے باز رہیں' لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ برطانوی شہنشاہیت کے جور و استبداد کے خلاف عوام کے غیظ و غضب میں شدت آگئی۔

دوسری طرف دوسری جنگ عظیم میں برطانوی سامراج اور اس کے اتحادیوں کی شکستوں نے بھی عام لوگوں کے حوصلے بلند کر دیئے جس نے سامراج دشمن تحریکوں کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اسی دباؤ نے کانگرس کو انفرادی ستیہ گری کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔

گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک اور کمیونسٹوں کی طرف سے اس تحریک کو عوامی تحریک میں تبدیل کرنے کی کوشش نے سیاسی صورتحال میں نئی ہلچل مچا دی۔ احراری تو پہلے ہی جیلوں میں تھے' بعد میں آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کو بھی جیلوں میں ڈالنا شروع کر دیا گیا۔ ستیہ گرہ کی تحریک نے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو بھی جیلوں میں بھیج دیا۔ لاہور سنٹرل جیل عارضی طور پر لاہور کے سیاسی قیدیوں کا مرکز بن گئی۔ میاں افتخار الدین بھی انفرادی ستیہ گرہ کر کے لاہور سنٹرل جیل پہنچ گئے۔ اسی جگہ نوابزادہ محمود علی اور نوابزادہ مظہر علی بھی نظربند تھے۔

ان حالات میں میرداد منٹگمری سے لاہور سنٹرل جیل میں عارضی طور پر لایا گیا' تاکہ اسے پنجاب سے نکال کر دوسرے صوبے میں بھیج دیا جائے لیکن لاہور سنٹرل جیل کے کمیونسٹ قیدیوں اور نظربندوں نے میرداد کے فرار کا انتظام کیا۔ فرار ہونے کے بعد میرداد کو ضلع لاہور کے رفقاء کے ٹھکانوں سے اچھی طرح مطلع کیا گیا۔ اس طرح جیل کے اندر ہی میرداد کو ہتھکڑی کی چابی مہیا کی گئی' تاکہ گاڑی میں سے چھلانگ لگاتے وقت

ہتھکڑی کھولنے میں آسانی پیدا ہو۔

لاہور چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر میرداد کو پولیس کی حفاظت میں فرنٹیر میل میں سوار کیا گیا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو میرداد پیشاب کے بہانے لیٹرین کے اندر داخل ہوا' جہاں اس نے حاصل کی ہوئی چابی سے ہتھکڑی کھولنے کی کوشش کی' لیکن چابی نے ساتھ نہیں دیا۔ آخر لیٹرین کا دروازہ کھول کر باہر نکلا' دروازہ بند کیا اور پھر ہتھکڑی سمیت ڈبہ کا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ گاڑی روک کر جب اس کی تلاش کی گئی تو کہیں اس کا اتا پتا نہ چل سکا۔ یہ سب کچھ مجھے مختلف کمیونسٹ ذہن رکھنے والوں سے رابطہ قائم کرکے معلوم ہوا۔

مدراسی پنڈت

ایک اتوار کو میں سید عبداللہ کے ہاں چائے پر مدعو تھا' جہاں خواجہ عبدالوحید' ابوالخیر محمد عبداللہ' عبدالماجد' شیخ غلام محی الدین' علامہ علاؤالدین صدیقی اور محمد شریف پنی ایسے علم و دانش کے پیکر جمع ہوتے تھے۔

اتوار کا دن میرے لیے بڑا ہنگامہ پرور ہوتا' کیونکہ چھٹی کا دن ہوتا تھا۔ میرے گھر میں مختلف دوست اکٹھے ہو کر تاش کھیلتے' گپیں لگاتے۔ اس روز بھی میرے گھر پر دوستوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا' لیکن میں نے ان سے منت سماجت کرکے دوپہر کو گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے سید عبداللہ کے ہاں چائے پینے کی اجازت لے لی۔

سید عبداللہ کے ہاں چائے نوشی کے ساتھ علم و دانش کے خم لنڈھائے جا رہے تھے کہ ہمارا ملازم وہاں پہنچا اور مجھے اطلاع دی کہ گھر پر مدراس سے ایک مہمان مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں' میں نے ملازم سے مہمان کا نام اور حلیہ دریافت کیا تو اس نے بتایا کوئی پنڈت ہیں۔

میں فوراً گھر پہنچا۔ دیکھا کہ ایک مدراسی پنڈت ماتھے پر تلک لگائے میرے دوستوں کے بیچ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ میں جونہی کمرے میں داخل ہوا تو وہ فوراً اٹھ کر میرے قریب آیا اور مجھ سے گلے ملتے ہی میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "میرداد!"

"میرداد" نام سنتے ہی میرے اندر تلاطم برپا ہو گیا۔ میرے لیے یہ ایک فیصلے کی

گھڑی تھی جس پر اچانک مجھے میرداد نے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اب آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو--- چند لمحے میں نے اسے اپنی باہوں میں جکڑے رکھا۔ یہ دیکھ کر دوستوں کو اندازہ ہو گیا کہ اجنبی مہمان کوئی معمولی مہمان نہیں' اس لیے سب دوست بہت جلد ہم دونوں کو تخلیہ میں مل بیٹھنے اور بات چیت کرنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔

میرداد سے رات دیر تک گفتگو جاری رہی۔

میرداد نے چلتی ٹرین سے پولیس کی نگرانی میں فرار کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔

"جب میں نے ٹرین سے چھلانگ لگائی تو میں بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کے باوجود میں کھیتوں کے درمیان بھاگتا رہا۔ جب میں سڑک پر آیا تو مجھے بھوسا لے جانے والا ایک چھکڑا دکھائی دیا جس پر باپ بیٹا سوار تھے۔ میں نے انہیں زخمی ہونے کا بتایا' لیکن میرا لباس اور حلیہ دیکھ کر انہیں مجھ پر شک ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ "اگر تم سچ بتا دو تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔" چنانچہ میں نے انہیں اصل حقیقت بتا دی جسے سن کر باپ بیٹے میں تکرار شروع ہو گئی۔ بیٹا مجھے پولیس کے حوالے کرنے پر اصرار کر رہا تھا' لیکن باپ جسے شائد تھوڑا سا سیاسی شعور تھا' وہ میری ہمدردی کر رہا تھا' لیکن بیٹا باپ کو مسلسل کسی خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ آخر باپ بیٹے میں یہ طے ہوا کہ اسے ہم اپنے پیر کے پاس لے جاتے ہیں' وہ جیسا کہیں گے ویسا ہی کیا جائے گا۔

"جب پیر صاحب نے میری پوری رام کہانی سنی تو وہ مجھے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں مجھے آرام کرنے کو کہا۔ شام تک میں نے وہاں شیو بنائی' کپڑے تبدیل کیے۔ رات کو لاہور پہنچ کر کمیونسٹ پارٹی کے رفقاء سے رابطہ کیا۔ تم سے ملنا بھی اسی رابطے کا تسلسل ہے۔"

بس پھر کیا اس کے بعد میں خفیہ کمیونسٹ پارٹی کا جز وقتی سیاسی کارکن بن گیا۔

کمیونسٹوں کی ملک گیر گرفتاریوں کے سلسلے میں عرب ہوٹل میں بیٹھنے والے کمیونسٹوں میں فیروزدین منصور بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ فیروزالدین منصور کو میں نے پہلی بار روزنامہ "احسان" کے دفتر میں دیکھا تھا' جہاں میں احسان الٰہی سے جو کہ میرا دوست بن چکا تھا ملنے گیا تھا۔ روزنامہ "احسان" میں جانے اور احسان الٰہی سے ملنے کی اصل وجہ فضل الٰہی قربان سے وہ یادگار ملاقات تھی' جو کشمیر کی سیاحت کے دوران

ہوئی۔

فضل الٰہی قربان

جب مغنی اور میں کشمیر میں تھے تو اچانک ایک روز ہماری ملاقات ایک انقلابی سے ہو گئی، ہم گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم ہی نہ تھے، لاہور کے رہنے والے بھی تھے، اس لیے اس انقلابی نے ہم سے ملنے کی شدید خواہش ظاہر کی۔

جب اس انقلابی نے ہم سے پوچھا کہ آپ لاہور میں کہاں رہتے ہیں؟ تو میں نے انہیں کوچہ چابکسواراں کا بتایا۔ ان کی دلچسپی مزید بڑھی اور انہوں نے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"ملک عبداللہ!"

میرا نام سنتے ہی وہ چونکے۔ "ارے تم ملک عمر کے بیٹے اور منشی نورالٰہی کے پوتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"ارے تم تو میرے بھتیجے ہو، میرا پورا نام ملک فضل الٰہی قربان ہے، میرا تعلق بھی ککے زئی برادری سے ہے۔ ہم وہاں ککے زئی گلی میں رہتے ہیں، تمہارا باپ اور میں شیرانوالہ اسکول میں ہم جماعت تھے۔ میں اکثر تمہارے گھر جایا کرتا تھا، تمہارے دادا سے مذہبی معاملات پر اکثر گفتگو ہوتی تھی۔"

اس تعارف کے بعد انہوں نے اشتراکیت اور کمیونزم کے بارے میں ہم سے تفصیل سے بات کی اور مجھ سے لاہور میں ملنے کا وعدہ لیا۔

لاہور واپسی پر جب میں نے دادا جان سے فضل الٰہی قربان اور اس کے خاندان کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے بتایا کہ یہ سب بھائی کشمیری بازار میں کتابوں کے تاجر اور ناشر ہیں۔ ملک فضل الٰہی، ملک احسان الٰہی، ملک نور الٰہی، اور ملک محبوب الٰہی چار بھائی ہیں۔ ملک نور الٰہی اپنے چھوٹے بھائی ملک احسان الٰہی کے نام سے روزنامہ "احسان" شائع کرتے ہیں۔

اس طرح میں روزنامہ "احسان" کے دفتر پہنچا، میری ملاقات ملک احسان الٰہی سے ہوئی اور بہت جلد ہماری دوستی ہو گئی۔ میں فضل الٰہی کی سیاسی اور فکری زندگی سے بڑا متاثر ہوا، ان کی سیاسی جدوجہد کا آغاز 1940ء سے ہوا، جب لکھنؤ کے ایک سامراج

دشمن مولانا عبدالباری فرنگی محل نے ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دے کر ایک فتویٰ جاری کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے کے لیے افغانستان کی طرف ہجرت کر جانے کی دعوت دی اور ہزاروں مسلمان قافلوں کی صورت میں افغانستان کی طرف روانہ ہوئے' تاکہ افغانستان میں فوجی تربیت حاصل کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر سکیں۔

ہندوستان میں جلیانوالہ باغ کے قومی سانحے اور ترکی میں عثمانیہ حکومت ختم کر کے انگریزوں نے ترکی کے خلیفہ سلطان عبدالحمید کو گرفتار کر لیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں خلافت بحال کرنے کے لیے جہاد کا مسئلہ پیدا ہوا اور انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے علماء نے جہاد کے لیے ہجرت کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ فضل الٰہی قربان کے دل میں افغانستان پہنچ کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا جذبہ کچھ اس انداز سے ابھرا کہ انہوں نے اپنے ایک ہم جماعت عبدالقوی سے افغانستان جانے کے لیے تفصیل حاصل کی' وہ گھر سے چوری چھپے فرار ہو کر افغانستان جانے کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچے تو کسی واقف کار نے پہچان کر گھر والوں کو اطلاع کر دی' چنانچہ فضل الٰہی قربان کے ماموں فوراً ریلوے اسٹیشن پہنچے اور انہیں گھر لے آئے' بڑی ڈانٹ ڈپٹ کی اور ایسی حرکت نہ کرنے کے لیے سختی سے کہا۔ فضل الٰہی قربان اس وقت تو چپ رہے' لیکن چند روز کے بعد موقع پا کر ریل گاڑی کے ذریعہ لاہور سے پشاور پہنچ گئے۔

پشاور ریلوے اسٹیشن پر "مجاہدین کمیٹی" کے رضاکار موجود تھے۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج پہلا قافلہ براستہ "جمرود" کابل روانہ ہو چکا ہے' اس طرح دوسرے دن صبح جو قافلہ روانہ ہونا تھا' اس میں فضل الٰہی قربان بھی شامل تھے' لیکن جب فضل الٰہی قربان کو یہ اطلاع ملی کہ ان کا ماموں بھی ان کی تلاش میں پشاور پہنچ چکا ہے تو وہ "خلافت کمیٹی" کے رضاکاروں کی مدد سے پشاور کے ایک محلے میں کسی مکان کے تہہ خانہ میں چھپ گئے۔

پشاور میں جب فضل الٰہی قربان کا کہیں پتا نہ چلا' تو ان کے ماموں نے جمرود چوکی پر اطلاع بھجوا دی کہ اس حلیے اور اس نام کے لڑکے کو یہاں سے ہرگز نہ گزرنے دیا جائے' اگر وہ ضد کرے تو اسے گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دیا جائے۔

"مجاہدین کمیٹی" کے رضاکار اس کاروائی سے آگاہ ہو چکے تھے' اس لیے انہوں نے فضل الٰہی قربان کو کسی اور راستے سے بھجوانے کا سوچا اور "سمرقند" مہاجر تحریک کے ایک رہنما مولانا عبدالرحیم پوپلزئی سے مل کر مشورہ کیا۔ انہوں نے فضل الٰہی قربان کو تین پٹھان نوجوانوں کے ہمراہ آزاد قبائل کے راستے افغانستان کی طرف لے جانے کا حکم دیا' چنانچہ پانچ آدمیوں کا یہ مختصر قافلہ افغانستان کی طرف روانہ ہوا اور دشوار گزار مسافت کے بعد بالاخر کابل پہنچ گئے۔

اس وقت تک ہزاروں مہاجر قافلوں کی صورت میں کابل پہنچ چکے تھے' جنہیں کابل شہر سے دس بارہ میل دور "جبل السراج" کے مقام پر رکھا گیا تھا' ان کی رہائش اور کھانے پینے کا بھی بندوبست کر کے انہیں حکومت کی طرف سے یہ مشورہ دیا گیا کہ افغانستان میں رہ کر وہ اپنے لیے کام پیدا کریں' جو لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہیں وہ افغانیوں کو تعلیم دیں اور جو ہنرمند ہیں وہ اپنا کام کریں' افغانستان کی حکومت انہیں کابل کے دور دراز علاقے میں زمین دے کر آباد کرنا چاہتی تھی۔

افغانستان پہنچنے والے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں میں تو بس ایک ہی جذبہ سمایا ہوا تھا کہ وہ وہاں سے فوجی تربیت اور اسلحہ لے کر ہندوستان واپس آئیں اور انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیں' مگر وہاں پہنچتے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ تو یہاں محض عارضی پناہ کے لیے آئے ہیں' چنانچہ انہوں نے افغانستان کے امیر امان اللہ خان سے درخواست کی کہ انہیں ترکی کے صوبہ "اناطولیہ" میں جانے کی اجازت دی جائے' جہاں ترکی کے رہنما "کمال اتاترک" انگریزوں سے برسرپیکار تھے' مگر افغانستان حکومت نے اس درخواست کا کوئی مثبت جواب نہ دیا' اس پر درخوست گزار نوجوانوں نے افغانستان حکومت کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر انہوں نے ان کو آگے جانے کی اجازت نہ دی' تو وہ زبردستی "اناطولیہ" کی طرف چلے جائیں گے۔ اس پر صرف ایک سو ہندوستانیوں کو افغانستان کے آخری سرحدی شہر مزار شریف کی طرف جانے کی اجازت دی گئی۔ اصل میں افغانستان کی نئی حکومت کچھ عرصہ پہلے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑ چکی تھی اور امیر امان اللہ کے برسراقتدار آنے کے بعد انگریزوں نے ایک معاہدے کے ذریعے افغانستان کی آزادی و خود مختاری تسلیم کرلی تھی اس لیے افغانستان حکومت

ان مہاجرین کو فوجی تربیت دینے پر آمادہ نہ تھی۔

مزار شریف پہنچنے کے بعد آخر اس قافلے میں بھی شدید اختلافات پیدا ہو گئے' کچھ لوگ وہیں سے واپس جانے پر آمادہ ہو گئے جبکہ چودہ آدمیوں کا ایک گروہ دریائے "آمو" کو کشتیوں کے ذریعے عبور کرکے روس کے پہلے سرحدی شہر "ترمیز" میں جا پہنچا۔

دریائے آمو کے کنارے ترمیز ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا' جہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم تھی۔ بالشویک پارٹی کے رہنماؤں' فوجی افسروں اور شہریوں نے اس قافلے کا شاندار استقبال کیا' سب سے پہلے سرخ فوج کے ایک مشیر نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے خطاب کیا اور بالشویک پارٹی کے مقامی سیکریٹری نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ آپ کی تحریک خلافت اور ہجرت تحریک مذہبی تحریکیں ہیں' لیکن ان کی جڑیں آپ کی خواہش آزادی میں پیوست ہیں اور یہ تحریک آپ کی جدوجہد آزادی کا ایک اہم حصہ ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کے فوجی تربیت حاصل کرکے ہندوستان میں ایک مسلح جدوجہد کا آغاز کرنے کے جذبے کی ہم قدر کرتے ہیں' کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنے نیک ارادوں میں بالاخر کامیاب ہوں گے۔ مگر اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ آپ طویل عرصہ تک برطانوی سامراج کے خلاف اپنی جنگ آزادی جاری رکھنے کی تیاری کریں۔ کیونکہ ہم نے زار شاہی کے دور میں اسی طرح ایک طویل عرصے تک مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے زیر اثر ایک جدوجہد کی ہے۔ جس میں ہمارے سینکڑوں محب الوطن نوجوان پھانسیوں پر چڑھائے گئے' ہزاروں کو سائبریا کے دور دراز برفانی علاقوں میں جلاوطن کیا گیا' جہاں ہزاروں انسانوں نے سسک سسک کر اپنی زندگیاں ایک سوشلسٹ انقلاب کی نذر کردیں۔ مگر ہماری بالشویک پارٹی نے اپنی زیر زمین تنظیموں اور تحریکوں کے ذریعے مزدوروں' کسانوں' طالب علموں اور دانشوروں میں ایک عرصے تک سوشلزم کی مارکسی تعلیمات پھیلا کر طبقاتی جذبات و احساسات اور شعور پیدا کیا اور بالاخر اپنے عظیم کامریڈ لینن کی قیادت میں نہ صرف زار شاہی کو ختم کیا' بلکہ ملک میں امیروں اور سرمایہ داروں کا بھی خاتمہ کرکے مزدوروں اور کسانوں کی اپنی حکومت قائم کردی۔ دنیا میں مزدوروں اور کسانوں کے ہتھوڑا اور

درانتی والے جھنڈے لہرا دیئے اور اب یہ دنیا بھر کے محنت کشوں مزدوروں، کسانوں اور آزادی پسند اور آزادی پسند مظلوم طبقوں کا اپنا ملک ہے۔ ہم آپ کی اس جدوجہد آزادی و خود مختاری میں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کو فوجی تربیت کے ساتھ ساتھ نظریاتی اور سیاسی تعلیم بھی دیں گے اور جب تک آپ اپنے ملک میں جاکر اپنی آزادی کی یہ جدوجہد شروع کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے، آپ ہمارے مہمان ہوں گے اور آپ کو اپنی حکومت میں برابر کے شہری تصور کریں گے۔

مجاہدین نے جب انہیں اپنی اگلی منزل کا بتایا، تو انہوں نے کہا کہ ترکی کی طرف روانگی میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ پہلے جنگ عظیم کے دوران یہاں سے چارہ جوئی تک ریلوے لائین اٹھالی گئی تھی، اس لیے اب وہاں تک کا سفر صرف دریا کے ذریعے ہی طے کیا جاسکتا ہے، دریا میں اسٹیمر چلتا ہے، جو آپ کے آنے سے دو روز پہلے یہاں سے روانہ ہوچکا ہے۔ اب وہ ایک ماہ بعد آئے گا، اس لیے آپ کو ایک ماہ تک اس کا انتظار کرنا ہوگا، آخر کار انہوں نے دریا میں کشتیوں کے ذریعے سفر شروع کردیا، راستے میں امیر بخارا کے زیر اثر باس میچی قبیلہ کے ترکمانوں نے، جو بالشویکی انقلاب کے خلاف تھے، انہیں کشتیوں سے اتار لیا۔ جامہ تلاشی کے بعد سارا ساز و سامان اور تلواریں اور اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا اور انہیں ایک خستہ حال سرائے میں لے گئے، تاکہ انہیں امیر بخارا کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ قاضی شہر کے حکم سے انہیں قیدی بنا لیا گیا، اس طرح اس گروپ کی مزید تقسیم کرکے ان سے بے گار لی گئی۔ چند روز کے بعد جب انہیں اطلاع ملی کہ سرخ فوج ان پر حملہ کرنے والی ہے تو ترکمان وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس طرح گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ بہت سے مہاجر (مجاہد) بھی لاپتہ ہو گئے، باقی ماندہ کو سرخ فوج نے چارہ جوئی کے راستے باکو جانے کے لیے ایک اسٹیمر کے ذریعے روانہ کردیا۔ اس طرح یہ لوگ چار دن کی طویل مسافت کے بعد چارہ جوئی پہنچے۔

چارہ جوئی میں یہ قافلہ دو گروپوں میں بٹ گیا، ایک گروپ جو دادا فیروزالدین منصور اور شوکت عثمان وغیرہ پر مشتمل تھا، باکو جانے کے بجائے واپس ہو کر کرگان کے راستے بخارا اور بخارا سے ہوتا ہوا تاشقند پہنچا، جہاں انہیں "ہندوستانی" گھر میں ٹھہرایا گیا، انہیں ایک فوجی اسکول میں داخل کرکے ان کے لیے فوجی تعلیم و تربیت کا انتظام

بھی کر دیا گیا' دوسرا گروپ باکو کے راستے ترکی جانے پر مصر رہا۔ اس گروپ میں فضل الٰہی شامل تھے' لہٰذا انہیں بذریعہ ریل پہلے بحیرہ کیسپئن کے کنارے ایک چھوٹی بندرگاہ عاشق آباد میں پہنچایا گیا' وہاں سے یہ بحری جہاز میں سوار ہو کر بحیرہ کیسپئن کے راستے باکو کی طرف چلے گئے۔

"باکو" ایک صنعتی شہر ہے جہاں جہاز سازی کے چھوٹے کارخانے اور تیل صاف کرنے کا بڑا مرکز موجود تھا۔ یہاں کے علاقائی افسروں نے اس گروپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور پھر انہیں ترکی سفارت خانے کے ایک شعبہ کے سپرد کر دیا۔ جنہوں نے انہیں ایک ایسے غلیظ گودام میں رکھا' جس میں پہلی جنگ عظیم کے دوران زار شاہی کے ترک قیدی رکھے جاتے تھے' تاکہ وہ اپنے وطن لوٹ جائیں' لیکن ہندوستانی مہاجر جو ترکی کی جنگ آزادی میں حصہ لینا چاہتے تھے' انہیں اس مقصد سے روکنے کے لیے یہاں سے آگے نہ جانے دیا گیا تو ان میں اکثر بے زار ہو گئے' چنانچہ آٹھ افراد کا ایک چھوٹا سا گروہ جس میں فضل الٰہی قربان بھی شامل تھے' واپس تاشقند لوٹنے پر آمادہ ہو گئے' جبکہ باقی ماندہ لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے بعد ترکی سفارت خانے والے "اناطولیہ" لے گئے۔

فضل الٰہی قربان تاشقند میں اپنے بچھڑے ساتھیوں سے آملے اور یہاں انقلابی کونسل کی طرف سے قائم کیے گئے ایک فوجی اسکول میں داخل ہو گئے' فضل الٰہی قربان نے اپنے ساتھیوں سمیت اس مصری اسکول میں فوجی تربیت مکمل کی۔ یہ فوجی اسکول بنگال کے ایک انقلابی رہنما ایم این رائے اور آبانی مکرجی کے زیر نگرانی کام کر رہا تھا۔ ایم این رائے اپنی بیوی ایلن رائے کے ساتھ تاشقند کی ایک بڑی عمارت "ریف کم" کے انقلابی کمیٹی گھر میں رہتے تھے' کامریڈ لینن نے انہیں ہندوستان میں انقلابی تحریک چلانے کی ساری ذمہ داری سونپ رکھی تھی۔

فضل الٰہی قربان کو ایک سال کی فوجی تربیت کے بعد دیگر کئی انقلابیوں سمیت ایم این رائے کی ہدایت پر ماسکو میں اعلیٰ نظریاتی تعلیم کے لیے بھیجا گیا' جہاں وہ مشرقی یونیورسٹی کے ہندوستانی سیکشن میں داخل ہو گئے' وہاں سے انہوں نے سوشیالوجی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد روس کے انقلابی رہنما بورڈ سے بھی خفیہ

انقلابی تحریکوں میں کام کرنے کی تربیت حاصل کی' یہاں شب و روز کی انتھک محنت اور دماغی کام کرنے سے ان کی صحت متاثر ہوئی' ڈاکٹروں نے انہیں صحت کی بحالی کے لیے کاکیشیا "قفقاز" کے علاقے میں بھجوادیا' جہاں دنوں میں ان کی صحت بحال ہو گئی۔

فضل الٰہی قربان ماسکو میں چار سال کے سوشیالوجی کورس کے بعد سوشلزم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وہاں کی Red Academy میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے منتخب ہو چکے تھے۔ لیکن خواہش کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکے کیونکہ ہندوستان میں بھی مزدور تحریکیں بڑی تیزی کے ساتھ شاندار طریقہ سے ابھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ خاص کر شمالی ہندوستان میں ریلوے مزدوروں اور محنت کشوں نے بھرپور انداز سے جدوجہد شروع کر دی تھی۔

فضل الٰہی کو روسی رہنماؤں کی مدد سے برلن' ہیم برگ اور پھر فرانس سے سوئیزرلینڈ کے راستے اٹلی کے شہر میلان بھیجا گیا' جہاں وہ پان اسلامک تحریک کے ایک رہنما کی نگرانی میں نواحی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت کے گھر روپوش رہے۔ جب گیارہ مہینے کے بعد بھی یورپ کے راستے ہندوستان جانے کا کوئی راستہ نہ ملا تو روسی رہنما انہیں دوبارہ ماسکو لے آئے' جہاں سے انہیں افغانستان کی سرحد پر پہنچا دیا گیا۔ وہ روسی رہنماؤں کے ذریعے مختلف قبائلی علاقوں سے گزر کر پشاور پہنچے اور پھر گاڑی کے ذریعے کلکتہ آئے۔ انہوں نے بنگال کے نوجوانوں انقلابیوں اور مزدوروں سے ملاقاتیں کیں۔ کلکتہ اس وقت دہشت گردی کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ چٹاگاؤں کے انقلابیوں کی مسلسل جدوجہد کی وجہ سے یہاں پکڑ دھکڑ عام تھی' چنانچہ اپنے انقلابی دوستوں سے مشورے کے بعد وہ بمبئی آ گئے۔

بمبئی میں ہندوستان گیر کمیونسٹ پارٹی بنانے کے لیے زیر زمین سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں فضل الٰہی قربان کے علاوہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے دو مشہور رہنما "بریڈلے" اور "سپرائٹ" کو بھی ہندوستان بھیجا گیا۔ بریڈلے ایک اچھے ٹریڈ یونینسٹ تھے' جبکہ سپرائٹ ٹریڈ یونینسٹ کے علاوہ ایک کمیونسٹ کالم نگار اور دانشور تھے۔

بمبئی میں فضل الٰہی قربان کمیونسٹ پارٹی کے ایک رکن کی دکان میں رہنے لگے'

بریڈلے اور سپرائٹ سے ان کا مسلسل رابطہ تھا۔ ایک رات انہیں دکان کے قریب سے مشکوک آدمی کے طور پر گرفتار کرلیا گیا۔ خفیہ پولیس کو شبہ تھا کہ ان کا رابطہ مسٹر سپرائٹ سے ہے' لیکن فضل نے اس الزام سے انکار کیا' آخر ان پر مقدمہ بنایا گیا کہ یہ نوجوان فضل الٰہی سمرقندی ہے' جو آزاد قبائلی علاقہ میں مقیم ہے اور وہاں سے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی ہند چلا رہا ہے' لیکن حکومت یہ ثابت نہ کر سکی' البتہ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ نوجوان کمیونسٹ ہے اور ماسکو سے پڑھ کر آنے والے نوجوانوں میں شامل ہے اور اس نے اپنا نام تبدیل کر رکھا ہے' چنانچہ انہیں 1927ء میں پشاور کمیونسٹ کیس میں جیل بھیج دیا گیا۔

بمبئی جیل سے پشاور اور پھر پشاور میں چھ مہینے کی قید سخت کے تحت فضل الٰہی قربان نے پھر سے مزدوروں کی ملک گیر بنیادوں پر تنظیم شروع کر دی' تاکہ مزدوروں کو بیدار اور باشعور کر کے انہیں ان کے بنیادی حقوق دلائے جائیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے پنجاب کے مختلف علاقوں میں کپڑا بننے والی ملوں سے لے کر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے مزدوروں اور ٹریڈ یونینوں سے رابطے بڑھائے۔ اس طرح فضل الٰہی قربان کا شمار ممتاز اشتراکی راہنماؤں میں ہونے لگا۔

1934ء میں جب نوجوان بھارت سبھا کو بھی حکومت نے خلاف قانون قرار دے کے اس کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی' تو پنجاب میں ایک صوبائی سوشلسٹ پارٹی قائم کی گئی۔ اس سے قبل جے پرکاش نارائن کی رہنمائی میں مرکزی سوشلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا' امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں جب سوشلسٹ پارٹی کی صوبائی شاخ کی کانفرنس منعقد ہوئی تو یہاں سوشلسٹ پارٹی نے کانگرس سوشلسٹ پارٹی سے الحاق کرنے کا فیصلہ کر لیا' چنانچہ کانگرس سوشلسٹ پارٹی پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔

نئے سیاسی سماجی اور معاشی حالات کے پیش نظر پورے ملک میں سوشلسٹ پارٹی کو بھی منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا' پنجاب میں پارٹی کی صوبائی کمیٹی میں فضل الٰہی قربان' فیروز الدین منصور' میر عبدالمجید لاہوری' کرم سنگھ مان' سوہن سنگھ جوش' اور کیدار ناتھ شرما ایسے ممتاز کامریڈ شامل کیے گئے۔

فضل الٰہی قربان انڈر گراؤنڈ لیبر ونگ میں بڑی مستعدی سے کام کرنے لگے اور

ساتھ ہی فیروزالدین منصور کے ساتھ مل کر لاہور میں "پروگریسو پولٹیکل بک ڈپو" کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی اور مزدوروں میں سیاسی اور طبقاتی شعور پیدا کرنے کے لیے کتابوں اور پمفلٹوں کو شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا' اس سلسلے میں انہوں نے کارل مارکس کے کتابچے' کمیونسٹ مینی فیسٹو' قدر و قیمت اور منافع اور اجرتی محنت اور سرمایہ ایسی کتابیں اور پمفلٹ اردو میں شائع کئے۔

میں کشمیر میں ہی تھا کہ مجھے دوستوں نے اطلاع دی کہ سپلیمنٹری امتحان کے لیے میری درخواست منظور ہوگئی ہے' انٹرمیڈیٹ سپلیمنٹری امتحان پاس کرنے کے بعد مجھے گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر میں داخلہ نہ ملا' چنانچہ میں نے ایف سی کالج میں داخلہ لے لیا' یہ کالج مجھے گھر سے بہت دور پڑتا تھا' اس لیے دادا جان کی رضامندی سے میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں آگیا' اسلامیہ کالج کی سیاسی فضا گورنمنٹ کالج اور ایف سی کالج سے زیادہ گھمبیر تھی' یہاں تمام طالب علم مسلمان تھے اور سب کا رجحان زیادہ تر سیاست اور مذہب کی طرف تھا۔ کشمیر سے واپسی کے بعد میں اشتراکیت میں خاصی دلچسپی لینے لگا تھا' میرا خاندانی پس منظر مذہبی اور سیاسی تھا' لیکن اس پر مذہبی رنگ گہرا تھا۔

مولانا احمد علیؒ کے صاحبزادے حبیب اللہ میرے بہترین دوستوں میں سے تھے' ہم دونوں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے قتیل تھے اور اکثر مذہب اور سیاست کی باتیں ابوالکلام آزاد کے حوالے سے کرتے تھے' لیکن کشمیر سے واپسی کے بعد اشتراکیت کی طرف میرا رجحان اس قدر بڑھا کہ میں اکثر روزنامہ "احسان" کے دفتر میں احسان الٰہی سے ملنے جاتا' احسان الٰہی کے ذریعے میرا تعارف بہت سے ادیبوں اور صحافیوں سے ہوا' جن کے ذریعے میں نے مختلف ادبی رسالوں اور اخبارات میں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اپنے لیے میں نے عبداللہ بن عمر نام پسند کیا اور "اشتراکیت اور مذہب" کے حوالے سے ایک مضمون تحریر کیا۔ یہ مضمون اشتراکیت سے میری دلچسپی کی نشاندہی کرتا تھا ورنہ اس وقت تک نہ تو مجھے صحیح معنوں میں مذہب کا کچھ پتا تھا اور نہ ہی اشتراکیت کے بارے میں کوئی صحیح معلومات تھیں' یہ مضمون لے کر میں روزنامہ "احسان" کے دفتر پہنچا۔ احسان الٰہی نے میری ملاقات روزنامہ "احسان" کے ایڈیٹر انعام اللہ ناصر سے کرائی تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی جس طرز عمل کا اظہار کیا۔ وہ میرے لیے خاصا

حیران کن بلکہ پریشان کن تھا' کیونکہ انہوں نے مجھ سے کہا' بھئی ابھی تم رعنا ہو۔ ان سنجیدہ اور فلسفیانہ تحریروں کو چھوڑ کر ہلکی پھلکی شاعری کے ذریعے رومانی جذبات اور احساسات کا اظہار کرو۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو نثر میں افسانے اور انشائیے لکھو۔ میں اپنے تجربات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ انہوں نے میرے لیے "نسیم" تخلص تجویز کیا' اس طرح میں عبداللہ بن عمر کے بجائے عبداللہ نسیم بن گیا اور پھر آزاد شاعری کی' جو ہفتہ وار "مست قلندر" میں شائع ہونے لگی' مختلف ادبی رسالوں میں میرے انشائیے اور افسانے بھی شائع ہونے لگے۔ میں اپنے آپ کو ادیبوں اور شاعروں کی صف میں کھڑا کرنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن میں نے بہت جلد محسوس کیا کہ یہ سب کچھ میں ایک ایسے شخص کے لیے کر رہا ہوں جو صرف اپنے نا آسودہ جذبات کو تسکین دے رہا ہے' چنانچہ میں نے بہت جلد راستہ بدل لیا۔

اسلامیہ کالج میں میری سب سے زیادہ دوستی عبداللہ بٹ سے ہوئی۔ عبداللہ بٹ کالج کے میگزین کریسنٹ کے ایڈیٹر تھے۔ وہ اس وقت فورتھ ایئر میں تھے۔ میرا ادبی' سیاسی اور مذہبی رجحان دیکھتے ہوئے عبداللہ بٹ نے سب سے پہلے میرا نام ایک ایسے مباحثہ میں لکھوا دیا تھا۔ جس کا موضوع میری دسترس سے باہر تھا' یعنی "کانگرس کا سیاسی کردار" لیکن میں نے عبداللہ بٹ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میرے لیے یہ موضوع مشکل ہے۔ کیونکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس موضوع پر میں کہیں سے بھی ایک جامع تقریر لکھوا سکتا ہوں۔

اسلامیہ کالج میں داخلے کے بعد میرے دادا جی نے مجھے ابوالخیر سے فارسی پڑھنے کے لیے پابند کر دیا۔

ابوالخیر میرے والد کے دوست تھے اس لیے وہ بھی میری تعلیم و تربیت میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے' چنانچہ انہیں جب میں نے کالج میں مباحثہ کے لیے کہا تو انہوں نے کہا۔ "بھئی میرے قریبی دوستوں میں صرف سید عبداللہ ہے جسے سیاست سے گہری دلچسپی ہے۔ میں تمہیں ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں' مجھے امید ہے وہ اس سلسلے میں تمہاری صحیح

رہنمائی کرے گا۔"

میں رقعہ لے کر سید عبداللہ کے پاس پہنچا۔ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ ان کا چہرہ خاصا شناسا تھا' گورنمنٹ کالج جاتے ہوئے میں انہیں اکثر لائبریری کی طرف جاتے دیکھتا تھا' رقعہ پڑھ کر سید عبداللہ نے پوچھا۔ "بھئی تم ابوالخیر کو کیسے جانتے ہو؟"

میں نے انہیں بتایا کہ ابوالخیر میرے والد کے قریبی دوست تھے' یہ سن کر انہوں نے پوچھا۔ "تم کس کے بیٹے ہو؟"

میں نے کہا میرے والد کا نام محمد عمر ہے اور میں کوچہ چابکسواراں میں رہتا ہوں۔ "ہوں' جبھی ابوالخیر نے تمہیں میری طرف بھیجا ہے۔" اور پھر سید عبداللہ نے مجھے بتایا کہ ابوالخیر کا نام بھی تمہاری طرح عبداللہ ہے اور اس کے والد خلیفہ سعد الدین تمہاری دادی جان کے والد کی مسجد کے امام تھے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ اس مسجد میں رہتا تھا۔ میں بھی جب حویلیاں (ہزارہ) سے میٹرک کے امتحان کے لیے لاہور آیا تو اپنے چچا سید لال شاہ کے پاس ٹھہرا' جو سریانوالہ بازار کی مسجد میں امام تھے۔ میں نے بھی مدرسہ نعمانیہ میں جہاں مولانا غلام مرشد عربی اور منطق پڑھاتے تھے' پڑھا ہے۔ میں مولانا احمد علی کے قرآن و حدیث کے درس میں شامل ہوتا رہا' میں 1932ء تک اندرون شہر لاہور میں رہا اور پھر اورینٹل کالج کے ہوسٹل میں آکر میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا یعنی "پھول منزل" میں۔

میں جب سید عبداللہ سے ملا' تو وہ اس وقت گوالمنڈی میں سبزی منڈی کے قریب پھول بلڈنگ کی بالائی منزل میں رہتے تھے' پھول بلڈنگ میں دارالاشاعت تھا' جہاں بچوں کے لیے رسالہ "پھول" اور عورتوں کے لیے "تہذیب نسواں" شائع ہوتا تھا' دارالاشاعت' شمس العلماء ممتاز علی نے شروع کیا تھا' ان کے بیٹے امتیاز علی تاج تھے۔ اس ملاقات کے بعد سید عبداللہ سے ایک نئی طرح کی عقیدت اور دوستی کا آغاز ہوا اور پھر ہمیشہ رہا۔

انعام اللہ ناصر

مال روڈ پر Lorangs اور Stiefels اور انارکلی میں میجسٹک' اور اسٹیڈرڈ کی

ہوٹلنگ تھی جہاں شراب تھی، کے بَرے ڈانس تھا، میوزک تھا، لیکن اب میرا ظہوری ہوٹل، عرب ہوٹل، نگینہ بیکری یا پھر دہلی مسلم ہوٹل میں آنا جانا زیادہ ہوگیا۔

سرکلر روڈ پر ظہوری ہوٹل شاہ محمد غوث کا تھا، جس میں سیاسی کارکن اور صحافی زیادہ بیٹھتے تھے کیونکہ وہ بیرون اکبری دروازہ اور دہلی دروازہ کی وجہ سے بڑا دلفریب تھا۔ یہیں پر "احسان" سیاست اور زمیندار کے علاوہ مجلس احرار کا دفتر بھی تھا۔

انارکلی نیلا گنبد کے پاس نگینہ بیکری تھی، جہاں اورینٹل کالج، لاء کالج اور گورنمنٹ کالج کے استاد اور طالب علم بیٹھتے تھے، ان تمام ہوٹلوں میں چائے کی میز پر شعروادب، صحافت، سیاست اور ثقافت کے بارے میں بات چیت ہی نہیں، بحث و مباحثہ بھی ہوتا، جو خاص و عام کی دلچسپی کا باعث بنتا تھا۔

روزنامہ "احسان" میں جب بھی میں احسان الٰہی سے ملنے جاتا وہاں انعام اللہ ناصر سے ضرور ملاقات ہوئی، میں ان سے اپنا دامن ہی نہیں بچاتا تھا، بلکہ آنکھیں بھی چرانے لگا تھا، لیکن اسے بھی انہوں نے ادائے معشوقانہ سمجھ لیا۔ اب وہ مجھ سے خطوط کے ذریعے مخاطب ہونے لگے۔

786

24 مارچ 1938ء
موج نسیم

الا اے طوطی گویائے اسرار
مبادا خالیت شکر زمنقار
سرت سرسبز و دولت باد جاوید
کہ خوش نقشے نمودی از خط یار

مبارک! وہ معمہ حل ہوگیا، مہربان آقا نے نووارد خادم سے دریافت کیا؟ بندہ نواز تمہیں کس نام سے پکارا جائے؟ خادم نے مؤدبانہ عرض کیا، حضور جن الفاظ سے یاد فرمائیں وہ بندے کے لیے سرمایہ فخر و مباہات ہوں گے۔ وہ تقدیر آزمائی ناکام رہی، لیکن یہ تو معلوم ہوگیا کہ خدا بے وطنوں کی نسبت وطن پر زیادہ مہربان ہے، بظاہر راہ بے خطر ہے، لیکن دوبارہ قدم رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ احتیاط نے ٹوٹی ہوئی ہمت کو

زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ تکلف موزوں "القاب" کی تلاش میں پنجاب پبلک لائبریری سے مدد چاہتا ہے' دیکھئے یہ بے اعتمادی کب۔

تراز گردش گردون دوں گزند مبار
تنت بناز طبیباں نیازمند مبار

ایک بے وطن کرم نگر مصری شاہ

تاریخ اس لیے نہیں لکھی کہ آج نئے مہینہ کا پہلا دن ہے۔

ہر شب دریں امیدم کہ نسیم صبح گاہی
بہ پیام آشنائے بنوازد آشنارا

واردات: وہی کوچہ وہی مکان' میں چارپائی کے قریب بیٹھا ہوں' مزاج پرسی کے جواب میں ارشاد ہوا۔ "دہلی جانے کا ارادہ ہے۔" میں نے پوچھا۔ "کیوں؟" فرمایا۔ "دیکھتے نہیں حالت کیا ہے؟" یہ آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ حواس نے بیدار ہو کر وہ دریچہ جس سے روح فردوس کی طرف جھانک رہی تھی' بند کر دیا۔ ابھی آنکھ نہیں کھلی تھی کہ مرغ سحر کی بانگ محلے کی اونچی دیواروں سے ٹکرا کر لحاف کے اندر آگئی۔ سید انشاء اللہ انشاء۔

وہ دیکھا خواب قاصر جس سے اپنی زباں اور ہم
کہ گویا ایک جا ہے جس میں وہ نوجواں اور ہم

تین بجے کے قریب سونے کی تیاری کی تو معلوم نہیں خیالات کا ہجوم کب منتشر ہوا اور کس وقت آنکھ لگی' طبیعت آنے والے دن کے ہنگامے کو برداشت کرنے کے لیے تیار تو نہ تھی۔ بہ کراہت' اٹھا' منہ ہاتھ دھو کر' چاہا کہ خدا کی جناب میں سرنیاز جھکاؤں' فضا میں سفیدی مائل زرد رنگ کی شعاعیں مصروف خرام نظر آئیں' رفع شک کے لیے باہر نکل کر دیکھا تو آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔

صبح دم چوں رخ نمودی شد نماز من قضا
سجدہ کے باشد روا چوں آفتاب آید بروں

اور دنیا اب بھی یہی کہتی ہے کہ اس راہ میں کوئی خطرہ نہیں۔

قدم شوق پیشتر بہتر

یہ تو آپ بیتی تھی اب جگ بیتی بھی سن لیجئے۔

یہاں کا تو قصہ چھوڑو میاں
کہو اب ادھر کی بھی کچھ داستاں

آپ جانتے ہوں شاید وہ جو بظاہر اجڑے دیار کو از سرنو آباد ہوتے دیکھنا نہیں چاہتے ایک نظر جلوہ بہار دیکھنے کے لیے دہلی دروازے کے باغ کے قریب جاتے ہیں' نقاہت نے ہرچند کہا' کیا غضب کرتے ہو' احسان کس کا؟ نقصان کس کا؟ اس تیز دھوپ میں کہاں چلے؟ یہ ندیدہ پن' یہ اضطراب کیوں ہے؟ بیچاری کی منت سماجت کا کچھ اثر نہیں ہوتا' اس ہٹ کے قربان جایئے' ایک دھن ہے کہ اس میں بیماری اور کمزوری کی کچھ پروا نہیں' ایک خیال ہے کہ اس نے تمام مصلحت اندیشوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ع

ہم جائیں گے اور ضرور جائیں گے

اس کمرے میں' اس گھر میں تسکین نہیں مل سکتی' اللہ اللہ ایک زمانہ تھا کہ خریدار یوسف کو تلاش کرتے تھے؟ محبت اور ملاقات یہ دونوں۔ ع

اتفاقات ہیں زمانہ کے

اور زمانہ کبھی نہیں چاہتا کہ ایسے اتفاقات اکثر ہوتے رہیں۔

یہ دو دل کو یکجا بٹھاتا نہیں
کسی کا اسے انس بھاتا نہیں

باغبان نے کہا میاں گھر کی راہ لو' یہاں بہار وہار نہیں ہے' خیالی عیش کا وہ پلاؤ جو بخار کی گرمی نے دل و دماغ میں پکایا تھا۔ اس جواب سے بے مزہ ہوگیا' واپسی میں بالائی منزل کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو کسی گوشے سے آواز آئی۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ

دعوت نامہ جس کی بشارت دی گئی ہے' غالباً شام کو چھ بجے ملے گا۔ اب ساڑھے دس بجے ہیں۔ مصافحہ' آئندہ ملاقات کے لیے انکار کیا گیا' ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ کیوں کی جاتی ہے؟

بفضل تعالیٰ یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت مطلوب---- بہار بے خزاں!

ناصر یوپی کے ایک گاؤں حسن پور کے تھے۔ لاہور میں ان کے علم و ادب اور زبان و بیان کا اس قدر شہرہ تھا کہ وہ نہ صرف روزنامہ "احسان" کے ایڈیٹر رہے بلکہ بہت سے دوسرے علمی ادبی جریدوں میں بھی ان کا بڑا عمل دخل رہا۔

اگست میں اپنے گاؤں جاتے ہوئے انہوں نے پہلے دہلی سے ایک مختصر خط تحریر کیا۔

از دہلی چاندنی چوک

3-اگست 1938ء

حسن پور یا جانب طور لے چل
جہاں تجھ کو جانا ہو منظور لے چل
چھڑایا جو چابکسواراں کا کوچہ
تو اے وحشت دل کہیں دور لے چل

خدا کے فضل سے یہاں بخیر و عافیت پہنچ گیا ہوں 'گیارہ بجے دوسری ٹرین مراد آباد کی طرف جاسکے گی' اس میں سوار ہو کر تین بجے کے قریب گھر پہنچ جاؤں گا اور وہاں پہنچ کر بھی اطلاع دوں گا۔

والسلام' آپ کا ناصر!

دوسرا خط 15-اگست کو حسن پور سے تحریر کیا۔

محسنم!

اگر یہ القاب موزوں ہے تو قبول فرمائیں ورنہ گستاخی معاف! گرامی نامہ جو شب عشق سے زیادہ مختصر تھا' وصول ہو کر قدرے تسلی کا باعث ہوا' اس عنایت کا شکریہ زبان قال سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ بامراد اور شاد رکھے' آمین!

آپ کی اختصار پسندی اس سے زیادہ کہنے کی اجازت نہیں دیتی ورنہ سخن بسیار است۔

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ کام آتی ہیں پیش یار تقریریں کہیں

خیر خیریت کا منتظر' آپ کا خادم--- ناصر!

حسن پور
20- اگست 1938ء
نسیم سحر!

تسلی نامہ موصول ہو کر باعث کشادہ خاطر ہوا' بندہ نوازی کا شکریہ' اب کی بار بھی اسی اجمال و اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

ہے بزم بتاں و سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

اور لطف یہ کہ مختصر پسندی کی توجیہ بھی کر دی گئی ہے۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں

یاد رہے میں افسردگی و پژمردگی کو پسند نہیں کرتا۔ یہ باتیں--- نہیں۔

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

خدا نے چاہا تو جلد شرف قدم بوسی حاصل---

آپ کا ناصر!

مولانا عبدالکلام آزاد سے ملاقات

ہندوستان میں یہ دور قومی اور بین الاقوامی سطح کی سرگرمیوں کا ہنگامہ خیز دور تھا' ایک طرف میں مذہبی ماحول میں پل رہا تھا۔ دوسری طرف سیاسی' سماجی اور معاشی حالات کے پیش نظر جو نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں' انہوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میرے مراسم انعام اللہ خان ناصر ایسی علمی و ادبی شخصیت سے بھی تھے' جن کا میں بے حد احترام کرتا تھا۔ میں ان کی انشاپردازی اور اسلوب نگارش کا بھی شیدائی تھا' لیکن جس طرح انہوں نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا' اس نے مجھے افسردہ اور پژمردہ کر دیا' جس کی نشاندہی انہوں نے اپنے آخری خط میں کر دی تھی۔ چنانچہ میں نے

پھر سے اپنے استاد حافظ شفیع کی طرف رجوع کیا۔ حافظ شفیع نے 1933ء میں نفسیات میں ایم اے کیا تھا۔ میں نے ان سے ایف اے میں ٹیوشن پڑھنا شروع کر دی تھی' میں خود ان کی بیٹھک بازار صداکاراں میں پڑھنے جاتا تھا۔ وہاں میرے بڑے دوست ہیں' جن میں ایک ملک بشیر (ککے زئی) تھے' جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کی چھوٹی بہن سے بیاہے گئے تھے' اگست کے اواخر اور ستمبر کے شروع میں مجھے معلوم ہوا کہ حافظ شفیع دہلی جا رہے ہیں۔ دہلی میں ان دنوں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا' جس میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شرکت ضروری تھی' چنانچہ میں نے حبیب اللہ سے کہا کہ میرے استاد دہلی جا رہے ہیں اور وہاں آل انڈیا کانگرس کا اجلاس ہو رہا ہے شاید ابوالکلام آزادؒ سے ملاقات ہو سکے' یہ سنتے ہی حبیب اللہ نے کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے' لیکن میں نے حافظ شفیع سے حبیب کو ساتھ لے جانے کے بارے میں کوئی بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں حافظ شفیع کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔

حافظ شفیع کے دوست اور عزیز جن کا نام بھی عزیز تھا' پوسٹ آفس میں تھے اور کوچہ چیلاں میں رہائش پذیر تھے' حسن اتفاق کہ جہاں ہم ٹھہرے وہاں سے آصف خان کی حویلی کا فاصلہ چند گز تھا اور مولانا آزادؒ اس حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ سن کر میرے اندر ان سے ملنے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں ملا جائے۔

میں نے اپنے میزبان صاحب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا' تو انہوں نے آصف خان کی حویلی کے چوکیدار کو بڑی منت سماجت کے بعد مولاناؒ سے مجھے ملوانے پر راضی کیا' دوسرے دن چوکیدار نے بتایا کہ میں کل صبح کی نماز کے فوراً بعد مولاناؒ سے مل سکتا ہوں۔

دوسرے روز صبح میں مولاناؒ سے ملاقات کے لیے حویلی آصف خان پہنچ گیا' چوکیدار مجھے اوپر چھت پر لے گیا' جہاں ایک بڑا کھلا صحن اور ایک برساتی قسم کا کمرہ تھا۔ وہیں مولاناؒ ٹھہرے ہوئے تھے' جب میں کمرے میں داخل ہوا تو مولاناؒ بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے' ان کے سامنے چھوٹی سی میز پر پشاوری چائے دانی اور چھوٹی پیالی

پڑی تھی' مولانا نے کشمیری پشمینے کی مخصوص چادر لپیٹ رکھی تھی' مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔

"میرے عزیز' بیٹھو!"

یہ سنتے ہی میں فوراً کرسی پر بیٹھ گیا' میں خاموشی سے اپنی آنکھوں میں اس شخصیت کو سمونے کی کوشش میں تھا کہ انہوں نے کلام کیا۔ بھئی کیا کرتے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟ تعلیم کیا ہے؟ کیا نماز پڑھتے ہو؟ تقریباً بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ اس ملاقات میں' میں صرف یہ کہہ پایا کہ "مولانا میری یہ خواہش ہے کہ جب تک آپ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں' مجھے روزانہ شرف ملاقات بخشا جائے۔" چنانچہ مولانا نے مجھے اس وقت یا اس سے پہلے آنے کا وقت دیا اور پھر میں روزانہ ان سے ملنے لگا۔ ان ملاقاتوں میں انہوں نے زندگی بسر کرنے کے بہت سے اچھے مشورے دیئے' انہوں نے مجھے تعلیم مکمل کرنے اور باقاعدہ نماز پڑھنے کے لیے کہا۔ اسی دوران میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان سے درخواست کی کہ مجھے اپنے قریب رہنے اور خدمت گزاری کا موقع دیں' میں یہ سب خدمات بلامعاوضہ بجالانے کو تیار ہوں' اس پر مولانا نے فرمایا۔ ایسے کام کے لیے ابھی تمہاری عمر نہیں' تم پڑھائی مکمل کرو اور یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ تم کو نماز سے غفلت نہیں برتنی' ایسا کرنا ہی میری قربت ہے۔

دہلی میں ابوالکلام آزاد سے ملاقات پر میں بڑا سرشار تھا' میں نے حبیب اللہ (مولانا احمد علی کے صاحبزادے) کو اپنے دہلی پہنچنے کی اطلاع دی' تو انہوں نے مجھے لاہور سے اس خط کا جواب لکھا۔

لاہور

28' ستمبر 1938ء

مہرمصور!

سلام مسنون! محبت نامہ ملا' آپ کی طرف سے یہ کرم خاص! میں شکریہ ادا کرتا ہوں' مجھے یہ معلوم ہے کہ دنیا طالب محاسن ہے' مگر دوست عیبوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں' میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کے ذہنی افکار اور معمولات حیات میں مجھے رائے دہی کا کوئی حق نہیں' سفر دہلی سے پیشتر بر سبیل تذکرہ آپ نے کچھ فرمایا تھا' کچھ شوق

مفاہمت اور غالباً صدق نیت سے چاہا کہ اپنی زندگی کا تلخ تجربہ پیش کردوں۔

قدرت نے اپنی فیاضیوں سے کام لے کر جس کمال و حسن و خوبی کا آپ کو مظہر بنایا ہے' میرا دامن اس سے یکسر خالی ہے' اس لیے عموماً آپ کی مجلس میں رقت و انفعال کی ایک خاص کیفیت بلااختیار طاری ہو جاتی ہے اور بے ساختہ قرآن حکیم کی یہ آیات زبان پر حاوی ہو جاتی ہیں:

خدا نے بینا و نابینا اور تاریکی و اجالا یکساں نہیں بنائے۔ (ترجمہ)

خداوند تعالیٰ نے بالکل صحیح فرمایا ہے: "خوب یاد رہے کہ جس چیز کو تم اپنی کوتاہ بینی کے باعث ناپسندیدہ خیال کرتے ہو وہی تمہارے لیے خیر و برکت کا سبب ہو اور جو چیز دلفریب معلوم ہوتی ہے اس کا انجام تباہی و بربادی ہو (ترجمہ)

آبائے کرام کی اولاد میں ہونا خود ایک مشرف مجد ہے' جو بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوتا ہے' ناتجربہ کار نوجوانوں کے سفینہ کے حقیقتاً یہی ناخدا ہوتے ہیں' انسان کی حیات اور فلاح و کامیابی کا راز انہی کے مشوروں میں مستور ہوتا ہے' خوش عمل اور قناعت فکر سے ان کے مشوروں پر تدبر کر کے دنیا کے ذی علم افراد اور ہوش مند قوموں کی طرح اپنے ارتقاء کا راستہ پیدا کرنا چاہئے۔ میں نے جب بھی اپنی رائے کو بزرگوں کی رائے پر ترجیح دینی چاہی تو فوراً قدرت نے حرکت کی اور اچھی طرح یہ حقیقت میرے ذہن نشین کرا دی کہ جو ایسا کرتا ہے' بدترین غلطی کا ارتکاب کرتا ہے اور اللہ کی رحمت بے کراں سے دور ہٹا دیا جاتا ہے' تمام فضیلت و بزرگی چھن جاتی ہے اور لطف و احسان کے تمام دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں' یہ ایک آرزو تھی اور مشروط آرزو کہ اگر خاطر مہرانور پر گراں نہ گزرے تو آپ کے گوش گزار کردوں' آپ کے کمالات کا سکہ دل و دماغ پر حکمران ہے اس لیے ممکن تھا کہ بالمشافہ (روبرو) اس وضاحت سے نہ بیان کر سکتا۔ لکھتے وقت بھی کچھ موزوں الفاظ نہیں مل رہے بہرحال امید ہے کہ میرا مفہوم ایک حد تک آپ کے سامنے آگیا ہو گا۔

سیر دہلی میں مصروف ہوں گے' جہاں زندہ بزرگوں سے شرف حاصل کریں گے وہیں اگر وقت میں گنجائش ہو اور وسائل بھی مہیا ہو جائیں تو حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز کے مزار پر بھی تشریف لے جایئے' ہندوستان میں علوم اسلامیہ کے یہ

ابوالاباء ہیں' جب سے اسلام نے سرزمین ہند میں قدم رکھا ہے' اس وقت سے اب تک اسلام نے اگر کوئی جامع کمالات شخصیت پیدا کی ہے جس پر اسلامیان ہند کو بجا طور پر فخر اور ناز ہو سکتا ہے تو صرف حضرت شاہ ولی اللہ ہیں' مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی سوانح حیات اور عملی تحریکات مرتب کی تھیں' لیکن حوادث زمانہ کی وجہ سے ضائع ہو گئیں' جس کا بے حد افسوس ہے ورنہ ان کے کمالات دنیا پر اور روشن ہو جاتے۔

نئی دہلی پرانی جیل کے قریب ان کا مزار ہے' عوام کی زبان میں "مہندیاں" کہتے ہیں' سہولت سے معلوم ہو جائے گا' جن کو خدا نے بصیرت عطا فرمائی ہے' ان کا بیان ہے کہ وہاں علوم کے دریا بہتے ہیں' واللہ اعلم!

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے' خدا آپ کو فائزالمرام واپس لائے' آمین!

آپ کا حبیب

دفتر انجمن خدام الدین لاہور

فیروزالدین منصور

روزنامہ "احسان" کے دفتر میں ایک دن احسان الٰہی سے ملنے گیا' وہاں مجھے معلوم ہوا کہ فضل الٰہی قربان بھی دفتر میں موجود ہیں' چنانچہ میں فضل الٰہی قربان کو سلام کرنے ان کے کمرے میں پہنچا' کمرے میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نہ تو زیادہ ان کے نام سے واقف تھا اور نہ کام سے' اس لیے خاموش بیٹھا رہا' لیکن میں بہت جلد جان گیا کہ یہ آدمی کوئی معمولی شخصیت نہیں' ان کی زبان میں اگرچہ لکنت تھی لیکن خیالات اور گفتگو بڑے فکر انگیز تھے۔ وہ مسلسل مجھے تکے جا رہے تھے' چنانچہ میں فوراً اٹھ کر احسان الٰہی کے پاس آ گیا اور پھر وہاں سے بھی جلد گھر کو لوٹ آیا۔

دو ایک روز کے بعد احسان الٰہی' اسی آدمی کو ہمارے گھر لائے اور کہا: "یہ ہیں فیروزالدین منصور' اور یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اس طرح میرا فیروزالدین منصور سے تعارف ہوا' فیروزالدین منصور صحیح معنوں میں ایک غریب محنت کش گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد شیخوپورہ کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے تھے' لیکن شیخوپورہ شہر میں اپنے اہل و عیال کی گزر بسر کے

لیے درزی کا کام کرتے تھے۔ فیروز دین شیخوپورہ میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور میں ہائی اسکول کی تعلیم کے سلسلے میں آ گئے اور یہاں مشن ہائی سکول رنگ محل میں داخلہ لے لیا۔

فیروز الدین منصور خلافت تحریک کے سلسلے میں ہجرت کر کے افغانستان اور افغانستان سے سوویت روس فضل الٰہی قربان کے ساتھ پہنچے تھے اور وہاں سے ایشین یونیورسٹی آف کالونیل پیپلز میں داخل ہوئے' جہاں غلام ملکوں کے نوجوانوں کو انقلاب کی تربیت دی جاتی تھی اور مارکسزم اور سوشلزم بھی پڑھایا جاتا تھا۔ اس طرح سوشل سائنس اور مارکسی نظریاتی تعلیم کے بعد انہیں ہندوستان واپس پہنچ کر ہندوستان کے عوام کی سیاسی آزادی اور مزدوروں' کسانوں کی معاشی و اقتصادی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ وہ 1922ء میں روسی ذرائع سے مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے چترال پہنچے تو انہیں خفیہ پولیس کے ذریعے گرفتار کر کے پشاور لایا گیا۔ پشاور کمیونسٹ کیس میں انہیں ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ سزا کے بعد فیروز دین منصور جب اپنے گھر شیخوپورہ پہنچے تو تھوڑے ہی عرصہ میں گھر والوں نے مجبور کر کے ان کی شادی کر دی۔

1924ء میں وہ پھر سے پنجاب کے مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنے لگے اور جب پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی' تو فیروزالدین منصور اس کام میں پیش پیش تھے۔ 1926ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کے اہم رکن بنے۔

مارچ 1929ء میں میرٹھ سازش کیس میں ہندوستان کے چوٹی کے مزدور اور اشتراکی رہنماؤں کو حراست میں لے لیا گیا۔ یہ سازش دراصل بڑے ڈرامائی انداز میں ملک بھر میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کرنے کے لیے کھڑی کی گئی تھی۔ اس سازش میں ملوث کمیونسٹوں پر ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے ایسے بڑے خوفناک اور سنگین الزامات عائد کئے گئے۔

میرٹھ سازش کیس مسلسل پانچ سال تک چلتا رہا' ہندوستان کے چوٹی کے وکلاء نے مختلف ملزموں کی طرف سے ان کی وکالت اور پیروی کی تھی۔ ان وکلاء میں موتی لال نہرو' پنڈت جواہر لال نہرو' سروجنی نائیڈو اور مہاتما گاندھی ایسے لوگ شامل تھے'

آخر جنوری 1933ء کو اس مقدمے کے فیصلے میں تمام انقلابی ملزموں کو دو سال سے بارہ سال تک قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی تمام سرگرمیاں زیر زمین (انڈرگراؤنڈ) ہونے لگیں۔ اس دوران کمیونسٹ پارٹی کا اخبار "لال ڈھنڈورہ" بھی چھپ کر تقسیم ہونے لگا۔

فیروزالدین منصور اور فضل الٰہی قربان نے مل کر پنجاب میں مارکسی نظریات کو تقریر و تحریر اور عملی جدوجہد سے عوام تک پہنچایا تھا' اس لیے پہلی ملاقات میں' میں اور فیروزالدین منصور شیروشکر ہو گئے۔ فیروزالدین منصور نے پڑھنے کا شوق ڈالا اور اچھے کیونزم سے متعارف کرایا' ساتھ ہی میری تمام آوارگیوں' کوتاہیوں اور بے پرواہیوں کے رجحان اور ان کے اثرات کو ختم کیا۔

میرے اس نئے رجحان سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی دیکھ کر عبداللہ بٹ نے مجھے کالج میگزین "کریسنٹ" کی ایڈیٹری کے ساتھ ساتھ آل پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکریٹری بنا دیا۔ یہ دونوں عہدے مجھے ادیبوں' صحافیوں' دانشورں اور سیاسی رہنماؤں کے پاس لے گئے۔

3 ستمبر 1939ء کو جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔ وائسرائے ہند لنلتھگو نے نہ صرف ہندوستان کے جنگ میں فریق ہونے کا اعلان کر دیا بلکہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ جاری کر دیا' جس کے تحت کسی بھی شخص کو ایک خاص مدت کے لیے بغیر مقدمہ چلائے قید میں رکھا جا سکتا تھا۔ لنلتھگو نے 6 ستمبر 1939ء کو گاندھی کو جنگ کے حوالے سے بات چیت کی دعوت دی۔ وائسرائے ہند سے ملاقات کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ ہندوستان کو ضرورت کے وقت برطانیہ کی مدد کرنی چاہیے' حالانکہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے پر ان دونوں میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اس بیان نے ہندوستانیوں کو حیرت میں ڈال دیا' کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ جنگ کے دوران ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے کا سنہری موقع ملے گا' کانگرس نے بھی گاندھی کے اس بیان پر غم و غصے کا اظہار کیا۔

ہندوستان کی انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ پارٹی نے اس جنگ کو استعماری جنگ اس لیے کہا کہ ان کے خیال میں دونوں فریق (برطانوی استعمار اور جرمن فسطائیت) استعماری طاقتیں تھیں۔

جنگ چھڑتے ہی چودھری افضل حق نے امرتسر ہی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلالیا' مولانا حبیب الرحمٰن مجلس احرار کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ شیخ حسام الدین کو صدر چنا گیا اور شورش کاشمیری کو جنرل سکریٹری بنا دیا گیا۔ ایک طویل قرارداد کے ذریعے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے اور ان تمام نو آبادیات سے ہاتھ کھینچ لے جو اس کے قبضے میں ہیں' ایسے حالات میں مجلس احرار جنگ میں بھرتی دینے اور برطانیہ کی ہم نوائی سے انکار کرتی ہے۔

سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں احرار کے اس فیصلے سے ایک نئی لہر دوڑ گئی' گلوائی دروازہ کے میدان میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا' شیخ حسام الدین نے شورش کاشمیری سے کہا کہ تم عبداللہ بٹ کو اور عبداللہ ملک کو سینما لے جاؤ' تمہاری واپسی پر نہ صرف جلسے کا انتظام مکمل ہو جائے گا' بلکہ شعلہ بیان مقرروں کے ذریعے آتش فشاں بن چکا ہو گا اور تم آکر اپنی تقریر سے اس لاوے کو ابال دے دینا' فلم اچھی نہ تھی' اس لیے ہم جلد تینوں سینما گھر سے اٹھ کر جلسہ گاہ میں آ گئے' دیکھا تو انسانوں کا اژدھام تھا' جہاں تک نگاہ جاتی' آدمی ہی آدمی تھے' شیخ حسام الدین کی تقریر شباب پر تھی' شورش کاشمیری کو دیکھتے ہی زندہ باد کے غل نے آسمان سر پر اٹھالیا' شیخ حسام الدین بھی خطاب کے دھنی تھے' گیارہ بجے کے قریب شورش کاشمیری اسٹیج پر آئے اور آتے ہی چند لمحوں بعد انسانوں کو اس قدر مسحور کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا کیونکہ میں تو شورش کاشمیری کی شعلہ بیانی کے آگے اپنے آپ کو یوں سمجھتا تھا کہ "کوئلہ بھئی نہ راکھ!"

اس سے قبل فروری مارچ 1937ء تک انتخابات کے نتائج میں کانگرس نے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں لیکن پنجاب کے صوبے میں یونینسٹ پارٹی کامیاب ہوئی۔ پنجاب کے صوبے میں کانگرس نے ہندو آبادی پر مشتمل شہری علاقوں سے زیادہ ووٹ لیے جبکہ دیہی علاقوں میں جہاں سکھوں کی اکثریت تھی یا تو اکالی امیدوار کامیاب ہوئے یا کمیونسٹوں نے اکثریت حاصل کی' اس کی وجہ یہ تھی کہ کسان انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ پنجاب کسان کمیٹی کا پہلا سالانہ اجلاس اکتوبر 1938ء کو لائل پور میں سجاد ظہیر کی صدارت میں ہوا' سجاد ظہیر سوشلسٹ پارٹی کی نیشنل ایگزیکٹو کے رکن تھے۔ بعد میں کسانوں کی صوبہ بھر کی ایجی ٹیشنوں کے خلاف حکومت کی طرف سے

گرفتاریاں اور ظالمانہ کارروائیاں کسانوں کے عزم کو متزلزل نہ کر سکیں اور کسانوں کے جتھے دفعہ 144 کی روزانہ خلاف ورزی کرتے رہے' بلکہ پنجاب کسان کمیٹی کی رہنمائی میں پنجاب کے کسانوں نے مالیہ آبیانہ میں اضافہ اور چوکیدارانہ ٹیکس کے خلاف آواز اٹھائی۔

یونینسٹ حکومت نے ان کے خلاف سخت اقدامات کئے حالانکہ وہ اپنے آپ کو کسانوں کا خیر خواہ کہتی تھی۔ جنوری 1938ء میں پنجاب صوبائی کانگرس کمیٹی کے صدارتی انتخابات میں دو سو سات ارکان میں سے 198 ارکان حاضر ہوئے' کانگرس کمیٹی کے لیے ڈاکٹر ستیہ پال اور شام لال صدارتی امیدوار تھے۔ لالہ موتی چند نے کانگرس کے بائیں بازو کے رہنما ستیہ پال کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا جبکہ شام لال جو کہ کانگرس کے قدامت پسند دھڑے سے تعلق رکھتے تھے' ان کا نام بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے تجویز کیا' اس طرح کمیونسٹ کیرتی کسان پارٹی اور سوشلسٹ عناصر آپس میں بٹ گئے--- چنانچہ انقلابی لیگ (سوہن سنگھ جوش گروپ) نے لالہ شام لال کی حمایت کی جبکہ کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور کیرتی کسان پارٹی (بابا گروپ) نے ڈاکٹر ستیہ پال کو ووٹ دیا۔ کانگرس کے دونوں دھڑوں کے درمیان اختلاف پر جواہر لال نہرو پنجاب آئے اور عارضی اتحاد پیدا ہو گیا۔ کانگرس کے اندرونی اختلافات کے باوجود اس کی صفوں میں شامل کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر نے کسانوں' مزدوروں اور نوجوانوں میں تنظیم اور شعور پیدا کرنے کے لیے متحدہ ہو کر کام جاری رکھا۔

نومبر 1939ء میں کمیونسٹ پارٹی کی پولٹ بیورو نے لوگوں سے کہا کہ وہ قومی آزادی کے حصول کے لیے جنگی بحران کو انقلابی انداز سے استعمال میں لاتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے نعرہ بھی رائج کرنے کی کوشش کی: "ہم نہ تو پائی دیں گے اور نہ ہی بھائی۔"

پولٹ بیورو نے کانگرس سے یہ اپیل کی کہ وہ بھی عوامی جدوجہد کا اظہار کر دے' کانگرس کے فارورڈ بلاک نے بھی ہندوستان کی جنگ میں شمولیت کی بھرپور مخالفت کی اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ جنگی کوششوں (War Efforts) میں دخل دے کر انہیں زائل

کر دیں۔ کانگرس، کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی طرف سے حکومتی جنگی تیاریوں کی مخالفت اور ان تنظیموں کی طرف سے کیا جانے والا عوامی تنظیم کا کام حکومت کے لیے سد راہ بن سکتا تھا، لیکن وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے ان کی کوششوں کو اس وقت بے اثر کر دیا جب اس نے مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ جنگ کے مسئلے پر اتفاق رائے نہ کرنے دیا۔ اس نے مسلم لیگ کے رہنما محمد علی جناح سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ برطانیہ کی جنگی تیاریوں میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کانگرس کا ساتھ نہ دیں۔ مسلم لیگ کے علاوہ پنجاب کے وزیراعظم اور یونینسٹ پارٹی کے رہنما سر سکندر حیات نے بھی جنگ میں برطانیہ کے ساتھ مکمل تعاون اور غیر مشروط حمایت اعلان کر دیا۔ اسی طرح اکالی گروپ جس کی رہنمائی ماسٹر تارا سنگھ کر رہے تھے اس نے بھی برطانیہ کی حمایت کر دی، وزیراعظم پنجاب نے تو وائسرائے کی طرف سے اعلان جنگ کے فوراً بعد یہ احکام جاری کر دیئے کہ کوئی بھی ایسا شخص جو کسی کی اپنے حکمران کے ساتھ وفاداری کو متاثر کرنے کی کوشش کرے گا یا فوجی بھرتی میں رخنہ اندازی کرے گا، تو اس کے ساتھ سختی سے نپٹا جائے گا۔

کانگرس اور بائیں بازو کے ارکان جو اسمبلی کے ممبر تھے یا نہ تھے، انہوں نے پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات کے اس بیان پر سخت احتجاج کیا۔ پنجاب کی کمیونسٹ پارٹی نے ایک کتابچہ جاری کیا جس کا نام "اعلان جنگ" تھا۔ اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ دراصل آزادی کا خلاف اعلان جنگ ہے، جس پر کمیونسٹوں کی ہندوستان گیر گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔

بائیں بازو والوں کی طرف سے جنگ کی مخالفت میں بہت سی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ پنجاب میں کسان کمیٹی بھی منظم ہوئی۔ 29-28 اکتوبر 1939ء کو بھکنہ ضلع امرتسر میں جلسہ منعقد ہوا، اس جلسے میں بڑی تعداد نے سرخ جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔ وہاں ڈرامیٹک کلب نے ایک ڈرامہ پیش کیا، جس میں حکومت اور اس کے سرکاری کارندوں کے ساتھ نفرت اور تضحیک کا اظہار کیا گیا تھا۔ پمفلٹوں اور پرچوں کے ذریعے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ نہ صرف برطانوی استعمار کا تختہ الٹ دیں بلکہ ہندوستانی سرمایہ دارانہ نظام کی بھی بیخ کنی کر دیں، پنجاب کمیٹی کے نو منتخب صدر میاں افتخارالدین نے

دوسرے کانگرسی ارکان کے ہمراہ صوبے کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور لوگوں کو جنگی کوششوں کی مزاحمت کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے پر آمادہ کیا۔

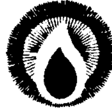
پنجاب میں جنگ کی مخالفت کے متعلق حکومت نے اپنی خفیہ رپورٹوں میں یہ تسلیم کیا کہ "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" کے باوجود کانگرس کے سوشلسٹوں نے جن میں بڑی تعداد میں کمیونسٹوں کی موجودگی یقینی ہے۔ فوجی بھرتی کے خلاف اپنی زہریلی مہم جاری رکھی ہوئی ہے اور انہوں نے کچھ جلسے بھی محض اس لیے کیے کہ "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" کی خلاف ورزی کی جائے۔ حکومت نے ان سرگرمیوں کو کچل دینا چاہا اور فروری 1940ء تک اس نے 304 افراد کو "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" کے تحت گرفتار کرلیا۔

"ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ" کے خلاف اکتوبر 1939ء کو چودھری کرشن گوپال نے لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس کی ڈاکٹر ستیہ پال نے حمایت کی' اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ امن و امان کو برقرار رکھنے کی خاطر ظلم اور مقدمات ایسی حکومت کو قطعاً زیب نہیں دیتے جو عوامی حکومت ہونے کا دعویٰ کرتی ہو۔ سوہن سنگھ جوش نے بھی یونینسٹ پارٹی پر کڑی تنقید کی اور ہندوستان کو جنگ میں خواہ مخواہ ملوث کرنے کے بارے میں کہا: "ہم نازی ازم کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہیں لیکن ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم جنگ میں برابری کی سطح پر اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے شریک ہوں گے۔ ہمیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ یہ جنگ استعماریت کی پالیسی کو برقرار رکھنے کے لیے تو نہیں لڑی جا رہی۔ اگر ہم نازی ازم کو کچلنا چاہتے ہیں تو ہمیں استعماریت کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کیونکہ موخرالذکر اول الذکر کا بڑا بھائی ہے۔

پنجاب کی یونینسٹ حکومت نے کسی بھی تنقید کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے پنجاب میں نہ صرف ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کو نافذ رکھا بلکہ وار سروس بل اور وار ریزولیوشن منظور کیے جن کا مقصد جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کے لیے ڈومینین کے درجے کا حصول تھا۔ وزیراعظم سر سکندر حیات نے وائسرائے ہند کو پنجاب کے دورے کے لیے دعوت دی' چنانچہ 1940ء میں لنلتھگو نے پنجاب کے چھ اضلاع کا دورہ کیا' ان تمام جگہوں پر یونینسٹ پارٹی کے وفاداروں نے وائسرائے کو بھاری رقوم' جنگ کے

لیے چندے کے طور پر دیں۔ انگریز حکومت نے وفاداری کی بدولت سکندر صاحب کو نیشنل ڈیفنس کمیٹی میں شامل کرلیا۔

23 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا' جہاں قرارداد لاہور منظور کی گئی۔



باب 6

آل پارٹیز آزاد مسلم کانفرنس

27 سے 29 اپریل 1940ء کو تین دفعہ آل پارٹیز آزاد مسلم کانفرنس کا انعقاد دہلی میں کیا گیا' جس کی صدارت خان بہادر اللہ بخش سابق وزیراعظم سندھ نے کی' اس کانفرنس میں سات مسلم سیاسی جماعتوں نے شرکت کی جن میں (1)جمعیت علمائے ہند(2) مجلس احرار (3)انڈی پینڈنٹ پارٹی (بہار) (4) آل انڈیا مومن کانفرنس (5) کریشک پرجا پارٹی (بنگال) (6)انجمن وطن (بلوچستان) (7) آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس۔

اس کانفرنس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان سے جنگ کے دوران امداد و تعاون کی خواہش کا اظہار کیا تو دو بڑی سیاسی جماعتوں (مسلم لیگ اور کانگرس) نے اپنی حیثیت اور ضرورت کے حوالے سے انگریزوں سے چند مطالبے کئے' جسے حکومت نے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی دونوں بڑی اکثریتی قومیں (ہندو اور مسلمان) اگر متحد ہو کر کوئی بات کہیں تو حکومت ہند اس پر غور کر سکتی ہے۔ لیکن بہت سے بائیں بازو کے سیاسی یا پھر مذہبی جماعتوں کے مسلمانوں کو نہ تو آل انڈیا کانگرس نے اپنے رام گڑھ کے اجلاس میں کوئی اہمیت دی اور نہ ہی آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں' جس میں قرارداد لاہور پاس کی گئی۔

اس کانفرنس میں لاہور کے ادیبوں دانشوروں میں مولانا صلاح الدین' عاشق حسین بٹالوی' اللہ بخش سلیم' باری علیگ' عبداللہ بٹ' میں اور فیروزالدین منصور شامل ہوئے۔ فیروزالدین منصور اور میں اکٹھے ہوٹل میں ٹھہرے۔ فیروزالدین منصور کو

ہندوستان کے کمیونسٹ راہنماؤں سے لے کر کارکنوں تک سب جانتے تھے۔

اس ہوٹل میں نوجوان آرٹسٹ "اویاما" شاہد لطیف کے ساتھ فیروزالدین منصور سے ملنے آئے اور رات ہم سب نے ایک ساتھ گزاری۔ اویاما کی عمر اگرچہ پینتیس چھتیس سال تھی، لیکن اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس کا شمار ہندوستان کے بہترین آرٹسٹوں میں ہوتا تھا۔ بڑا مخلص اور صاف گو تھا۔ مجھے اس کی صاف گوئی نے بڑا متاثر کیا۔ اویاما کا ایک اپنا گروپ تھا جس میں محمود الظفر، ڈاکٹر زین اور سجاد ظہیر تھے۔ میں ان سب سے پہلی بار ملا تو میرے اندر ان کے لیے بے پناہ عقیدت اور احترام پیدا ہوا۔ وہاں سید مطلبی فرید آبادی بھی تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی بھی خاصی تعداد تھی جیسا کہ سید سجاد ظہیر، شاہد لطیف، ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر اشرف، جن سے بعد میں بڑے رابطے بڑھے۔ ڈاکٹر اشرف اور سید سجاد ظہیر تو مسلم ماس کنٹیکٹ کمیٹی کے کرتا دھرتا تھے، جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے تشکیل دیا تھا۔

"اویاما" آرٹسٹ کے گروپ میں شامل محمود الظفر، صاحبزادہ مسعود الظفر کے بھائی تھے۔ مسعود الظفر نواب رام پور کے وزیر تھے، جبکہ ڈاکٹر زین (ڈبلیو زید احمد کے والد) اور سجاد ظہیر یوپی کے کمیونسٹ تھے۔ جن کے لباس میں ایک طرح کا لکھنوی بانک پن اور شخصیت میں لکھنوی وضع داری تھی۔ ان کی گفتگو میں عقل و دانش کے موتی جڑے تھے۔ سجاد ظہیر سے ملاقات کے بعد میرے، ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے مراسم کا آغاز ہوا۔

"آل انڈیا مسلم کانفرنس" میں مجلس احرار بھی مدعو تھی، اس لیے ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے کارکنوں سے بھی ملاقات رہی کیونکہ 14 اپریل کو لاہور میں نونہالان کانفرنس منعقد کی گئی تھی، جس میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے بڑی تعداد میں کارکن خاص کر نوجوان کارکن بڑے متحرک دکھائی دیئے۔

اس کانفرنس کی صدارت حافظ محمد سعید دہلوی نے فرمائی۔ دہلی دروازہ کے باغ میں احرار نونہال اپنی بہار پر تھے۔ سرخ وردیاں پہنے، چہروں پر اسلامی جذبات اور دلوں میں آزادی وطن کی آرزوئیں لیے سینکڑوں نوجوان چاق و چوبند دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں اکثر ایسے بھی تھے جن کے والد یا بھائی فوجی بھرتی کے خلاف جیلوں

میں پڑے تھے۔ اس کانفرنس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں نونہالان احرار نے اپنی جماعتی تنظیم شروع کر دی۔

19 اپریل 1940ء کو میاں افتخار الدین کی صدارت میں پنجاب کی صوبائی کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا' جس میں ورکنگ کمیٹی نے اپنے آپ کو کرپلانی (سکریٹری جنرل آل انڈیا کانگرس کمیٹی) کی ہدایت کے مطابق سپریم ستیہ گرہ کمیٹی میں تبدیل کر دیا۔ اجلاس میں صوبے کی تمام کانگرس کمیٹیوں کو بھی ایسا ہی کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ اسی دن ورکنگ کمیٹی کے 15 ارکان نے عہدنامے پر دستخط کر دیئے۔ اس کے علاوہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے مئی 1940ء میں لاہور میں سنٹرل ستیہ گرہ ٹریننگ کیمپ کھولنے کا فیصلہ کیا تربیتی کیمپ کے پس پردہ بہت حد تک میاں افتخار الدین کی متحرک' شخصیت مصروف کار تھی اور نوابزادہ محمود علی ڈینیل لطیفی ان کے مددگاروں میں تھے' پنڈت جواہر لال نہرو نے کیمپ کا افتتاح کیا۔

جون 1940ء کے دوران پنجاب کی حکومت نے بائیں بازو کے خلاف زبردست کارروائی کا آغاز کیا۔ پنجاب کے کمیونسٹ تو اس کا خاص نشانہ تھے جن میں سے زیادہ تر کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں پانچ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کے ارکان بھی تھے۔ حکومتی ذرائع کے مطابق گرفتار شدگان میں ماسکو کے تربیت یافتہ کمیونسٹ بھی تھے۔ تمام گرفتار شدگان (کمیونسٹ اور سوشلسٹ) کا مشترکہ مقصد و منزل موجودہ حکومتی ڈھانچے کو مسلح بغاوت کے ذریعے ختم کر کے ایک قومی جمہوری انقلاب لانا تھا۔ ان گرفتاریوں کے خلاف پورے صوبے میں احتجاجی جلسے ہوئے' جن میں حکومت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ لاہور سٹوڈنٹس یونین' پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکریٹری صاحبان کی گرفتاری کی شدید مذمت کی گئی۔ اس جلسے کی صدارت نوابزادہ مظہر علی نے کی اور ڈاکٹر ستیہ پال کے علاوہ طالب علم رہنماؤں میں جگ جیت سنگھ' عبداللہ بٹ اور رمیش چندر نے خطاب کیا۔

15 جولائی 1940ء کے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں کانگریس نے کمیونسٹوں کی گرفتاری کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے اس اقدام پر سخت تنقید کی۔ میاں افتخار الدین نے بائیں بازو والوں کا دفاع کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے کی گئی گرفتاریوں کے باعث

اس پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ لیفٹنٹ حضرات کا جرم صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ 13 ستمبر 1940ء تک یونینسٹ حکومت مزید تین اہم رہنماؤں کرم سنگھ مان' ہرکشن سنگھ سرجیت' اور نوابزادہ محمود علی کو بھی گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق وہ تقریباً چھ مہینے سے مفرور تھے۔ مذکورہ بالا افراد حضرات پر یہ الزام تھا کہ وہ کیمونسٹ لٹریچر کو فروغ دے رہے ہیں۔ اسی ماہ سٹوڈنٹس یونین کے صدر نوابزادہ مظہر علی کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

ملک گیر گرفتاریوں کے علاوہ برطانوی حکام نے فوج کو کیمونسٹوں کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے کئی دیگر اقدامات بھی کئے' کیونکہ ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ کیمونسٹوں کے تعلقات خاصے قریبی تھے۔ خاص طور پر وہ فوجی جو پنجاب سے تعلق رکھتے تھے' ان میں کیمونسٹ زیادہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔

کیمونسٹوں کی زیر زمین سرگرمیاں

اکتوبر 1940ء کو سارے صوبے کے پولیس افسروں کی کانفرنس منعقد کی گئی' جس میں فیصلہ کی گیا کہ سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو چھاؤنی کے علاقوں پر خصوصی نگاہ رکھنی ہو گی اور خصوصاً ان جگہوں پر جہاں سکھ سپاہی متعین کئے گئے تھے اور اس بات کا دھیان رکھا جائے کہ کوئی بھی مشکوک چلنے کا شخص ہندوستانی سپاہی تک نہ پہنچ سکے اور نہ ہی چھاؤنی کے علاقے تک اس طرح کے کسی فرد کی رسائی ممکن ہو۔ ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ ضلعی پولیس کے ساتھ مل کر ہر سپاہی تک پہنچنے کے خفیہ راستوں پر نظر رکھے' تاکہ کیمونسٹ ان سے رابطہ نہ کر لیں۔ اسی طرح جب بھی فوجی ریل کے ذریعے سفر کر رہے ہوں' یا ریلوے اسٹیشن پر ریل کے انتظار میں ہوں' وہاں بھی ریلوے پولیس سنٹرل انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ مل کر ان کی نگرانی کرے گی' کیونکہ ان کی نظر میں یہ ہو سکتا تھا کہ دوران سفر کیمونسٹ ان سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

ان زبردست انتظامات کے باوجود میرداد پولیس کی نگرانی میں چلتی ٹرین سے کود کر ہتھکڑیوں سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور پھر ایک روز بناری پنڈت کے

بھیس میں میرے گھر تک پہنچ گیا۔ میرداد کو اچانک اپنے سامنے پاکر میں تذبذب میں تھا کیونکہ فیروز الدین منصور بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ وہی میرے راہنما تھے' لیکن میرداد بھی میرے لیے ایک روحانی ہیرو سے کم نہ تھا چنانچہ میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ میں اس کا پورا پورا ساتھ دوں گا' چنانچہ میں پورا ایک سال میرداد کے "کوریئر" کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس کا خفیہ پیغام لانے یا لے جانے میں' میں نے خاصی ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ سب سے پہلے تو میں نے میرداد کی عارضی خفیہ رہائش کا بندوبست کیا جہاں وہ دو مہینے تک رہا۔ یہ خفیہ رہائش ریلوے اسٹیشن کے قریب آسٹریلیا بلڈنگ میں تھی۔ اسی دوران نظام دین سے تعارف ہوا' جو بعد میں پاکستان ٹائمز کے لائبریرین بنے۔ وہ بھی میرداد کے پیغام رساں تھے۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد وہ راولپنڈی منتقل ہو گئے۔

میں ایک خفیہ پیغام کے سلسلے میں راولپنڈی پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ ایک کٹر ہندو مذہبی گھر تھا اور میرداد وہاں ایک پنڈت کی طرح رہ رہے تھے اور انہوں نے میری آمد کی اطلاع یوں دی تھی کہ لاہور سے میرا ایک رشتہ دار لڑکا آرہا ہے اور وہ کالج کا طالب علم ہے۔ یہ سن کر میں بہت پریشان ہوا کیونکہ میں ہندو مذہب کے ادب و آداب رسم رواج سے بالکل نابلد تھا' مجھے تو صحیح "رام رام" کہتے ہوئے ہاتھ جوڑنے تک نہیں آتے تھے۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے کہ یہ اس نوجوان پر انگریزی تہذیب کا غلبہ ہے۔ تم اس کے بدن پر سجے پتلون اور کوٹ دیکھ کر آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہو اور اس کی گفتگو سے تم اس کے خیالات میں ایسی آزاد خیالی پاؤ گے کہ فوراً جان جاؤ گے اسے مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔" میرداد نے مجھے تسلی دی۔

خیر' میں وہاں خدا خدا کرکے چند روز بڑے تذبذب میں گزار کر پیغام رسانی کا کام مکمل کرکے لوٹ آیا' تھوڑے ہی عرصے بعد اک دن مجھے اطلاع ملی کہ تم میرداد کو پریت نگر (امرتسر) میں ملو' میں پریت نگر پہنچا۔

پریت نگر

پریت نگر کیا تھا' ایک آئیڈیل گاؤں تھا جسے بڑی منصوبہ بندی سے بنایا گیا تھا' یہاں

کے سبزہ زار میں ایک ہی طرح کے رہائشی گھر تھے۔ یہاں ایک جدید طرز کا اسکول تھا جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ اسکول کے ساتھ ہوسٹل تھا۔ پریت نگر' گور بخش سنگھ کا خواب تھا' پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ آزادی کا سب سے پہلا علمبردار تھا۔ اس کا فلسفہ سامراج کی جگہ انسان دوستی تھا۔ آزادی اور جمہوریت کا فلسفہ لے کر گور بخش سنگھ انجینئرنگ کی ڈگری کے ساتھ ہندوستان لوٹا۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا خیالی گاؤں بسانا شروع کیا' جس کی بنیاد "محبت" پر رکھی' کیونکہ بنی نوع کا ایک ہی جذبہ ہونا چاہئے جسے محبت کہا گیا ہے۔ یہاں پریت نگر میں ہندو سکھ عیسائی اور مسلمان کا ایک ہی مذہب تھا اور وہ تھا "محبت!"

پریت نگر نے درمیانے طبقہ کے پڑھے لکھے لوگوں کو بڑا متاثر کیا' گور بخش سنگھ نے 1933ء میں "پریت لڑی" نام سے ایک پنجابی ادبی ماہنامہ جاری کیا' یہ رسالہ گور مکھی اور فارسی رسم الخط میں شائع ہوتا تھا' اس رسالے نے بہت سے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کو متاثر کیا اور انہوں نے اسی اثر کے تحت اپنے جذبات اور احساسات کا کھل کر اظہار کیا۔ لیکن 1940ء میں جب گور بخش سنگھ کا بڑا لڑکا نوتیج سنگھ جو ایف سی کالج لاہور میں ایم اے فائنل ائیر کا طالب علم تھا' کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن گیا تو وہ خیالی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گیا' کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کے تمام ممبر انڈر گراؤنڈ کام کر رہے تھے۔ پارٹی ورکر جگجیت سنگھ آنند کی وساطت سے میرداد پریت نگر کی رہائشی اسکیم میں رہ رہے تھے۔ جگجیت سنگھ آنند کے بتائے ہوئے نام پتے پر میں میرداد سے جا ملا۔ وہ بڑے آرام سے یہاں بے خطر گھوم پھر رہے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا دن چھوٹے اور راتیں لمبی تھیں۔ باقاعدہ رتجگوں کا اہتمام ہونے لگا۔ ایک رات میں سو کر اٹھا تو بستر پر میرداد نہ تھے۔ میں فوراً آنکھیں جھپکاتا ہوا صحن میں آیا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا البتہ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ میں نے باہر نکل کر سڑک پر جھانکا تو وہاں ایک ہجوم کے درمیان ایک سانڈ اور آدمی لڑ رہے تھے۔ میں بھاگ کر ہجوم میں شامل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرداد دست بدست' سانڈ کے ساتھ بل فائٹنگ کر رہا تھا۔ میرداد نے سانڈ کے سینگوں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا۔ ذرا سی ڈھیل پر سانڈ فٹ بال کی طرح اچھال سکتا ہے۔ لیکن ہر پل میرداد کی طاقت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سانڈ یقیناً

نڈھال ہو رہا تھا کہ اس کا مالک بھاگتا ہوا بیچ میں آ کھڑا ہوا' سب کا مزا کرکرا ہو گیا' واپسی پر میرداد سے میں نے پوچھا: "داد یہ سب کیا تھا؟"

میرداد نے کہا: "یوں ہی میں صبح کی سیر کو نکلا تو آگے اس سانڈ نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔۔۔"

"کیا معلوم کہ آپ نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی ہو' کیونکہ مست تو آپ تھے' آپ نے تو ساری رات پینے میں گزار دی۔" یہ سن کر میرداد کو بہت کچھ یاد آگیا اور اس نے معذرت کے انداز میں کہا: "اچھا مجھ سے بہت غلطی ہو گئی۔۔۔"

"۔۔۔اور اگر یہ غلطی سانڈ سے ہو جاتی تو۔۔۔"

"ایک انڈر گراؤنڈ کمیونسٹ آن گراؤنڈ ہو جاتا" یعنی زیر زمین بالائے زمین ہو جاتا۔" میرداد قہقہے لگا کے ہنسنے لگے۔ میں پریت نگر سے لوٹ کر گھر آیا تو راجستھان دیولی کیمپ سے فیروزالدین منصور کا خط آیا' جہاں متحدہ ہندوستان کے تمام سوشلسٹ اور کمیونسٹ لیڈر اور کارکن نظر بند تھے' اس خط پر دیولی کیمپ کے سپرنٹنڈنٹ کی مہر بھی ثبت تھی۔

دیولی

12 جنوری 1941ء

محترمی ملک صاحب!

جب سے کتابیں بھیجی ہیں کچھ ایسی خاموشی اختیار کی ہے کہ توبہ بھلی' نہ کوئی چٹھی نہ کوئی پیغام۔ معلوم ہوتا ہے یا تو بی اے کا امتحان دینے کی تیاری کی ہے یا نگینہ ریسٹورنٹ کی چائے پارٹیاں یا عرب ہوٹل کی شور انگیز و ہنگامہ خیز پھبتیوں اور قہقہوں کی محفلوں سے اس قدر فرصت نصیب نہیں ہوتی کہ اپنی خیر و عافیت کی چٹھی لکھ سکو۔

ہفتہ عشرہ اپنی خیریت کی اطلاع دے دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ چٹھی لکھنے میں چنداں وقت درکار نہیں ہوتا' آپ کی صحت کا کیا حال ہے؟ اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق بھی تحریر فرمائیں کہ آج کل اس کی کیا کیفیت ہے اور اپنی شاعری میں کن بلندیوں تک پہنچے ہو' اپنے دادا جان کی صحت کے متعلق بھی لکھئے کہ اب ان کا کیا حال ہے' سب دوستوں کو سلام عرض کیجئے گا۔

فقط آپ کا
منصور

دراصل اس وقت میں طالب علمی کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریکوں اور سیاست دانوں کا بڑی گہرائی اور شدت سے مطالعہ' مشاہدہ اور تجزیہ کر رہا تھا' جس سے میری نصابی سرگرمیاں متاثر ہو رہی تھیں اور میری غیر نصابی سیاسی سرگرمیوں کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔ 17 اکتوبر 1940ء کو کانگرس نے گاندھی کی قیادت میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کر دیا تھا۔ اس تحریک میں کچھ اس طرح کا طریقہ کار اپنایا گیا کہ ایک شخص باہر گلی میں نکلتا اور جنگ کے خلاف نعرہ بازی کرتے ہوئے اپنی گرفتاری پیش کر دیتا۔

گاندھی جی نے پنجاب کانگرس کمیٹی کو ہدایت کی کہ ان کانگرسیوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے جو اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے ذاتی حیثیت میں ہڑتال کریں گے یا تشدد کا راستہ اپنائیں گے' میاں افتخار الدین کچھ جگہوں پر مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس کے بعد ان کا اپنی گرفتاری پیش کرنے کا پروگرام تھا لیکن گاندھی جی نے انہیں ایسا نہ کرنے کی ہدایت کی تو 29 نومبر 1940ء کو میاں افتخار الدین نے اپنے آبائی قصبے باغبانپورہ میں دس ہزار کے جلسہ میں جنگ کے خلاف تقریر کی جس میں کہا گیا کہ عوام حکومت کا ساتھ دینے سے کھلم کھلا انکار کر دیں۔ تقریر کے بعد میاں افتخار الدین کو گرفتار کر لیا گیا' میں اس جلسہ میں موجود تھا۔ میاں افتخار الدین کی گرفتاری کے بعد حاضرین جلسہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے چنانچہ پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا' جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ زخمی ہو گئے۔ اس پر گاندھی نے زخمیوں کے زخم پر مرہم رکھنے کے بجائے پنجاب کانگرس کمیٹی کو ہدایت کی کہ وہ صرف مقامی حکومتی اہل کاروں کو ہی ستیہ گرہ کا نوٹس دیں اور عوام کو اس تحریک میں شامل نہ کریں۔ گاندھی جی کی یہ حکمت عملی کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے کامیاب نہ ہونے دی' کیونکہ ان کا رابطہ عوام سے تھا' اس لیے ستیہ گرہ کو دسمبر 1940ء کو ختم کرنا پڑا۔

جنگ نے پنجاب کے محنت کش طبقے کی زندگی اجیرن کر دی۔ مہنگائی بڑھی لیکن اجرتیں وہی رہیں۔ مہنگائی میں 1941ء میں مزید اضافہ ہوا' جب ہندوستان کے گورنر جنرل نے سپیشل سروس "مینٹی نینس آرڈی نینس" کے نفاذ کا اعلان کیا' جس کے تحت

محنت کش اپنی مرضی سے نوکری چھوڑ کر نہ جا سکتے تھے۔ اس آرڈی نینس میں ایسی دفعات بھی تھیں جن میں ان ہڑتالوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا جن کو مل مالکان سے منظوری حاصل نہ ہو۔

ستیہ گرہ گاندھی جی کا بنیادی اصول عدم تشدد' سچائی اور روح کی صفائی ہے۔ یہ تینوں اصول پرانے ہندو دھرم سے لیے گئے تھے' ستیہ گرہ ایسے عدم تشدد کی شاخ ہے جو قانون محبت پر کاربند رہتے ہوئے جھوٹ اور شیطانی طاقتوں کے خلاف استعمال کی جا سکتی ہے۔ دنیا کو تیاگ دینا بھی روح کی صفائی کے لیے ضروری ہے' انہی اصولوں سے گاندھی جی چرخہ' کھدر اور دیہاتی طرز زندگی کو اپناتے ہیں۔

زمانے کی عجب ستم ظریفی ہے کہ ہم آج اس مہذب اور ترقی یافتہ زمانے میں اپنی سیاسی بیداری کے لیے ان طریقوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں قوم پرستی کے جذبے نے 1885ء سے 1919ء تک مختلف منازل طے کیں' لیکن ہمیں کہیں بھی اس اخلاقیات' مذہبیات اور سیاسیات کا انمل جوڑ نظر نہیں آتا' لیکن ان تمام شبہات اور حیرانیوں کے باوجود جو مسئلہ ہمارے ذہنوں کو پریشان کئے ہوئے ہے' وہ یہ ہے کہ ایسے رجعت پسندانہ فلسفے نے ایک عظیم الشان انقلابی تحریک کو کیسے جنم دیا؟ عدم تشدد جیسے غیر مئوثر ہتھیار نے سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار پر کاری ضرب لگائی کہ سامراج ایک مختصری مدت کے لیے تو ضرور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا' ہم دنیا کی ترقی اور ارتقاء کا اندازہ اس کے تضاد سے لگا سکتے ہیں' چنانچہ اس تضاد کی مثال ہمیں گاندھی جی کے فلسفے میں بھی ملتی ہے۔

گاندھی جی نے پہلی ستیہ گرہ کے دوران نہ تو خدا کے یقین کو تحریک کے لیے شرط ماننے اور نہ ہی روح کی صفائی کو کوئی چنداں حیثیت دی اور نہ ہی تحریک کے لیے برہم چاری کو لازم سمجھا۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود وہ اس وقت کے مسائل کو اخلاقی اور مذہبی اصولوں کی بنیاد پر طے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے سامراج مخالف تحریک کی بنیاد سچائی پر رکھی اور اعلان کیا کہ موجودہ حکومت کی بنیاد شیطنت اور اہرمنی قوانین پر رکھی ہے' چنانچہ ہر سچائی پسند انسان کو شیطنت اور غلط قوانین کو دبانے کے لیے محبت آشتی اور عدم تشدد سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ لیکن یہاں ایک بنیادی سوال

پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہماری عوام نے اس سامراج مخالف تحریک میں شمولیت اس لیے کی کہ اس کا رہنما ایک دھوتی پہننے والے مہاتما ہے۔ وہ دنیا کو تیاگ چکا ہے یا وہ سچائی اور خدائی قوانین کا پیامبر ہے۔ ایک شخص حالات کا جائزہ مادی نگاہوں سے اور مادی فلسفہ سے متاثر ہو کر لیتا ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہی ملے گا' اس لیے ہمیں اس تحریک کی وجوہ مادی حالات میں ڈھونڈنی چاہئیں۔ ان تمام سوالات کے جواب ڈھونڈنے کے لیے میں نے اسی دور میں "گاندھی جی اور ہماری تحریک" کتاب لکھنی شروع کی۔

اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران جن دنوں میں "سرمایہ داری" پر کام کر رہا تھا' اس وقت دوسری عالمی جنگ کے بادل امڈ آئے تھے' ساتھ ہی طبقاتی جنگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے کتاب کے لیے جن رسائل' اخبارات اور کتابچوں سے مواد حاصل کیا تھا' ان میں سب سے اہم کیمونسٹ پارٹی کے خفیہ اخبار تھے جو انگریزی اور اردو میں سائیکلو سٹائل ہو کر چوری چھپے تقسیم ہوتے۔ ان کا انگریزی اخبار "کیمونسٹ" اور اردو "لال جھنڈا" تھا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ سے شائع ہونے والا اخبار "نیشنل فرنٹ" بھی تھا' جس پر بظاہر پارٹی کا نام نہیں لکھا ہوتا تھا لیکن وہ پارٹی کا ترجمان اخبار تھا۔ اس طرح سہارن پور سے ہفتہ وار "چنگاری" تھا جس کی ادارت میں کیمونسٹ اور سوشلسٹ ادیب شامل تھے۔

"سرمایہ داری" کے بعد میں نے دوسری کتاب "جاگیرداری" باری علیگ کے اصرار پر لکھی' کیونکہ "سرمایہ داری" کی اشاعت کے بعد باری علیگ سے ایک اور طرح کے مراسم استوار ہو گئے تھے۔ دراصل "جاگیرداری" میں نے باری صاحب کی رہنمائی میں لکھنا شروع کی تھی۔ ان کے کہنے پر میں لائبریری سے کتابیں حاصل کر کے مواد اکٹھا کرتا۔ یہ 1940ء کے ابتدائی مہینے تھے۔ میں انہی مہینوں میں میرداد کا خفیہ پیغام رساں بنا اور زیر زمین کیمونسٹ سرگرمیوں سے آگاہ ہوا۔ اپریل 1940ء میں فیروز دین منصور کے ساتھ "آل پارٹیز آزاد مسلم کانفرنس" میں شمولیت کے لیے دہلی پہنچا۔ منصور اور میں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی ہوٹل میں نوجوان آرٹسٹ اوپاما اور شاہد لطیف فیروز دین منصور سے ملنے کے لیے آئے اور پھر باتوں باتوں میں ہم نے ساری رات جاگ کر گزار دی۔

سجاد ظہیر

"آل پارٹیز آزاد مسلم کانفرنس" میں کمیونسٹ اور ترقی پسند مصنفین کی ایک بڑی تعداد نے حصہ لیا۔ ہندوستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں سے تعلق رکھنے والے ادیب' شاعر اور دانشور اکٹھے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں "اویاما" سے معلوم ہوا کہ ان کے خاص حلقے میں ڈاکٹر محمود الظفر' ڈاکٹر زین اور سجاد ظہیر شامل تھے۔

فیروز الدین منصور ہندوستان کے تمام کمیونسٹ رہنماؤں ہی کے نہیں کارکنوں تک کے کوائف جانتے تھے۔ انہوں نے مجھے بہت سے لوگوں سے ملوایا' لیکن جن شخصیات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد اشرف تھے۔

سجاد ظہیر کو کوئی بھی سجاد صاحب یا ظہیر کہہ کر مخاطب نہیں کرتا تھا' بلکہ سب اسے "بنے میاں" یا "بنے بھائی" کہہ کر بلاتے تھے۔ مجھے ان کا یہ نام بہت بھلا لگا' پھر معلوم ہوا کہ ان کا تعلق لکھنؤ سے ہے اور وہ لکھنوی تہذیب کی جدید تصویر ہیں' کیونکہ وہ لندن سے بیرسٹری پاس کرکے آئے تھے' وہ بیرسٹر تو نہ بنے لیکن کمیونسٹ بن گئے۔ اس طرح لکھنؤ کے بانکے میاں بننے کے بجائے بنے میاں بن گئے۔ اس وقت سجاد ظہیر کمیونسٹ کے علاوہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین Indian Progressive Writers Association کے جنرل سیکرٹری تھے۔

سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کا ڈول 1935ء میں لندن میں ڈالا' جس میں چند ہندوستانی نوجوان طلباء شریک ہوئے' خاص کر انگریزی زبان کے ادیب ملک راج آنند' بنگالی کے ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور محمد دین تاثیر۔ ان کے ذہن میں ہندوستانی ادیبوں کی ایک ایسی انجمن بنانے کا خیال پیدا ہوا جو سماج کی روز بروز بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور سلجھانے میں مدد دے سکے' چنانچہ ان چار پانچ نوجوانوں نے انجمن کے لیے باقاعدہ ایک مینی فیسٹو (منشور) تیار کیا اور لنڈن میں انجمن کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے۔ انہوں نے مینی فیسٹو کا مسودہ سائیکلو سٹائل کرا کے اپنے ہندوستانی دوستوں کو بھی بھیجا' جنہوں نے اس سے پورا پورا اتفاق کیا' خاص طور پر علی گڑھ میں ڈاکٹر اشرف جو مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے لیکچرار تھے۔ محمود الظفر جو ایم

اے او کالج امرتسر میں تھے اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشیدہ جہاں حیدر آباد (دکن) میں اور ڈاکٹر یوسف حسن جنھوں نے دو سال پہلے پیرس میں بھگتی اور تصوف کے متعلق مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔

لندن سے واپسی پر سجاد ظہیر سیدھے بمبئی پہنچے۔ ان دنوں ہندوستان کی آزادی کے متعلق یورپ میں چھپی ہوئی اکثر کتابوں اور سوشلزم' کمیونزم' سوویت روس وغیرہ کے متعلق ہر قسم کے لٹریچر پر سخت پابندی تھی اور اس قسم کی مطبوعات یہاں نہیں لائی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی احتیاط برتی' اور پولیس والوں کو ان کی تلاشی کے بعد خاصی مایوسی ہوئی انہوں نے اپنا کھسیانا پن چھپانے کے لیے برنارڈشا کی "انٹیلی جنٹ وومنز گائیڈ ٹو سوشلزم" "ریمزے میکڈانلڈ" "انڈیا فین سوسائٹی" کے چند پمفلٹ اور ایک دو فرانسیسی کتابیں جن پر انہیں شبہ تھا اپنے پاس رکھ کر انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

سجاد ظہیر کی ہندوستان آنے کی اطلاع عزیزوں اور دوستوں سے پہلے خفیہ اداروں کو مل چکی تھی۔ بمبئی میں سجاد ظہیر کا ایک دو دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا' تاکہ گجراتی اور مرہٹی زبان کے ادیبوں سے ملا جائے۔ اس کا اظہار انہوں نے ہتھی سنگھ سے کیا جو خود گجراتی تھے' لیکن وہ حضرت "صاحب" قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے کہا' "اول تو گجراتی ادب ناقابل اعتنا ہے دوسرا انہیں اس سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں۔" آخر سجاد ظہیر کے اصرار پر انہوں نے گجراتی کے مشہور ناول نگار مسٹر کنھیالال منشی اور ان کی بیوی شریمتی لیلاوتی سے ملاقات کروائی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خود ایسی ادبی تنظیم بنانا چاہتے ہیں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ایک جگہ جمع کر کے قومی زبان (ہندی) کے ذریعے سارے ملک میں پھیلائیں اس کے باوجود کہ ہمارے ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب بہت ہے۔ خیر ان سے ملاقات اچھی رہی۔ سجاد ظہیر کے والد نے لکھنؤ چھوڑ الٰہ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی اس لیے وہ سیدھے بمبئی سے الٰہ آباد پہنچے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی میں احمد علی انگریزی کے استاد تھے۔ احمد علی 1931ء میں انگلستان سے واپسی کے بعد لکھنؤ میں چھ ماہ رہے تھے۔ اسی دوران "انگارے" شائع

کرنے کا منصوبہ بنایا گیا' جس میں احمد علی کے دو افسانے شامل کیے گئے۔ رجعت پسندوں نے انگارے کتاب اور مصنّفین کے خلاف بڑا سخت احتجاج کیا تو حکومت ہند نے اس کتاب کو ضبط کرلیا۔

سجاد ظہیر تو لنڈن چلے گئے تھے' احمد علی نے اس ہنگامہ آرائی سے گھبرا کر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ اب جب تین سال بعد الٰہ آباد میں سجاد ظہیر ان سے ملے اور ترقی پسند مصنّفین تحریک کے بارے میں بتایا تو انہوں نے بے حد گرمجوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے گھر کو انجمن کا دفتر بنا دیا۔ پروفیسر احمد علی نے یونیورسٹی کے دوسرے دوستوں سے ملوایا' جن میں رگھوپتی سہائے فراق' ڈاکٹر سید اعجاز' احتشام حسین اور وقار عظیم شامل تھے۔ اس زمانے میں اتر پردیش (یوپی) میں ہندوستان اکاڈمی قائم ہوئی۔ یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا جسے مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کے تحت قائم ہونے والی لیجسلیٹو کونسل کے پہلے وزراء نے قائم کیا۔ ہندوستان اکیڈمی کے مقاصد بڑے نیک تھے یعنی اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور ان زبانوں میں دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کرنا اور علمی و ادبی تحقیق کے علاوہ ادیبوں کی فلاح وغیرہ۔ ڈاکٹر تارا چند جو اردو اور ہندی کے اتحاد اور ہندوستان کے بہت بڑے مبلغ اور طرف دار رہے' اس اکیڈمی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔

ڈاکٹر تارا چند نے ہندوستان اکیڈمی کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں منشی پریم چند' مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی کے علاوہ رشیدہ جہاں امرتسر سے تشریف لائیں۔ رشیدہ جہاں سے تو سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے متعلق خط کتابت کرچکے تھے کہ اس اجتماع میں ہمیں ادیبوں سے گفتگو اور بحث و تمحیص کا موقع ملے گا۔ سجاد ظہیر' اس سے پہلے کبھی پریم چند' جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالحق سے نہیں ملے تھے۔

ہندوستانی اکیڈمی کی اس کانفرنس میں منشی پریم چند نے سجاد ظہیر کے دل میں گھر کرلیا۔ منشی پریم چند سے سجاد ظہیر کی ملاقات فراق گورکھپوری کی وساطت سے ہوئی۔ ان کے مطابق "چھوٹے سے قد والے دبلے پتلے گورا زردی مائل رنگ' گال کی ہڈیاں ابھری ہوئیں' شیروانی چوڑی دار پائجامہ اور سفید کھدر کی گاندھی ٹوپی پہنے جوان کے

سر پر چھوٹی لگتی تھی اور جس کے نیچے سے ان کے سر کے بال کافی بڑے بڑے نکلے پڑ رہے تھے۔ چھوٹی کھچڑی دار مونچھیں جو ان کے اوپر کے لب کو ڈھانپے ہوئے تھیں' بالکل غیر اہم سے ایک صاحب کھڑے تھے۔ خیر ہم ان کے قریب پہنچے۔ فراق صاحب نے ان سے کہا' "بھئی ان سے ملو یہ سجاد ظہیر ہیں' تم سے ملنے کے بڑے خواہش مند ہیں۔"

فراق اور پریم چند دونوں کائستھ برادری کے تھے اور دونوں کا تعلق ضلع گورکھپور سے تھا۔ غالباً فراق صاحب منشی پریم چند سے سجاد ظہیر کا ذکر پہلے کر چکے تھے' اس لیے منشی صاحب نے پہلی ملاقات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ بھئی تم نے جیسا سوچا ہے ویسا ہی ہونا چاہیے' اس لیے سجاد ظہیر کو فوراً احساس ہوا کہ جس روشنی کی وہ تلاش میں تھے وہ انہیں مل گئی ہے۔

دوسری صبح سجاد ظہیر نے اپنے گھر میں چند ادیبوں سے نشست کرنے کا اہتمام کیا' چنانچہ رشیدہ جہاں علی گڑھ کی ہونے کی وجہ سے مولوی عبدالحق کو لے آئیں جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

رشیدہ جہاں' مولوی عبدالحق اور پریم چند منشی دیا نرائن نگم کے ساتھ پہنچے۔ سجاد ظہیر نے ترقی پسندانہ تحریک کے مقاصد اور تنظیم کی گفتگو کے ساتھ مینی فیسٹو کا مسودہ پڑھنے کو دیا۔ مولوی عبدالحق جو صاف گوئی میں مشہور تھے' انہوں نے کہا' "یہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کیا چاہتے ہیں؟"

سجاد ظہیر نے جواب دیا' اگر آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں تو اس پر دستخط کر دیں' ہم ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں سے اس پر دستخط کروا کر اسے شائع کرنا چاہتے ہیں۔" مولوی صاحب نے فوراً قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے۔

منشی پریم چند اور جوش صاحب خوش معلوم ہوتے تھے' شاید وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی برسوں کی ادبی کاوش اب بار آور ہو رہی ہے۔ کم از کم چند نوجوان' زبان سے سہی لیکن واضح طور پر یہ کہنے کے لیے کھڑے تو ہوئے ہیں کہ ادب کا سب سے بڑا مقصد قوم میں انسانیت اور آزادی کا جذبہ اور اتحاد پیدا کرنا ہے۔ ظلم کی مخالفت' محنت کش عوام کی طرف داری اور جمہوریت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم بالکل دوسری قسم کے آدمی تھے۔ دراز قد' دبلے' سیاہ فام سر پر فلٹ کی نیچی سی گول ٹوپی اور سیاہ شیروانی پہنے ہوئے' سونے کی کمانی کی عینک لگائے اور پان کھاتے ہوئے۔ وہ بھی یوپی کے باذوق کائستھوں میں تھے' جو اردو ادب اور شعرو شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کا رسالہ "زمانہ" (کانپور) ان وقتوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے بڑا معیاری رسالہ تھا جو ہمیشہ وقت سے نکلتا تھا۔ اس کے ساتھ وہ اچھے کاروباری بھی تھے۔ انگریز سرکار سے ہمیشہ بنائے رکھتے تھے۔ سیاست میں وہ کانگرس کے مخالف اور لبرل جماعت کے طرف دار تھے۔ انہوں نے مینی فیسٹو پر دستخط تو کر دیئے لیکن تاڑ گئے کہ یہ معاملہ یہیں پر ختم ہونے والا نظر نہیں آتا اور ممکن ہے کہ اس تحریک سے وابستگی ان کی سرکار پرستی میں مخل ہو۔

منشی دیا نرائن نگم کم گوئی کے قائل نہیں تھے' اس روز انہوں نے اپنی باتوں اور لطیفوں سے سب کو ہنسایا۔ چلتے وقت ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ڈرائنگ روم کے قالین کی تعریف کرتے ہوئے سجاد ظہیر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا: "بھئی اگر ہمارے پاس بھی ایسے بڑھیا اور لاجواب قالین ہوتے تو ہم بھی مزدوروں اور کسانوں کے راگ الاپتے۔" ان کے اس فقرے پر سب ہنس پڑے' لیکن سجاد ظہیر کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔

سجاد ظہیر پنجاب میں

جنوری 1936ء میں سجاد ظہیر نے پنجاب کا دورہ کیا' اس سے پہلے انہوں نے پنجاب کا اس طرح دورہ نہیں کیا تھا' سوائے اس کے کہ لڑکپن میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے لاہور اسٹیشن پر رکے تھے۔ پنجاب کے ساتھ خوشحالی' توانائی اور کسی قدر فطری سختی کا تصور ان کے ذہن میں ابھرا۔ البتہ انگلستان میں انہیں بہت سے نوجوان پنجابیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا' جن میں سے کئی سے گہری دوستیاں بھی ہوئیں' جیسا کہ میاں افتخار الدین' محمود علی قصوری' کرم سنگھ مان' پیارے لال بیدی وغیرہ' جن کے دل میں وطن کی آزادی کی لگن تھی لیکن ان کو ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ انگلستان میں قیام کے آخری دنوں میں ڈاکٹر ملک راج آنند اور اقبال سنگھ سے

ملاقات ہوئی۔ یہ بھی خالصاً ادبی ہونے کے باوجود اردو ادب سے تقریباً ناواقف تھے۔ انگلستان میں مدتوں تک رہ کر اور وہاں شادیاں کر کے کسی قدر انگریز بن چکے تھے اور انگریزی ہی کے ادیب تھے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر البتہ ان سب سے مختلف تھے۔ ان سے سجاد ظہیر کی پہلی بار ملاقات 1935ء کے شروع میں کیمبرج یونیورسٹی میں ہوئی۔ کیمبرج میں مارکسی خیال کے ہندوستانی طلبہ کا ایک چھوٹا سا حلقہ تھا۔ اس زمانے میں مارکس کے ہم خیال لوگ ہندوستانی طلباء کی ایک تنظیم بنانا چاہتے تھے' چنانچہ سجاد ظہیر کو لنڈن سے کیمبرج میں ہم خیال طلباء سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا' جہاں سجاد ظہیر کی محمد دین تاثیر سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان دونوں کو افسوس ہوا کہ انہیں اس سے پہلے ملنے کا موقع کیوں نہیں ملا' حالانکہ وہ ایک سال سے انگلستان میں رہ رہے تھے۔

سجاد ظہیر' تاثیر صاحب کی ذہانت اور بزلہ سنجی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد دونوں باقاعدگی سے ملنے لگے' چنانچہ لنڈن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے اور اس کے مینو فیسٹو میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کے باوجود سجاد ظہیر کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ تاثیر صاحب کی مارکسزم سے دلچسپی ذہنی نہیں بلکہ تفریحی ہے کیونکہ کبھی کبھی بحث کے دوران وہ ایسی باتیں کر جاتے تھے جس سے یہ تاثر ملتا تھا۔ لیکن وہ ان باتوں کو مذاق میں ٹال دیتے' کیونکہ ان کی دوستی میں گہرا خلوص تھا۔

اب کے سجاد ظہیر پنجاب آئے تو انکے ذہن میں پنجاب اور اس کے لوگوں کے لیے بڑی امیدیں تھیں۔ جہاں حالی اور محمد حسین آزاد جیسے شاعروں نے جدید اردو نظم اور نثر کی بنیاد رکھی' جہاں اقبال ایسا عظیم شاعر تھا' جہاں جلیانوالا باغ ایسی یادگار تھی' جہاں بھگت سنگھ کی دیس بھگتی تھی' جہاں وطن کی آزادی کے لیے تحریک خلافت' جہاں کی دھرتی سے خاکسار کے علاوہ فرقہ پرست سیاست کے خلاف مجلس احرار کی بے مثال قربانیاں تھیں۔

سجاد ظہیر الٰہ آباد سے سیدھے امرتسر محمود الظفر کے ہاں پہنچے۔ محمود الظفر یوپی (ریاست رامپور) کے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو تھی۔ لڑکپن سے ہی ان کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی' آکسفورڈ سے پڑھ کر وہ 1931ء میں ہندوستان آئے۔ اس وقت تک وہ اپنی مادری زبان بھول چکے تھے۔ وہ انگریزی شاعری کی لطافتوں اور باریکیوں

میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب ان سے اردو یا فارسی کے شعر یا زبان کے کسی دقیق مسئلہ پر گفتگو ہوتی تو ان پر عجیب سی افسردگی چھا جاتی۔ انہیں اپنی مادری زبان پر عبور حاصل نہ ہونے کا بڑا قلق تھا۔ وہ انگریزی میں کبھی کبھی شعر افسانہ یا ادبی مضمون لکھتے تھے۔ فلسفہ منطق اور معاشیات کی تعلیم نے ان میں نظم اور ان تھک کام کرنے کی بے انتہا صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ پٹھان نسل ہونے کی وجہ سے غصہ اور ضد ان کے مزاج کا اہم حصہ تھی۔ ان کی بیگم رشیدہ جہاں ان کے بالکل الٹ تھیں۔ انہیں باضابطگی سے نفرت تھی۔ محمود الظفر کبھی کچھ بھولتے نہیں تھے' جبکہ رشیدہ جہاں کو کبھی کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ دوست حیران تھے کہ وہ ڈاکٹر کیسے بن گئیں۔ محمود الظفر اور رشیدہ جہاں ایک کامیاب جوڑا تھا کہ ان دونوں نے اپنی زندگی کا مقصد اپنی ذات کو بھلا کر انسانیت کو بنا لیا تھا۔ خیر پنجاب جلد آنے کا مشورہ بھی رشیدہ جہاں نے دیا تھا۔ محمود الظفر امرتسر میں دو ڈیڑھ سال سے مقیم تھے۔ ان کی اور رشیدہ جہاں کی پنجاب کے ادیبوں سے کوئی خاص ملاقاتیں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر محمود الظفر پڑھاتے تھے۔ رشیدہ جہاں نے ایک اچھے ڈاکٹر کی طرح مریضوں کے سوا کسی سے تعلق پیدا نہ کیا' البتہ کبھی کبھی افسانہ لکھ لیتی تھیں' اس لیے سب سے پہلے سجاد ظہیر' محمود الظفر اور رشیدہ جہاں نے لاہور چل کر اپنے مشترکہ دوستوں اور میاں افتخار الدین کی مدد سے ادیبوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ لاہور جانے سے ایک دن پہلے رشیدہ جہاں نے محمود الظفر سے کہا "تمہارے کالج میں انگریزی شعبہ میں جو نیا لیکچرار لڑکا آیا ہے' کیا نام ہے اس کا؟"

"فیض احمد! وہ بولتا تو ہے ہی نہیں۔" محمود الظفر نے جواب دیا۔

رشیدہ جہاں بولی' "لیکن تمہارے کالج میں وہی ایک لڑکا مجھے سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم میرے کالج میں کون سمجھدار ہے اور کون نہیں' تم کتنوں سے مل چکی ہو؟" محمود الظفر غصے میں چیخے تو رشیدہ جہاں نے سجاد ظہیر سے کہا: "بنے بھائی! تم کو اس سے ضرور ملنا چاہیے۔" یہ سن کر محمود الظفر نے مسکرا کر کہا۔ "بھئی میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی فیض احمد سے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کر لی ہیں اور تمہارے متعلق بھی بتا دیا ہے۔ وہ آج شام ساڑھے چار بجے ہمارے ہاں چائے

پر آرہے ہیں' اور کل شام ہم ان کے ساتھ لاہور جارہے ہیں۔"

تیسرے پہر سجاد ظہیر اور فیض احمد کی ملاقات ہوئی۔ جس کا خطرہ تھا وہی ہوا' یعنی فیض احمد کچھ نہ بولے' سجاد ظہیر کو بھی نئے آدمی سے گفتگو کرنے اور اسے جاری رکھنے کا مشکل فن نہیں آتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ محمود الظفر اور رشیدہ جہاں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ فیض احمد شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں تو وہ بس انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والا ذہین نوجوان تھا' جس میں کچھ کچھ ترقی پسند رجحان پائے جاتے تھے۔ فیض احمد کے ادبی ذوق سے محمود الظفر اس لیے واقف تھے کہ فیض احمد ان سے اچھی اچھی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جایا کرتا تھا۔

باتوں باتوں میں انگلستان کے نئے شاعر اسٹیفن اسپنڈر اور آڈن کا تذکرہ ہوا' جن کے نئے شعری مجموعے شائع ہوئے تھے اور جن کی شاعری میں انگریزی شاعری کے مروجہ ٹی ایس ایلیٹ کے پھیلائے ہوئے تلخی اور نامرادی کے رجحانات سے ہٹ کر انسانیت کے نئے اشتراکی مستقبل اور یورپی عوام کی فاشسٹ دشمن جدوجہد کی پرامید جھلک تھی۔ سجاد ظہیر کو بڑا تعجب ہوا کہ فیض احمد ان شاعروں کے کلام کو نہ صرف پڑھ بلکہ سمجھ بھی چکا ہے۔ سجاد ظہیر نے جب ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فیض احمد سے پنجاب میں اس کے امکانات کے بارے میں پوچھا تو فیض احمد نے کسی خاص گرمجوشی یا انہماک کو ظاہر نہیں ہونے دیا' بس ایک پشیمان سی مسکراہٹ کے ساتھ بمشکل کہا: "لاہور چل کر دیکھتے ہیں' میرے خیال میں وہاں کچھ لوگ تو ہم سے متفق ہوں گے۔"

یہ سن کر رشیدہ جہاں چلا پڑیں: "یہ بھی خوب کہا! کچھ لوگ شاید متفق ہوں گے! جناب' ہمیں اس مینی فیسٹو پر بہت سے لوگوں کے دستخط لینے ہیں اور لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانی ہے۔"

محمود الظفر' رشیدہ جہاں کی اس حرکت پر گھبرا گئے۔ سجاد ظہیر بھی ابھی فیض احمد سے بے تکلف نہیں ہوئے تھے۔ وہ بھی سہم گئے' البتہ رشیدہ جہاں کی بے صبری یا جلد بازی پر فیض احمد ذرا کھل کر مسکرائے اور بولے: "لاہور چل کر کوشش کرتے ہیں' دیکھیں کیا ہوتا ہے!"

پروگرام کے مطابق دوسرے روز چاروں چراغ جلے لاہور پہنچ گئے۔ فیض احمد تو اپنے گھر چلے گئے' جبکہ باقی تینوں محمودالظفر' رشیدہ جہاں اور سجاد ظہیر سیدھے میاں افتخار الدین کی کوٹھی کنال بینک پہنچے جہاں پر میاں صاحب کے بجائے ان کے نوکروں نے ان کا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب مع بیگم کسی پارٹی پر گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ ہم آپ کو بتا دیں کہ وہ بہت جلد واپس آ جائیں گے۔

رشیدہ جہاں کو جیسے پہلے ہی بڑے آدمیوں کے کام نہ کرنے والے غیر سنجیدہ رویے کا علم تھا' اس لیے میاں افتخار الدین کو گھر پر موجود نہ پا کر بڑی برہم ہوئیں' جس کا اظہار انہوں نے زبان سے نہیں ماتھے کی شکنوں سے کیا۔ محمودالظفر نے بھی اپنے پیلے ہونٹ بھینچ لیے۔ سجاد ظہیر کو بھی رنج ہوا کہ کس چاؤ کے ساتھ وہ لاہور پہنچے تھے' انگلستان سے واپسی کے بعد آج ان سے پہلی ملاقات تھی۔ امرتسر سے لاہور تک کے مختصر فاصلے کے باوجود وہ بہت ٹھٹھرے ہوئے تھے' اگرچہ اس وقت وہ آتش دان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ نوکر چائے بنا کر بھی لے آئے تھے لیکن وہ تینوں آپس میں باتیں کرنے کے بجائے چپ بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد رشیدہ جہاں تو ایک گرم کشن میں منہ چھپا کر قالین پر ہی لیٹ گئیں' جبکہ محمودالظفر جیب سے پائپ نکال کر پینے لگے اور ساتھ ساتھ ایک نوٹ بک پر دوسرے دن کا پروگرام لکھنے لگے۔ نوٹ بک میں بیس پچیس ناموں کی فہرست تھی' جن میں ادیبوں شاعروں کے علاوہ آرٹسٹوں' پروفیسروں اور ادب نوازوں کے نام درج تھے' جن سے سجاد ظہیر نے ملنا تھا۔

سجاد ظہیر نے جب پوچھا کہ آپ تو کہتے تھے کہ آپ یہاں کے ادیبوں کو بالکل نہیں جانتے پھر یہ فہرست کیسے ترتیب دی گئی؟ اس سوال کے جواب میں محمودالظفر نے بتایا کہ میں تو ان میں سے صرف دو ہی سے واقف ہوں لیکن فیض احمد اکثر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ وہ ان سے تمہاری ملاقات کرا دیں گے۔ یہ سنتے ہی سجاد ظہیر کے ذہن میں فیض احمد کی شخصیت زیادہ واضح ہونے لگی۔ وہ ان کے متعلق سوچنے لگے۔ اتنے میں میاں افتخار الدین آ گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہو گا کہ وارد ہوئے۔ ان کی موٹر تو شاید چپکے سے آ گئی ہو' لیکن وہ خود بہت زوروں میں آئے۔ شاید باہر ہی ان کو مہمانوں کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ اب کیا تھا! دروازے دھڑا دھڑ کھلنے بند ہونے لگے۔ چاروں

طرف سے نوکروں کی بوکھلاہٹ میں دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گھر میں وہ جو انگریزوں کے مکانوں کا سا سکوت تھا ختم ہوگیا۔ چشم زدن میں کمرے کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا اور ایک چیز تیر کی طرح اندر داخل ہوئی اور سجاد ظہیر سے لپٹ گئی، بچھڑے دوست جب گلے مل گئے تو شکوے شکایتیں شروع ہوئیں، افتخار الدین نے مہمانوں کے گھر پہنچنے کے وقت اپنے موجود نہ ہونے پر ایک لمبی معذرت شروع کرکے کم از کم سجاد ظہیر کو تو بالکل مطمئن کردیا بلکہ وہ دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ اور بے جا طور پر ایک مخلص اور شفیق دوست کی طرف سے اپنے دل میں رنجش پیدا کرلی تھی۔ رشیدہ جہاں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھیں، لیکن اس کے ماتھے کی شکنیں ابھی اپنی جگہ پر موجود تھیں، البتہ ان کا رخ اس وقت افتخار الدین کے بجائے سجاد ظہیر اور محمود الظفر کی طرف تھا اور کہہ رہی تھیں۔

"تم بڑے بے حیا ہو۔"

اتنے میں عصمت بیگم افتخار الدین سرو خراماں کی طرح کمرے میں داخل ہوئیں۔ سجاد ظہیر اور محمود الظفر سے صاحب سلامت کرنے کے بعد رشیدہ جہاں کے پاس بیٹھ گئیں، کیونکہ عصمت بھی رشیدہ کی طرح علی گڑھ کی رہنے والی تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھیں۔ تھوڑی دیر بعد عصمت رشیدہ کو زنان خانے لے گئیں، یہ دیکھ کر نہ صرف سجاد ظہیر بلکہ محمود الظفر اور افتخار الدین نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

میاں افتخار الدین نے مہمانوں کی خاطرداری اور تواضع کے سلسلے میں سارے گھر کو سر پر اٹھالیا۔ محمود الظفر اس کوشش میں لگے رہے کہ جس کام کے لیے آئے ہیں، اس کے متعلق بات کی جائے لیکن میاں صاحب تھے کہ ایک منٹ ان سے بات شروع کرتے، لیکن دوسرے منٹ بھاگ کر اس کمرے میں جاکر لوٹ آتے، جہاں انہوں نے مہمانوں کے لیے بستر لگانے کا حکم دے رکھا تھا۔

آخر سجاد ظہیر نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے بارے میں بات شروع کردی، ابھی انہوں نے یہی کہا تھا کہ "ہم لاہور میں---" یکدم افتخار الدین نوکر پر چلا کر بولے! "مہمانوں کے نہانے کے لیے گرم پانی تیار کیا جائے۔" اور پھر مہمانوں کو مطلع کیا کہ

رات کے کھانے کے لیے ہم سب سر عبدالرشید کے ہاں (پاکستان فیڈرل کورٹ کے پہلے چیف جسٹس) مدعو ہیں۔ اس خبر نے محمود الظفر کی کمر توڑ دی' انہوں نے سختی سے کہا! "ہم سول لائن کی ڈنر پارٹیوں میں شریک ہونے کے لیے لاہور نہیں آئے۔ میں صرف دو دن کی چھٹی لے کر آیا ہوں' آپ ہم سے صرف دو گھنٹے اطمینان سے بیٹھ کر انجمن ترقی پسند مصنفین تحریک کے بارے میں مفید گفتگو فرمائیں۔"

میاں افتخار بھی ان لوگوں میں سے نہیں تھے' جن کو ان کے ارادوں سے آسانی کے ساتھ ٹالا جاسکے' وہ اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں سے بے حد بحثیں کرتے تھے۔ بظاہر ان کی بات قبول بھی کر لیتے تھے' کیونکہ دوسرا ان کی بات مان کر ہی ان سے اپنا پیچھا چھڑا سکتا تھا۔ چنانچہ میاں افتخار الدین نے جواب دیا' "بھئی بات یہ ہے کہ آپ کا خط آنے سے پہلے ہی ہم اس ڈنر پر مدعو کیے گئے اور ہم نے بھی یہ دعوت قبول کرلی تھی' لیکن جب آپ کا خط آیا تو میں نے سر عبدالرشید کو ٹیلی فون پر بتایا کہ ہمارے گھر بھی مہمان آنے والے ہیں' اس لیے ہم مجبوراً دعوت میں شریک نہیں ہو سکیں گے' تو انہوں نے بڑا اصرار کیا کہ تم ان تینوں کو میری طرف سے مدعو کرکے لانا۔ میں ان سے ملنے کا بڑا مشتاق ہوں۔ اب اگر آپ کہتے ہیں تو میں ٹیلی فون کردیتا ہوں کہ ہم سب نہیں آسکتے' لیکن آپ یہ بھی سوچیں کہ ہمارے پانچ آدمیوں کی غیر موجودگی میں ان کی ڈنر پارٹی خراب ہو جائے گی' ہم نے کھانا تو بہرحال کھانا ہی ہے' یہاں نہ کھایا وہاں کھایا' ہم جلد لوٹ آئیں گے۔ دوسرا میرا خیال ہے کہ سجاد ظہیر لاہور پہلی بار آئے ہیں' ان کو یہاں کے ہر قسم کے لوگوں سے ملنا چاہیے' غالباً وہاں میاں بشیر احمد بھی ہوں گے اور ممتاز شاہنواز بھی اور شاید کچھ اور کام کے لوگوں سے ملاقات ہو جائے۔

سجاد ظہیر نے محمود الظفر کی طرف دیکھا کہ اب کیا ارادے ہیں؟ محمود الظفر نے سر کو جھکا دیا' جیسے کہہ رہا ہو' "شریف آدمی کی دعوت میں جانے سے انکار بدتہذیبی ہی نہیں نامعقولیت بھی ہے۔" سجاد ظہیر خوش ہو گئے۔ میاں بشیر سے تو انہوں نے ملنا ہی تھا لیکن ممتاز شاہنواز سے ملنے کی خواہش یکدم مچل اٹھی' کیونکہ طالب علمی کے دنوں سے لنڈن اور آکسفورڈ میں ان سے ایک دو بار ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور اس وقت انہوں نے لاہور میں چند انگریزی دان نوجوانوں سے مل کر جنہیں انگریزی ادب سے

لگاؤ ہی نہیں، انگریزی کے ادیب بننے کا شوق تھا "لیٹریری لیگ" نام کی ایک تنظیم بنا رکھی تھی۔ یہ سب ادب میں جمالیات پر زیادہ زور دیتے تھے۔

ڈنر میں میاں افتخار الدین ان کی بیگم عصمت، محمود الظفر اور ان کی بیگم --- رشیدہ جہاں اور سجاد ظہیر کے علاوہ بیس مرد عورتوں کا مجمع تھا۔ میاں بشیر احمد سے اچھی گفتگو ہوئی۔

اس کے دوسرے روز فیض احمد کی رہنمائی میں لاہور کے مختلف ادیبوں سے ان کے گھر جا کر ملنے کا پروگرام بنا تو سجاد ظہیر نے چند روز یہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلی ملاقات سجاد ظہیر کی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے ہوئی کیونکہ فیض احمد صوفی تبسم کے شاگرد رہ چکے تھے۔ صوفی صاحب سے پہلی بار ملتے ہی سجاد ظہیر نے جو پہلی بات محسوس کی، وہ یہ تھی کہ ان کا تخلص "صوفی" بہت مناسب ہے۔ ان کے مزاج میں دلکش قسم کی نرمی تھی۔ ان کے لہجے اور انداز میں ایسا تبسم تھا کہ ان سے ملنے کے ذرا ہی دیر بعد ان سے بے تکلف ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔ وہ انسان کو ناقدانہ نقطہ نظر سے دیکھ کر اسے پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ اس کے دل کی بات سننے کیلئے تیار بیٹھے ہیں اور اس کی خوشی پر مسکرانے اور دکھ پر چپکے سے آنسو بہانے کے بعد کہنے والے ہیں کہ دوست اب تم یہیں میرے ساتھ رہ جاؤ، اس لیے ان کے دردمند دل کے طفیل پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کو بہت زیادہ مدد ملی۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے بعد فیض احمد، سجاد ظہیر کو اختر شیرانی کے یہاں ان کے مکان پر لے گئے۔ اختر شیرانی کا مکان پرانے لاہور کی ایک تنگ تاریک گلی میں تھا۔ صبح آٹھ نو کے قریب وہاں پہنچے، اس لیے دھوپ اگر وہاں پہنچتی بھی تھی تو اس وقت تک نہیں پہنچی تھی۔ اختر شیرانی کا کمرہ اوپر کوٹھے پر تھا۔ اندھیرے میں زینے پر ٹٹولتے ٹٹولتے جب وہ دونوں اوپر پہنچے تو انہوں نے اختر شیرانی کے کمرے کو بھی زیادہ روشن نہ پایا۔ بے ترتیبی سے چاروں طرف چیزیں بکھری تھیں۔ کاغذوں کتابوں اور کرسیوں کی ہتھیوں پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میلے کپڑے ادھر ادھر پڑے تھے۔ جھوٹی چائے کی پیالیاں اور صبح کے ناشتے کے برتن ابھی تک یوں ہی ایک طرف کو رکھے ہوئے تھے اور اس پراگندگی اور کثافت کے درمیان عوام کا محبوب رومانوی شاعر، سلمیٰ کا خالق،

حسن کا پرستار جس کے شعروں نے کتنے ہی نوجوان دلوں میں محبت کی ایک نئی چاشنی پیدا کی تھی' ایک پرانی سی لکڑی کی کرسی پر تہمد باندھے سرنگوں بیٹھا تھا۔ اس سارے ماحول سے اگر ایک طرف اختر کے مزاج کی آشفتگی ظاہر ہوتی تھی تو دوسری طرف معاشی تنگی بھی ٹپکی پڑتی تھی۔

اختر شیرانی کو اس حالت میں دیکھ کر سجاد ظہیر کے دل کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے پریشان ہو کر فیض احمد کی طرف دیکھا۔ فیض کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی ملی جلی کیفیت تھی اور زبان سے کچھ بولے بغیر اس نے کہا "ایک اختر شیرانی ہی نہیں ہمارے زیادہ تر ادیب شاعر اہل علم و فن اِنہی روح فرسا حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبھی تو ہم اپنی اس تحریک کو شروع کر رہے ہیں۔"

فیض احمد نے اختر شیرانی سے سجاد ظہیر کا تعارف کروایا اور ان سے ملنے کا مقصد بتایا تو سجاد ظہیر نے ترقی پسند ادب اور تحریک کے بارے میں کچھ باتیں کیں' جنہیں اختر شیرانی نے چپ چاپ بڑے غور سے سنا اور پھر چند ایسے سوالات کیے کہ انہیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ تحریک کے متعلق ان کا انہماک پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے کیونکہ وہ ان کی باتوں سے اتفاق تو ظاہر کرتے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا وہ کسی اور فکر میں غرق ہیں بہرحال انہوں نے ترقی پسند مصنّفین کے مینی فیسٹو کو غور سے پڑھا اور اس کے بعد دونوں کے کہنے پر مسکراتے ہوئے دستخط بھی کر دیئے۔

لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنّفین

دو تین دن کی دوڑ دھوپ کے بعد جس میں میاں افتخار الدین بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ شریک رہے' یہ ایک کامیاب دورہ ثابت ہوا۔ سب سے بڑا اجتماع میاں افتخار الدین کے گھر کے سامنے ایک خوبصورت لان میں ہوا' جہاں شام چار بجے کے قریب ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ استقبالیہ میں محمود الظفر' رشیدہ جہاں' سجاد ظہیر' فیض احمد اور افتخار الدین تھے جو میزبان بھی تھے۔ اس لیے وہ چائے وغیرہ کے انتظام کے لیے اپنے نوکروں کو بھی ادھر ادھر بھگا رہے تھے۔ محمود الظفر' رشیدہ جہاں اور سجاد ظہیر گھبرا رہے تھے جس کا اظہار وہ اس وقت اپنی غیر

معمولی خاموشی سے کر رہے تھے لیکن فیض احمد حسب دستور اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے جسے دیکھ کر رشیدہ جہاں جو گرم ذہن کی مالک تھیں انہیں تو غصہ آنا ہی تھا لیکن اس وقت ٹھنڈے دماغ والے سجاد ظہیر بھی چپ چاپ غصہ کھا رہے تھے۔ ایک ایک دو دو کر کے وہاں کل ملا کر کوئی پندرہ بیس ادیب اکٹھے ہو گئے' ان میں عبدالمجید سالک' چراغ حسن حسرت' میاں بشیر احمد' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم فیروز دین منصور کے علاوہ چند نوجوان ادیب شامل تھے۔

سب لوگ ایک حلقہ بنا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جلسے کی کارروائی سجاد ظہیرؔ نے شروع کی۔ انہوں نے ترقی پسند ادب کے متعلق اس وقت تک جو کچھ ہوا تھا' وہ بیان کیا اور تحریک کا مینی فیسٹو پڑھ کر سنایا اور اس پر عام بحث شروع کرنے کے لیے کہا۔ حاضرین نے بہت سے سوال اٹھائے۔ کئی سوالوں کے جواب دینا سجاد ظہیر کے لیے مشکل ہوا' بہرحال ان کے نقطہ نظر سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوا وہاں پر جتنے بھی صاحبان موجود تھے ان میں سے اکثر نے مینی فیسٹو سے اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ آخر میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں انجمن کی تشکیل کی جائے۔ فیض احمد نے تجویز دی کہ صوفی تبسم صاحب کو اس وقت عارضی طور پر انجمن کا سیکرٹری چن لیا جائے۔ جب انجمن کی رکن سازی مکمل ہو تو باقاعدہ عہدیداروں کا انتخاب کیا جائے گا۔ اس بات سے سب نے اتفاق کیا۔ صوفی تبسم بھی سیکرٹری بننے پر راضی ہو گئے۔

انجمن کے منشور کے مسودے کی اشاعت اور دو ڈھائی مہینے تک ہندوستان کے مختلف شہروں میں انجمن کی سرگرمیوں سے دانشوروں کے ایک بڑے حلقے میں ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستگی اور دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف شاخوں اور ان افراد نے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کے حامی تھے' متفقہ طور پر یہ مطالبہ کیا کہ ہمیں ایک کل ہند کانفرنس کرنا چاہیے تاکہ تحریک میں حصہ لینے والے ایکدوسرے سے مل سکیں' ملک کی مختلف زبانوں کی ادبی صورت حال کا جائزہ لیا جا سکے اور مرکزی انجمن کی باقاعدہ تنظیم ہو سکے۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کل ہند کانفرنس

چنانچہ الٰہ آباد کی انجمن جو عارضی طور پر تحریک کے لیے مرکزی حیثیت سے کام کر رہی تھی اس کے سامنے سب سے بڑا کام ترقی پسند مصنّفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کا انعقاد تھا۔

چنانچہ کانفرنس شروع ہونے سے آٹھ روز پہلے مرکزی دفتر الٰہ آباد سے لکھنؤ "وزیر منزل" میں منتقل ہو گیا۔ یہ سجاد ظہیر کے والد کا وسیع و عریض مکان تھا' جس کے ایک حصے میں سجاد ظہیر کے بڑے بھائی سید حسین ظہیر رہتے تھے۔ اس وقت تک لکھنؤ میں ترقی پسند مصنّفین کی کوئی شاخ قائم نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو دن کے بعد امرتسر سے ڈاکٹر رشیدہ جہاں اور ڈاکٹر محمود الظفر بھی لکھنؤ پہنچ گئے۔

ڈاکٹر محمود الظفر کے آ جانے سے کام میں باضابطگی پیدا ہو گئی۔ کانفرنس کے کاغذات' خطوط اور دستاویزات کی علیحدہ علیحدہ فائلیں بنائیں۔

لکھنؤ میں تین چار ہال تھے' جہاں عام طور سے کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ سب سے اچھی قیصر باغ کی بارہ دری ہے لیکن شاہان اودھ کے جانشینوں کی حیثیت سے اس پر اودھ کے تعلقہ داروں کی انجمن کا قبضہ تھا۔ انہوں نے شاید خفیہ کو اطلاع دی کہ ترقی پسند "خطرناک" شے ہے اس لیے وہاں سے ٹکا سا جواب مل گیا۔ گنگا پرشاد ورما ہال میں چھتری سبھا یا گئو رکھیا۔ قسم کی کوئی کانفرنس ہونے والی تھی۔ ایک زمانہ تھا رفاہ عامہ ہال میں بڑے بڑے تاریخی جلسے اور کانفرنسیں ہوتی تھیں۔ 1920ء میں یہیں پر خلافت کانفرنس ہوئی' جس میں علی برادران اور ملک کے تمام لیڈروں نے شرکت کی۔ کانفرنس کے لیے ہمیں فکر ہوئی کہ اگر لکھنؤ میں باقاعدہ استقبالیہ کمیٹی بنائی نہیں جا سکتی تو کم از کم استقبالیہ کمیٹی کا ایک صدر ہی بنا لیا جائے۔ سب نے آپس میں مشورہ کیا اور اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ موزوں چودھری محمد علی صاحب ردولوی کو سمجھا گیا۔ چودھری صاحب تعلقہ دار اودھ کے روسا میں سے تھے۔ ان میں پرانے لکھنؤ کی مہک اور اردو ادب کی بہترین روایات سے واقفیت تھی۔ وہ ایک لطیف طرز تحریر کے مالک تھے اور جدید ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب ان سے استقبالیہ کمیٹی کی

صدارت کے لیے کہا تو انہیں بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے معذوری کا اظہار یہ کہہ کر کر دیا کہ وہ کبھی کسی "تحریک" میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن رشیدہ جہاں کے اصرار پر وہ انکار نہ کر سکے، بلکہ چپکے سے سو روپے کا عطیہ بھی دیا۔ انہیں شرمندگی تھی کہ یہ رقم بہت کم تھی لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ کانفرنس کے لیے کسی ایک شخص سے بھی دس روپے سے زیادہ چندہ نہیں ملا تھا۔ اس طرح کل ڈیڑھ سو روپے لے کر کل ہند کانفرنس کرنے چلے تھے۔ دیوانے لوگ!

ملک کے مختلف حصوں سے جن ڈیلی گیٹوں کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی، ان کی تعداد مشکل سے تیس چالیس تھی۔ دو بنگال سے، تین پنجاب سے، ایک مدراس سے، دو گجرات سے چھ مہاراشٹر سے اور شاید بیس پچیس صوبہ متحدہ کے مختلف حصوں سے۔ یونیورسٹی کے چند طلباء کے ذریعہ اشتہار تقسیم کروائے گئے۔ کانفرنس سے دو روز پہلے پوسٹر چھپ کر آگئے تو محمود الظفر اپنے ساتھ ایک دو اور ساتھیوں کو لے کر شہر کے خاص خاص حصوں، نکڑوں اور چوراہوں پر رات بھر انہیں چسپاں کرتے پھرے۔ رشیدہ لکھنؤ میں چند سال پہلے ڈاکٹری کی پریکٹس کر چکی تھیں اور یہاں پر بہتوں سے واقف تھیں۔ انہوں نے گھوم پھر کر کانفرنس کی ریسپشن کمیٹی کے تین تین روپے والے ٹکٹ بیچنے شروع کیے۔ یہ لوگ ادب سے دلچسی لینے والے نہیں بھی تھے تو تین روپے کی حد تک تو انہیں ادب نوازوں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ہزاروں آدمی لکھنؤ آنے لگے تھے۔ ان میں سوشلسٹ لیڈر اور کمیونسٹ کارکن بھی تھے، جن میں اکثر ادیب نہ تھے تو ترقی پسند ادبی تحریک کے ہمدرد تھے۔ جے پرکاش نرائن کی سوشلسٹ سیاسی زندگی کا دلکش آغاز تھا۔ میاں افتخار الدین بڑے شدومد کے ساتھ کانگرس کی بائیں بازو کی سیاست سے منسلک ہو گئے تھے۔ سروجنی نائڈو نئے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور دلجوئی اور مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں، وہ بھی لکھنؤ میں تھیں اور انہوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کا وعدہ کیا۔ روپوں کی کمی کی وجہ سے کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں کو ٹھہرانے اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے انہیں دوستوں اور رشتہ داروں کے یہاں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا۔ زیادہ تر لوگ کانگرس کے کیمپ

میں جا کر ٹک گئے تھے جہاں ایک جھونپڑی چند روپوں میں کرائے پر مل جاتی تھی اور کھانا بہت سستا تھا۔ بعض یونیورسٹی کے ہوسٹل کے خالی کمروں میں ٹھہرے۔

بہت سے نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے کرایہ کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجہ میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے۔ پنجاب کی انجمن کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ کو چپکے سے بتایا کہ ان کے پاس بس لکھنؤ آنے جانے کا ہی کرایہ تھا لیکن اب سگریٹ یا تانگے کے کرائے تک کے لیے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں۔

کانفرنس کا استقبالیہ چودھری محمد علی نے پڑھا اور اس کا صدارتی خطبہ منشی پریم چند نے دیگر مقالوں اور تقاریر کے علاوہ آخر میں کانفرنس میں ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ بھی پیش کیا گیا جسے اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ انجمن کا مرکزی دفتر الہ آباد میں قائم کرنا طے پایا۔ انجمن کا جنرل سیکرٹری سجاد ظہیر کو چنا گیا۔ مجلس عاملہ کے بارے میں طے ہوا کہ اس کے ممبروں کو مختلف صوبوں میں علاقوں کی انجمنیں چنیں گی اور کوشش کی جائے گی کہ ہندوستان کی ہر بڑی زبان کے لیے علاقائی انجمنیں ہوں اور تمام صوبائی انجمنوں کے منتخب نمائندوں کی ایک کل ہند کونسل ہو جس کا اجلاس کم از کم سال میں دو مرتبہ ہو۔ یہ اپریل 1936ء کا واقعہ ہے۔ 1937ء میں گرمیوں کے شروع میں پنجاب کسان کمیٹی کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہونا قرار پایا۔ صوبہ متحدہ کی کسان سبھا کے کارکنوں کی حیثیت سے ڈاکٹر اشرف اور سجاد ظہیر کو بھی اس کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ انہی دنوں پنجاب کے ترقی پسند مصنفین نے بھی امرتسر میں اپنی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ انجمن کے کل ہند سیکرٹری سجاد ظہیر کو اس پہلی صوبائی کانفرنس سے مطلع کیا گیا۔ فیض احمد فیض اس کے مہتمم تھے' چنانچہ سجاد ظہیر کے لیے ایک پنتھ دو کاج کا معاملہ تھا۔ وہ سر کے بل امرتسر پہنچے۔

کسان سبھا کی کانفرنس جلیانوالا باغ میں تھی۔ ہزاروں پنجابی کسانوں کا اجتماع تھا۔ اس موقع پر یہیں کہیں ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھی ہونا قرار پائی۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض کو جلیانوالا باغ میں ادھر ادھر مسکراتے گھومتے دیکھا تو سجاد ظہیر نے پوچھا' اس ہنگامے اور مجمع میں مصنفین کی کانفرنس کیسے ہو گی؟

سجاد ظہیر نے کہا' "بھئی کسی مقامی ہال کو دو دن کے لیے لے لیجئے!"

"ہم نے ہر طرح سے کوشش کی لیکن کوئی بھی راضی نہیں ہوا تو ہم نے کسان سبھا والوں سے بات کی۔ وہ خوشی سے خالی وقت میں اپنے پنڈال میں ترقی پسند مصنفین کو اپنی کانفرنس کرنے پر رضامند ہو گئے کہ اس طرح پنجاب کسان سبھا اور ترقی پسند مصنفین ایک دوسرے کی سیرتیں نہیں تو صورتیں ضرور دیکھ لیں گے۔"

یہ سن کر سجاد ظہیر نے کہا "بھائی بات یہ ہے کہ میں تو سمجھا تھا کہ پنجاب کی اس صوبائی سطح کی کانفرنس کے لیے کم از کم ایم اے او کالج کا ہال تو ضرور مل سکتا تھا کیونکہ تم تو اس کالج میں لیکچرار ہو اور پھر اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر صاحب تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے ہیں۔"

فیض احمد نے کہا' "اس سے آپ اندازہ لگا لیں کہ بعض حلقوں میں ہماری انجمن کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

ان سب باتوں کے باوجود امرتسر میں یہ پہلی صوبائی سطح کی ادبی کانفرنس بڑی کامیاب رہی۔ اس میں چراغ حسن حسرت' ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر' فیروز الدین منصور' پروفیسر سنت سنگھ' ڈاکٹر محمد اشرف جیسے لوگوں کے علاوہ بہت سے نوجوان عوامی لیڈر اور کسان اور شاعر شامل تھے۔ کانفرنس کے بعد سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد اشرف لاہور تشریف لائے اور میاں افتخار الدین کے ہاں ٹھہرے۔

پنجاب کی طرح 1937ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس الہ آباد میں بھی ہو چکی تھی' جس کی صدارت مولوی عبدالحق نے کی تھی۔

1938ء کے وسط میں ڈاکٹر ملک راج آنند انگلستان سے ہندوستان آ گئے۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا' جس کے نتیجے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس دسمبر 1938ء میں کلکتہ میں ہوئی یعنی پہلی کل ہند کانفرنس کے پورے دو ڈھائی سال بعد۔ ان دو ڈھائی برسوں میں تحریک بڑی حد تک منظم ہو چکی تھی کیونکہ کلکتہ بلکہ بنگال کے اور بھی کئی شہروں میں انجمن کی شاخیں اور حلقے قائم ہو چکے تھے۔

اس زمانے میں بنگال میں خاص طور پر بائیں بازو کی جمہوری تحریکیں بہت تیزی

سے پھیل رہی تھیں۔ مزدور طبقے میں ایک نئی بیداری اور ہلچل تھی۔ کسانوں میں اپنے حقوق کے لیے جدوجہد جاری تھی۔ کسان تحریک لاکھوں دیہاتی محنت کشوں کو متحرک کر رہی تھی۔ طلبا کی زبردست تنظیم قائم ہوگئی تھی۔ کیمونسٹ پارٹی اپنے طور پر کام کر رہی تھی۔ بنگال میں ترقی پسند ادب کی تحریک بڑی تیزی سے پھیلنے کا بنیادی سبب یہی تھا کہ یہ ایک جمہوری تحریک کا حصہ بن گئی۔ بنگالی ادب کے اکثر بڑے ممتاز اور مشہور لکھنے والے کانفرنس میں رکن یا معزز مہمان کی حیثیت سے موجود تھے۔ کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر سدھیندرا ناتھ دت تھے جو بنگالی ماہنامہ "پریچے" کے مدیر تھے۔

اس کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں میں آسام' اڑیسہ' آندھرا اور تامل ناڈو کے چند نوجوان ادیب بھی تھے۔ گجراتی اور مرہٹی کے علاوہ ہندی کی نمائندگی کرنے والے بہار اور کلکتہ کے دو تین نوجوانوں کے علاوہ بلراج ساہنی اور ان کی بیوی دمنیتی بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے شانتی نکیتن سے آئے تھے۔ بلراج ساہنی اس زمانے میں رابندر ناتھ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں ہندی ادب کے لیکچرار تھے۔ پنجاب کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے کرشن چندر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ کرشن چندر پنجاب کی انجمن کے نئے سیکرٹری تھے اور خود افسانہ نگار تھے بہرحال انہوں نے پنجاب کی انجمن کی کارگزاریوں کی رپورٹ کانفرنس میں پیش کی۔

1938ء کے وسط اور 1939ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا مرکزی کام زیادہ تر لکھنؤ میں ہونے لگا۔ احمد علی بھی الٰہ آباد یونیورسٹی سے لکھنؤ یونیورسٹی میں آگئے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم (لکھنؤ یونیورسٹی سے عربی کے لیکچرار) اور ڈاکٹر ملک راج آنند نے مرکزی امور کو سنبھال لیا۔ انجمن کے مرکز سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ نکالنے کا پروگرام بنایا گیا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند' احمد علی اور ڈاکٹر عبدالعلیم تین آدمی اڈیٹوریل بورڈ میں تھے۔ اس سہ ماہی انگریزی رسالے کا نام "نیو انڈین لٹریچر" (نیا ہندوستانی ادب) تھا۔ اس کا پہلا شمارہ 1939ء کے ابتداء میں شائع ہوا۔ اس کے صرف دو شمارے شائع ہوسکے۔ تیسرا شمارہ تیار تھا کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔

فیض احمد فیض سے پہلی ملاقات

دوسری عالمی جنگ میں شمولیت کا اعلان ہندوستان کی برطانوی حکومت نے 3 ستمبر 1939ء کو کیا۔ میں اس وقت اگست میں امرتسر میں منعقد ہونے والے ضمنی انتخابات میں مجلس احرار کے امیدوار چودھری افضل حق کی انتخابی مہم کے سلسلے میں سرگرم تھا۔

شورش کاشمیری اور میں دن رات امرتسر کے کوچہ بازار میں سرگرداں تھے۔ اس وقت تک میری کتاب "سرمایہ داری" شائع نہیں ہوئی تھی' لیکن سوشلسٹ اور کمیونسٹ خیالات رکھنے والے میرے اکثر دوست بن چکے تھے' اس وقت ایم اے او کالج امرتسر میں فیض احمد فیض انگریزی کے لیکچرار تھے جبکہ پرنسپل ایم ڈی تاثیر تھے۔

فیض احمد فیض سے ملاقات ہوئی۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ ساتھ کسان مزدور تنظیموں کے بڑے سرگرم کارکن بلکہ عہدیدار تھے۔ وہ بشیر احمد بختیار اور مشہور کمیونسٹ لیڈر عبدالغفور طیش کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ ایم اے او کالج کے پروفیسر محب الحسن جو تاریخ اور سیاست کے استاد تھے' ان سے ملنے کا موقع ملا۔ میں ابتدائی طور پر ان سے بڑا متاثر تھا کیونکہ پروفیسر صاحب کے مضامین جامعہ ملیہ کے ماہوار رسالے "جامع" میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ دوسرا اس کالج میں ڈاکٹر محمود الظفر سے لے کر ڈاکٹر اختر رائے پوری اور پھر ڈاکٹر تاثیر تک کا تعلق ترقی پسند مصنفین تحریک سے بڑا گہرا تھا۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر صاحب (محمد دین) سے ملاقات یا شناسائی والد صاحب کے حوالے سے ہوئی تھی' کیونکہ تیس کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں جب عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے سالانہ رسالے "کارواں" کا ڈول ڈالا تو ان کے ہاں اکثر ادیب اور شاعر آنے لگے۔ ان میں مجید ملک' صوفی غلام تبسم' اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر شامل تھے۔ ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ والد صاحب کی گہری دوستی تھی۔ اس طرح وہ مجھے جانتے اور پہچانتے تھے لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد تاثیر صاحب جب بھی ملتے' خاص طور پر میری خیر' خیریت' گھر والوں کا حال احوال دریافت کر کے مجھے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ ضرور دیتے۔ ضمنی انتخابات میں مجھے متحرک دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا کہ میں

صرف ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر "مجلس احرار" کا ساتھ دے رہا ہوں۔

حافظ محمد شفیع

یونینسٹ پارٹی اور مجلس احرار کے درمیان انتخابی معرکہ ابھی جاری تھا کہ 3 ستمبر 1939ء کو دوسری عالمی جنگ کا بگل بج گیا۔

اس قدر گھمبیر سیاسی فضا میں میری نصابی سرگرمیوں کا متاثر ہونا ضروری تھا' خاص کر جبکہ میں اسلامیہ کالج کا طالب علم تھا۔ دادا جان بالواسطہ طور پر میری تمام سرگرمیوں سے آگاہ رہتے تھے۔ حافظ محمد شفیع ہی ہمارے درمیان ایک طرح کے مشیر تھے۔ وہ میرے دوست ہی نہیں استاد بھی تھے' لیکن ان کی طبیعت مجھ سے بہت مختلف تھی۔ میں ہمیشہ ان سے ڈرتا رہتا تھا۔ ان میں بھی بے پناہ احساس برتری تھا جو آہستہ آہستہ عمر کے ساتھ بڑھتا گیا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ بچوں ایسا سلوک کرتے تھے' لیکن میں بھی بڑا خود سر اور سخت قسم کا جذباتی واقع ہوا تھا۔ میں ہر آدمی کو اس کے اپنے مقام پر کھڑا کر کے دیکھتا تھا جبکہ دوسرا مجھ پر خواہ مخواہ قبضہ جمانے کی کوشش کرتا۔ اس کی حقیقت عبداللہ بٹ اور شورش کاشمیری اور پھر انعام اللہ ناصر کے خطوط سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ ایسا ہی کوئی جذبہ حافظ محمد شفیع کے ہاں ابھرنے لگا۔ میں نے اس بار گرمیوں کی چھٹیوں میں اکیلا ایبٹ آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ سوچا اس بار گرمیوں کے دن کشمیر کے بجائے سرحد کے سرسبز اور شاداب پہاڑی علاقے میں گزارے جائیں' کیونکہ اس بار میں محمد حسین عطا کے ساتھ چند دن گزارنا چاہتا تھا اور یہ مشورہ مجھے سید عبداللہ نے دیا تھا جس کا آبائی گھر مانسہرہ میں تھا۔ ایبٹ آباد میں تو محمد حسین عطا رہائش پذیر تھے۔ محمد حسین عطا سے میری ملاقات عبدالوحید کی وساطت سے ہوئی۔ محمد حسین عطا اس وقت صوبہ سرحد میں کانگرس کے جوائنٹ سیکرٹری اور ایڈوائزر کے علاوہ ہفتہ وار "اتحاد" کے ایڈیٹر تھے۔

حافظ محمد شفیع کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے روایتی انداز میں سمجھانے اور دھمکانے کی کوشش کی اور کہا۔ "دیکھو تم اس قدر سیاسی طور پر متحرک ہو کہ تمہارا

داخلہ کالج والے بھیجنے میں ہچکچاہٹ کر رہے ہیں۔ تم دادا جان سے کہہ کر یہ مسئلہ حل کرو۔" لیکن میں نے انہیں یہ کہہ کر اور مشکل میں ڈال دیا کہ "آپ میرے دوست بھی ہیں اور بزرگ بھی' اس لیے اس معاملے کو آپ ہی نمٹا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں ایبٹ آباد پہنچ گیا جہاں سے میں نے انہیں ایک طویل خط لکھا:

ایبٹ آباد 22 جولائی 1940ء

مکرمی و محترمی حافظ صاحب!

سلامتی ہو آپ پر! کل میں پہنچ تو دوپہر سے پہلے ہی گیا تھا اور آپ کو خط بھی لکھنا شروع کر دیا تھا' لیکن دماغ میں کچھ اس قدر بہتات کے ساتھ خیالات موجزن تھے اور چونکہ دل کی دبی ہوئی یہی خواہش تھی کہ وہ تمام کے تمام حضور دوست میں بصد عجز و انکساری پیش کروں' لیکن ان تمام خیالات کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے دلجمعی' صبر' سکون اور اطمینان درکار تھا۔ لیکن ان تمام چیزوں سے میری عمر کا بیشتر حصہ تہی دامن رہا ہے' چنانچہ کل بھی یہی ہوا۔ باوجودیکہ کل خط لکھنے کی کوشش کا آغاز نہایت خوش کن تھا' لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ آغاز کی دلفریبیاں اپنے اندر ناکامیاں چھپائے ہوتی ہیں۔ چنانچہ کل ایک صفحہ لکھ کر دل و دماغ کچھ اس قدر پریشان ہوا کہ پھر اس کے بعد خامہ فرسائی کی جرات نہ ہو سکی۔ اب پھر دن کے بارہ بجے ناکام کوشش کو کامرانیوں کی آغوش میں پناہ دینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔

آغاز یوں ہے' انجام------ وقت کے بے رحم تھپیڑوں کے سپرد کئے دے رہا ہوں۔ خط لکھنے کے متعلق ویسے اس وقت سے سوچ بچار کر رہا تھا' جس وقت کہ گاڑی کی پہلی حرکت نے ہم کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور خصوصاً آپ کا فقرہ کہ جب تک سگریٹ کی سلگاہٹ باقی رہے گی' اس وقت تک تم یاد رکھو گے' لیکن بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باوجود تمام------ کے بھی بھولنے کے بارے میں بے حد کمزور واقع ہوا ہوں اور بالکل اس انسان کی طرح جو ایک پتھر سمندر میں پھینکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سمندر میں ایک لمحے کے لیے ایک طوفان اٹھا' ہیجان برپا ہوا' شور کی آواز سنائی دی اور پھر وہی خاموشی اور سکوت۔ سطحی نظر رکھنے والا انسان یہی سوچتا اور سمجھتا ہے کہ سمندر اس پتھر کو بھول گیا اور اس کی اہمیت سمندر کے لیے بے

حقیقت ہے' لیکن کون جانتا ہے کہ کب اور کس وقت یہ چھوٹا سا پتھر ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ بنے گا' جو سمندر کی سطح کو ایک ابال میں ڈال دے گا' ہزاروں جہازوں کو نیست و نابود اور ہزاروں بستیوں کو پیغام اجل دے گا۔

وہی چیز آپ کے فقرے نے کی اور دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں تلاطم بپا کر دیا۔ بھولے ہوئے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ موت و حیات' محبت و نفرت' دوستی و دشمنی کے تمام واقعات---- کچھ بچپن کچھ اس کے بعد کے---- نظروں کے سامنے پھر گئے۔

اس تحریر کو آپ علمی لحاظ سے عدالت عقل و ہوش اور تنقید میں پیش کر سکتے ہیں اور آپ کو اس مدلل اختلاف کا ہر قسم کا حق ہے' لیکن اگر آپ اسے ادبی لحاظ سے پرکھیں گے تو سوائے اسے ایک بے جسم انسان کے کچھ بھی نہ پائیں گے۔

سب سے پہلا مسئلہ جس نے میرے غور و فکر' سوجھ بوجھ' عقل و ہوش اور خرد و دانائی کو دعوت دی ہے وہ میرے اور آپ کے درمیان مختلف اوقات میں پیدا ہونے والے اختلاف ہیں۔ میرا غور و فکر اس کا جواب یوں دیتا ہے:"انسان اپنے مخصوص ماحول کی تخلیق ہے' لیکن انسانی ماحول دو راہوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک تو انفرادی ماحول ہے اور دوسرا اجتماعی۔

انفرادی ماحول ہر شخص کا اپنا ہوتا ہے اور وہ ہم ایک دوسرے سے مختلف دیکھتے ہیں۔ ایک انسان جس گھرانے میں جنم لیتا ہے' اسی ماحول سے متاثر ہوتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تمام عمر اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اس ماحول سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ میں آپ کو اپنی مثال پیش کرتا ہوں کہ میں پندرہ برس تک حجام سے ناخن اتروانے کو غنڈہ پن سمجھتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے ناخن گھر میں اتارے جاتے تھے' اس لیے یہی اثر رہا کہ یہ کام اچھا ہے اور اس کے برخلاف جو بھی ہے وہ شرافت کے معیار کے خلاف ہے۔

اب عموماً ہوتا یوں ہے کہ دو انسان جب ایک دوسرے کے نزدیک آتے ہیں تو ان کو بعض دفعہ ایک دوسرے سے اختلاف ہو جاتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے نزدیک تو اس لیے آتے ہیں کہ حالات اور واقعات انہیں قریب لے آتے ہیں۔ وہ ایک

دوسرے کی محبت میں فرحت حاصل کرتے ہیں' لیکن نزدیکی کے بعد جس وقت مختلف شبستان زندگی میں ایک دوسرے کی رسائی ہوتی ہے' تو وہ دونوں اپنے اپنے ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں' لیکن چونکہ ہر انسانی ماحول ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ اس کا ماحول بہترین وافضل ترین ہے اور جبکہ خوش فہمی انسانی فطرت کا ایک خاصہ ہے۔ اب اس ماحول کا تفاوت وہ دونوں ایک دوسرے کے اور نزدیک آنے کے لیے دور کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ کتنی بڑی نادانی ہے اور میں اس وقت ہنس دیتا ہوں جس وقت کہ مجھ سے کوئی یہ کہتا ہے کہ یا میرے ہو جاؤ یا مجھے اپنا بنالو۔ یہ کتنی ناممکن سی بات ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ماحول کا تفاوت کس طرح دور ہو سکتا ہے؟ جبکہ ماحول نتیجہ ہے مادی حالات کا اور جب تک یہ مادی حالات نہ بدلیں دونوں برابر نہ ہو جائیں۔

اب جس وقت نہ ماحول بدلتا ہے اور نہ ہی نقطہ نظر میں فرق آتا ہے وہاں اختلاف رونما ہو جاتے ہیں اور دوسری چیز جو اس چیز کے پیچھے ہے وہ یہ ہے کہ میرے والد صاحب جب میں ساتویں جماعت میں تھا تو وہ انتقال کر گئے۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک جو روزانہ زندگی بسر کرتا رہا ہوں، کوئی اس زندگی کے بہاؤ کے بدلنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک قسم کی خود سری سی پیدا ہو گئی۔ دوسری طرف آپ کے ساتھ یہ ہوا کہ آپ بچپن سے ہونہار تھے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں تعلیم میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں جس نے آپ کے دوستوں اور ہم نشینوں کو آپ کے سامنے جھکا دیا اور اب آپ کی طبیعت میں کچھ ایسی افتاد سی پڑتی گئی کہ آپ کے ہر نظریے کو بہترین سمجھا جائے اور دوسرے بھی اس کو اپنائیں' اس لیے آپ نے ہمیشہ یہی کوشش کی خواہ ارادی طور پر خواہ غیر ارادی طور پر کہ آپ کا ہر دوست آپ کے ماحول و نظریات سے متاثر ہو۔

میں نے اپنے آپ کو متاثر کرنے کے کی بہت کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب ہوا۔ یہ جتنی بھی تھوڑی بہت فرمانبرداری کی عادت ہے' یہ سب میں نے صرف آپ کے لیے ڈالی ورنہ میرے کان فرمانبرداری اور کسی کے سامنے جھکنے کے الفاظ سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس طرح سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک خود سر طبیعت اور فرمانبردار طلب

طبیعت میں کس قدر تفاوت ہے اور ان کا آپس میں کبھی کبھی ٹکرا جانا کوئی بعید از قیاس نہیں۔ دوسرا مسئلہ جس نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑا ہے وہ "تم" اور "آپ" کا مسئلہ ہے۔ اب اجتماعی ماحول کی طرف آیئے' اجتماعی ماحول وقت کے مروجہ نظام حکومت کی تخلیق ہوتا ہے۔ حکومت کا اثر بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک پر نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی مختلف گروہوں میں بٹا ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ گروہ بھی حکومت وقت کے پیدا کیے ہوتے ہیں' لیکن ان تمام امور کے باوجود ان کے وجود اور ان کے اثر سے انکار نہیں کرسکتے۔ اب ہندوستان کی مجموعی حالت پر غور کیجئے۔ مغلیہ خاندان کی تباہی کے بعد انگریزی سامراج نے اپنے پاؤں خوب جمالیے اور چونکہ اس کا مقصد صرف تجارتی سربلندی تھی' اس واسطے اس نے جاگیر شاہی تہذیب جو مغلیہ خاندان کا نتیجہ تھی' اس پر ایک نئی تہذیب کا ڈھانچہ کھڑا کردیا۔

اب ادب کو بھی اسی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اردو بحیثیت زبان کے مرہون منت ہے فارسی زبان اور مغل شہنشاہیت کی' چنانچہ ابتدا میں یہی ہوا کہ جس وقت اردو زبان کا آغاز ہوا تو خسرو کی کتب اور ولی کی غزلیات کے علاوہ قصیدہ کا رواج لازمی تھا۔ چونکہ فارسی زبان کا سب سے اہم شعبہ قصیدہ تھا' اردو اس کے بغیر کس طرح پروان حاصل کر سکتی تھی اور شہنشاہ کی تعریف کے بغیر کس طرح اس کی سرپرستی ہوسکتی تھی' چنانچہ سب سے پہلے ممدوح کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ اس طرح سے رواج ہوگیا کہ غزلیات میں بھی آپ ہی استعمال ہوتا رہا۔

اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ جاگیردارانہ تہذیب کا سب سے اہم "خاصہ" تصنع ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارے اردو ادب میں بھی تصنع ہمیشہ سے استعمال ہوتا رہا ہے' یہ تصنع اس حد تک برتا گیا کہ غزلیات میں بھی آپ اور جمع کا صیغہ استعمال ہونے لگا۔ لیکن برطانوی شہنشاہیت نے جس وقت اپنا رنگ جمایا' جاگیردارانہ تہذیب کی اجارہ داری صرف ایک طبقہ تک مخصوص ہوگئی تو ادب میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔ غربت کی زیادتی نے انقلاب کی چنگاری کو ہوا دی۔ حقیقت' حقیقت نظر آنے لگی۔ تصنع کے پردے اٹھتے جارہے تھے' اس کے ساتھ مغربی تہذیب کا اثر بھی اردو پر ہوا۔ دوسری چیز یہ ہوئی کہ اردو ادب کو پروان چڑھانے والے بعض ایسے انسان پیدا ہوئے جو اردو

ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی کے بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ اس واسطے ان تین چار عناصر نے مل کر اردو ادب کو بالکل ہی نئے سانچے میں ڈھال دیا۔

اب آپ اپنی ذات لے لیجئے۔ آپ ذاتی طور پر اس تہذیب کے حامل ہیں جو نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ ماحول میں پلی۔ آپ کے والد ماجد ارادی طور پر جاگیرداری نظام کے سختی سے خواہاں تھے لیکن بڑھتی ہوئی سرمایہ داری نے ان کی جاگیرداری کو پنپنے نہ دیا اور اُن کے خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاگیرداری تو فنا کے عمیق غاروں میں دب گئی لیکن اس کے تمام اثرات اخلاقی اور معاشرتی زندگی پر نمایاں ہیں' چنانچہ آپ کی زندگی میں اور آپ کے برادر محترم کی زندگی میں تو یہ تہذیب بہت ہی نمایاں نظر آتی ہے' اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ آپ دونوں کے خیالات میں کتنی یگانگت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ میرا تو "تم" لکھنے کا سوال ہی چھوڑیئے۔ آپ کو آپ کے بڑے بھائی بھی جمع کے صیغہ سے مخاطب کرتے ہیں۔ ایک اور چیز سے اس کا ثبوت ملے گا کہ آپ کسی سے بہت ہی کم جمع کے صیغہ میں مخاطب ہوں گے۔ اب چھوڑیئے ان دقیانوسی بحثوں کو۔ ایبٹ آباد نہایت شاندار جگہ ہے اور میں جن کے پاس ٹھہرا ہوں وہ نہایت ہی شریف النفس انسان ہیں۔ یہاں پر شام کے وقت جب حسن عریاں ہو کر ایبٹ آباد کے وسیع اور پر رونق باغات اور سڑکوں کو سرفراز کرتا ہے' آپ اس کا اندازہ شاید دل پر ہاتھ رکھے بغیر نہ کرسکیں۔ یہاں پر حسن بے حد ارزاں ہے بلکہ مفت اور کچھ خوش قسمتی سے ہمارے میزبان حسین اور جوان واقع ہوئے ہیں ان پر چند جوان لڑکیاں دم مارتی ہیں۔ اب آپ ہی اندازہ لگایئے' سکون ہو تو کیسے شانتی ہو تو کیونکر۔۔۔؟

امید ہے کہ داخلہ آپ کو گھر والوں نے پہنچا دیا ہو گا اور آپ نے کالج پہنچا دیا ہو گا۔ شکر گزار ہوں گا اور کالج سے یہ بھی پوچھئے گا کہ کیا میں امتحان میں شریک ہو سکتا ہوں' کیونکہ مجھے ابھی تک تشویش ہے۔ جواب جلدی دیجئے بدی کا بدلہ بدی نیکی نہیں کہا جاسکتا۔ باقی سب خیریت۔ پڑھائی کچھ کر رہا ہوں' مزید امید ہے زیادہ اچھی طرح پڑھائی کرسکوں گا۔

میں ہوں عبداللہ ملک

ایبٹ آباد کے قیام کے دوران محمد حسین عطا کے علاوہ جن سے ملاقاتیں ہوئیں' ان میں اکبر کیانی جو انشورنس ایجنٹ تھے وہ بڑی باغ و بہار قسم کے جوان رعنا تھے۔ ایسے دوستوں کے ہمراہ وقت بہت خوشگوار گزرا۔ دو تین دن کے لیے مانسہرہ میں سید عبداللہ کے ہاں ٹھہرا۔ سید عبداللہ کا آبائی مکان ایک اونچی پہاڑی پر بڑا کشادہ اور عمدہ تھا۔ سید عبداللہ کی علمیت کا میں بہت قائل تھا۔ وہ بھی مجھ سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے تھے۔ دراصل میری ان کی دوستی کی وجہ "احراریت" تھی۔ سید عبداللہ اپنی اوائل عمری سے ہی بڑے کٹر احراری واقع ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ان کے اندر کشادہ دلی اور رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مانسہرہ میں ان کے سب سے عزیز دوست ایک قادیانی وکیل تھے۔

ستمبر 1940ء میں یونینسٹ حکومت مزید تین رہنماؤں کرم سنگھ مان' ہرکشن سنگھ سرجیت اور نوابزادہ محمود علی کو بھی گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی' جو ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق تقریباً چھ ماہ سے گرفتاری سے بچنے کے لیے مفرور تھے۔ ان پر الزام تھا کہ وہ کمیونسٹ لٹریچر کو نہ صرف جنم دے رہے ہیں' بلکہ انہیں تقسیم بھی کر رہے ہیں۔ اس ماہ سٹوڈنٹس یونین کے صدر نوابزداہ مظہر علی کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔

اکتوبر میں کانگرس نے گاندھی کی قیادت میں "سول نافرمانی" کی تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس تحریک میں کچھ اس طرح کا طریقہ اپنایا گیا کہ ایک شخص باہر گلی میں نکلتا اور جنگ کے خلاف نعرہ بازی کرتے ہوئے اپنی گرفتاری پیش کرتا۔ گاندھی جی نے پنجاب کانگرس کمیٹی کو ہدایت دی کہ "ان کانگرسیوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی' جو اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے اپنی ذاتی حیثیت میں یا تو ہڑتال کریں گے یا سختی یا تشدد کا راستہ اپنائیں گے۔" میاں افتخار الدین (پنجاب کانگرس کمیٹی کے صدر) کچھ جگہوں پر مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور ایسا کرنے کے بعد ان کا اپنی گرفتاری پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ لیکن گاندھی نے انہیں ایسا نہ کرنے کی ہدایت کی۔ 29 نومبر 1940ء کو میاں افتخار الدین نے اپنے آبائی قصبے باغبانپورہ سے اپنی گرفتاری پیش کی۔ گرفتاری کے وقت دس ہزار کا ہجوم تھا۔ گاندھی کی خواہش کے برخلاف لوگوں نے حکومت کے خلاف بڑے غم وغصے کا اظہار کیا۔ پولیس نے ہجوم پر لاٹھی چارج بھی کیا'

جس سے بہت سے افراد زخمی ہوگئے' اس لیے گاندھی نے پنجاب کانگرس کو ہدایت کی کہ وہ مقامی حکومتی اہل کاروں کو ستیہ گرہ کا نوٹس دیں۔ عام لوگوں کو اس تحریک میں شامل نہ کریں۔ گاندھی جی کا یہ رویہ اور حکمت عملی پنجاب میں کامیاب نہ ہو سکی' کیونکہ تمام صوبہ بائیں بازو کا مرکز بن چکا تھا' چنانچہ ستیہ گرہ کی تحریک کو دسمبر 1940ء میں ختم کرنا پڑا۔ پنجاب بائیں بازو کا مرکز تھا پھر بھی کیمونسٹوں اور کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے مابین اختلافات اس حد تک پہنچ گئے کہ کانگرس سے کیمونسٹوں کو الگ کر دیا گیا۔ ایسا کرنے سے پنجاب میں کانگرس سوشلسٹ پارٹی کو سخت نقصان ہوا کہ نوے فیصد ارکان نے کانگرس سوشلسٹ پارٹی چھوڑ کر کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی۔

باری علیگ

باری علیگ کی رہنمائی میں لکھی کتاب "جاگیرداری" کی اشاعت کے بعد میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے "گاندھی ازم" پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کیمونسٹ گاندھی ازم پر زبردست تنقید کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک برٹش کیمونسٹ لیڈر جو ہندوستان کی ٹریڈ یونین میں بڑے فعال تھے اور جن کا نام سپریٹ (Sprat) تھا' اور وہ میرٹھ سازش کیس میں بھی ملوث تھے' ان کی انگریزی میں کتاب "گاندھی ازم" شائع ہوئی۔

باری علیگ عرب ہوٹل کے ساتھ والی گلی چھوڑ کر اب انارکلی میں نگینہ بیکری کے ساتھ جو سولا ہیٹ بنانے والوں کی دکان تھی' اس کے اوپر والی منزل میں آ گئے تھے۔ اب یہاں محفلیں برپا ہونے لگیں اور پھر بہت جلد یہ غیرشادی شدہ لوگوں کا ڈیرہ سمجھا جانے لگا۔ یہیں پر سعادت حسن منٹو بمبئی سے آکر ٹھہرتا تھا۔ منٹو سے بھی میری پہلی ملاقات یہیں پر ہوئی تھی۔

فیروز الدین منصور کی وساطت سے دہلی میں "اومایا" سے ہونے والی ملاقات کو اومایا نے فراموش نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے اپنے آبائی گاؤں رام پور سے مجھے "ادب لطیف" کے چودھری نذیر احمد کی معرفت خط لکھا اور اس کے بعد ہماری خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے انہی دنوں "گاندھی جی اور ہماری تحریک" کا مسودہ تیار کر

لیا۔ فیروز الدین منصور اس وقت گرفتار تھے' فیض احمد فیض بھی ایم او کالج امرتسر سے لاہور ہیلی کالج میں آ گئے تھے۔ اب ان کی رہائش متصل باغ منشی لدھا رام موہنی روڈ پر تھی اور میں باقاعدہ ان سے ملنے جایا کرتا تھا چنانچہ میں نے انہیں "گاندھی جی اور ہماری تحریک" کا مسودہ دیا جو کہ ایک کاپی کے اوراق پر دونوں جانب لکھا ہوا تھا۔ فیض صاحب نے مسودہ دیکھا' اس کی ورق گردانی کی۔ انہوں نے اس کے بنیادی خیال سے اتفاق کیا اور بے حد تعریف کی اور کہا' آپ اسے میرے پاس چھوڑ جائیے۔ اسے ذرا درست کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ فقرے کی ساخت اور لفظ کا انتخاب موضوع کو گیرائی اور گہرائی بخشتا ہے۔ اس طرح مجھے فیض صاحب کے ہاں بے دھڑک جانے کا موقع مل گیا۔

فیض کے ہاں----

فیض صاحب کے ہاں بہت سی علمی اور ادبی شخصیات سے میں متعارف ہوا۔ خواتین کے سلسلے میں میری سب سے پہلی ملاقات ڈاکٹر رشیدہ جہاں سے ہوئی۔

سرما کا موسم تھا۔ میں فیض صاحب کے ہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ گھر پر ہی ہیں' چنانچہ میں سیدھا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت گوری چٹی خاتون ساڑھی پہنے اور کشمیری شال اوڑھے نیم دراز آگ تاپ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کشمیری شال کے بجائے ساڑھی کے پلو سے اپنے بدن کے اس حصے کو ڈھانپنا چاہا جس کا ننگا ہونا اس لباس میں معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ میں گم سم کھڑا تھا کیونکہ میں نے پہلی بار کسی عورت کا اتنا ننگا پیٹ دیکھا تھا۔ میں آداب بھی نہ بجا لا سکا۔

اتنے میں فیض صاحب کمرے میں داخل ہوئے میں نے انہیں سلام کیا' انہوں نے کہا' "بیٹھو نا!" میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر رشیدہ جہاں سے کہا' "یہ لڑکا عبداللہ ملک ہے۔" "سرمایہ داری" اور "جاگیرداری" پر اس کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ سن کر ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بڑی شفقت سے پوچھا "پڑھتے ہو؟"

"ہاں!" میں نے زبان کم سر کو زیادہ ہلایا۔ ڈاکٹر تھیں اس لیے میری بوکھلاہٹ کو

جلد سمجھ گئیں' اس لیے مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے کے بجائے فیض صاحب سے باتیں کرنے لگیں۔ میں جب تک وہاں بیٹھا رہا ان کے کشمیری حسن اور میٹھی میٹھی باتوں کے سحر میں ڈوبا رہا۔ آتی دفعہ میں صرف اتنا کہہ سکا' "مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" یہ سن کر رشیدہ جہاں بولیں' "مجھے معلوم ہے تمہیں کس بات پر خوشی ہوئی ہے۔" یہ کہہ کر ہنس پڑیں۔ ان کی ہنسی کا یہ زوردار چھناکا میں نے اپنے کانوں میں بھر کر گھر کی راہ لی۔

بعد میں فیض صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ رشیدہ جہاں کے والد کشمیری پنڈت تھے' جو مسلمان ہوئے۔ یوپی میں ہر نومسلم کو "شیخ" کہا جاتا ہے' اس لیے ان کا نام شیخ عبداللہ رکھا گیا۔ یہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے سرسید احمد کی مخالفت کے باوجود علی گڑھ میں مسلم خواتین کے لیے اسکول اور کالج کی بنیاد رکھی۔ رشیدہ جہاں نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور پھر لکھنؤ سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز سجاد ظہیر کی طرح افسانہ نگاری سے کیا۔

انگارے

یہ 1932ء کی بات ہے۔ سجاد ظہیر اپنی طالب علمی کے زمانے میں انگلستان سے چھ ماہ کی رخصت پر ہندوستان آئے اور انہوں نے دس کہانیوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع کیا۔ "انگارے" کے مرتب اور پبلشر خود سجاد ظہیر تھے۔ اس مجموعے میں ان کی پانچ کہانیاں شامل تھیں۔ "نیند نہیں آتی" "جنت کی بشارت" "دلاری" "گرمیوں کی ایک رات" اور پھر یہ ہنگامہ خیز کہانیاں انہوں نے سوئٹزرلینڈ کے دوران قیام لکھی تھیں۔

"انگارے" میں سجاد ظہیر کی پانچ کہانیوں کے علاوہ دو کہانیاں احمد علی کی "بادل نہیں آتے"۔ مہاوٹوں کی ایک رات' رشیدہ جہاں کی' دلی کی سیر' پردے کے پیچھے (یہ ڈرامہ تھا) اور ایک کہانی محمود الظفر کی "جوانمردی"۔ دس کہانیوں کے اس مجموعہ کے شائع ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اشاعت کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد سرکاری حکم سے اس کتاب کو ضبط کرلیا گیا۔ ناشر کی تحویل میں جو نسخے بچ گئے تھے انہیں نذر آتش کردیا

گیا۔

"انگارے" کی جتنی کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں' انہیں لوگ پوشیدہ طور سے پڑھتے رہے خاص کر ادیب اور دانشور جنہوں نے انقلابی قدموں کی آہٹ کو محسوس کر لیا تھا اور وہ اپنے سماج اور معاشرے کے زوال آمادہ ڈھانچے کو بکھرتا دیکھ رہے تھے۔ "انگارے" کی اشاعت کے بعد سجاد ظہیر انگلستان چلے گئے اور اپنے پیچھے مخالفت کا طوفان عظیم چھوڑ گئے۔ پڑھنے والوں کی مخالفت اس قدر بڑھی کہ مسجدوں میں' "رشیدہ جہاں انگارے والی" کے خلاف وعظ ہونے لگے' فتوے دیئے جانے لگے' جس کے سبب حکومت کو کتاب ضبط کرنا پڑی۔

ان دنوں مجھ پر بڑی ہیجان خیز کیفیت طاری تھی' میرے دل و دماغ پر شدید قسم کا دباؤ تھا۔ بچپن کی تمام دبی ہوئی خواہشات اجاگر ہونے لگیں تھیں۔ خاص کر کے رفیق سے انس اور پیار کی چنگاریاں سرد نہ ہو سکیں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ محلہ دار تھا۔ جنسی خواہشات کی گھٹن کے دور میں ہی اپنے ہم عمر رفیق سے دوستی پروان چڑھی۔ ہم دونوں اکٹھے رہنے لگے' سیرو تفریح' گپ شپ اور فلم بینی یعنی ان دنوں ہم یک جاں دو قالب تھے۔

اگرچہ میں کمیونسٹ پارٹی کا خفیہ پیغام رساں تھا۔ لیکن یہ میری اور دنیا تھی جسے میرے دل اور دماغ نے قبول کر رکھا تھا۔ جہاں تک جنسی خواہشات کا تعلق ہے۔ اس میں میری شخصیت خاصی الجھی ہوئی تھی۔

میں عورت کے معاملے میں ہمیشہ احساس کمتری میں رہا۔ آنکھیں کھولیں تو گھر عورت سے خالی پایا والدہ اور دادی کے سایہ عاطفت میں پلا۔ اگر کنبے میں کوئی ہم عمر لڑکی ہوتی تو میلان طبع اس کی طرف ہوتا۔ اور اس سے انس اور محبت کے تقاضے مختلف ہوتے۔ لیکن میں نے عورت کے بارے میں جو سوچا وہ صرف ذاتی رائے تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوانی کے تقاضوں کے لیے بھی عورت کو تلاش کرنے میں جھجک محسوس کرنے لگا۔ چنانچہ سالم جوان خوبصورت اوصاف رکھنے والی عورت خوابوں میں آتی رہی حقیقی زندگی میں اس کا عمل دخل نہ تھا۔ ویسے جن عورتوں کو نفسانی خواہشات کی آماجگاہ بنایا بھی تو وہ اس قدر نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں کہ سوائے حیوانیت کی

تشفی کے ان سے کچھ اور میسر نہ آ سکتا تھا۔ اس لیے ہمیشہ دل میں یہ خواہش رہی کہ کہ اگر عورت ملے تو Intellectual سی جس سے زندگی کے مسائل پر بحث ہو سکے۔ فلسفی ہو ناکہ زندگی کے متعلق اس کا اپنا نظریہ' ایک نقطہ نظر ہو اور اس سے ہم آہنگی پیدا کی ہو۔ اس لیے میں نے ایسی عورتوں کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ میری کوئی بہن نہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ میری بہن بن جائیں۔

ایک طرح سے یہ ایک سچ بھی تھا لیکن اس کے باطن میں میری جنسی بھوک ٹپکتی تھی۔ لیکن اس کا مجھے بہت کم موقع ملا۔ اس جنسی خواہشات کی گھٹن نے اپنے ہم عمر رفیق کی دوستی کو پروان چڑھایا۔



باب 7

کمیونسٹ اور دوسری جنگ عظیم

کمیونسٹ پارٹی کی خفیہ سرگرمیاں محدود ہو گئیں تھیں۔ تمام سوشلسٹ اور کمیونسٹ رہنما راجستھان میں دیولی کیمپ میں نظربند تھے۔

نوابزادہ محمود علی خان اور نوابزادہ مظہر علی خان انڈر گراؤنڈ پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے انچارج تھے۔ وہ اس وقت این ڈبلیو آر ورکرز یونین کے دفتر میں جو ریلوے روڈ پر گوالمنڈی چوک سے آگے ایک مکان کی بیٹھک میں تھا شام کے وقت اسی جگہ پر وہ اپنی کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین کے کارکنوں سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ گرفتاری کے بعد یہ رابطہ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن جب 22 جون 1941ء کو ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو ایک نئی سیاسی صورتحال سامنے آئی۔

چونکہ ستمبر 1939ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو یہ ایک سامراجی جنگ تھی یعنی ایک طرف فرانس' برطانیہ اور ان کی حلیف طاقتیں تھیں۔ برطانیہ ان کا سربراہ تھا وہ برطانیہ جو سب سے بڑا سامراجی ملک تھا جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا یعنی رنگا رنگ اور مختلف آب و ہواؤں کے ملک اس کے غلام تھے اس کے مقبوضات لاطینی امریکہ' افریقہ اور ایشیا آسٹریلیا سبھی خطوں میں پھیلے ہوئے تھے دوسرے درجے پر فرانس' پرتگال' اسپین اور بلجیم تھا غرض وہ تمام ممالک جن کے پاس مقبوضات تھے۔

دوسری طرف وہ ممالک تھے جو مقبوضات حاصل کرنا چاہتے تھے یعنی وہ عالم کو از سر نو تقسیم کرنا چاہتے تھے' ممالک اور مقبوضات کی تقسیم کے لیے جو جنگ ہوتی ہے اس

کو سامراج کی جنگ کہا جاتا ہے سوویت یونین 1920ء سے ہی کوششیں کر رہا تھا کہ یہ جنگ شروع نہ ہو لیکن سامراجی جنگ کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب جاپان نے مانچوریا پر چڑھائی کردی اور اٹلی نے حبشہ پر قبضہ جمایا۔

سوویت یونین چاہتا تھا کہ مغربی جمہوریتیں سوویت یونین کے ساتھ مل کر جارحیت کرنے والے ممالک کے خلاف محاذ بنائیں اور انہیں شکست دیں۔ سوویت یونین ایک مارکسی اشتراکی ملک ہونے کی حیثیت سے تاریخی جدلیات میں یقین رکھتا تھا اس لیے اس کے نزدیک سامراجی ممالک اگر سوویت یونین کے ساتھ مل کر فسطائی طاقتوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں گے تو اس سے دونوں طرف کے غلام ممالک کے اندر آزادی کی تحریکوں کو شہ ملے گی اور وہ اس دوران اپنے آپ کو زیادہ مضبوط اور منظم کر پائیں گے جبکہ سامراجی اور فسطائی طاقتیں جنگ کی وجہ سے کمزور ہوتی چلی جائیں گی اور ساتھ ہی جنگ میں کامیابی کے لیے ان کے اپنے عوام کے تعاون کی بھی ضرورت لازمی ہوگی اور اس کے لیے ان کو مزید مراعات اور حقوق دینے پڑیں گے۔ لیکن جدلیات دو رخی ہوتی ہیں۔ اور وہ ہر حالت میں ترقی پسند طاقتوں کے لیے راہ ہموار کردیتی ہے چنانچہ سامراجی ممالک نے سوویت یونین کو دھتکار تو دیا لیکن وہ جنگ سے محفوظ نہ رہ سکے اور ایک سامراجی جنگ میں ملوث ہو گئے۔

جنگ نے سامراجی دنیا کا بھرم کھول دیا اور جرمنی نے دنوں اور ہفتوں میں فرانس کو نہ صرف فتح کرلیا بلکہ خود برطانیہ پر ہوائی حملے کرکے اس کا بھرکس نکال دیا۔ ڈنکرک سے برطانیہ کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

اس پورے فوجی عمل نے تمام مقبوضہ ممالک کے عوام کے شعور اور عزم کو ایک نئی حقیقت سے آشنا کردیا۔ وہ اپنے حاکموں کو ناقابل شکست سمجھتے تھے جو دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کے مادھو نکلے' اس نے عوام کو ایک نیا ولولہ اور ایک نیا عزم عطا کیا۔

دوسری طرف فسطائی طاقتوں نے یعنی ہٹلر نے جب یورپ' فرانس اور برطانیہ کو ادھ مُوا کر دیا تو اس نے یہ سمجھا کہ اب اس طرف سے وہ محفوظ ہو گیا ہے چنانچہ اس نے 22 جون 1941ء کو سوویت یونین پر حملہ کر دیا لیکن اس نے یہ فراموش کر دیا کہ سامراجی طاقتوں اور سوشلسٹ ملک میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔

سامراجی ممالک میں متعدد تضاد ہوتے ہیں جو ان کو کامیاب جنگ لڑنے سے روکتے ہیں لیکن سوشلسٹ ملک ان تضادات سے کافی حد تک محفوظ ہوتے ہیں اس لیے دلجمعی کے ساتھ طویل جنگ لڑنے اور اپنی مدافعت کرنے کی ہمت اور ذرائع رکھتے ہیں۔

1940ء کے وسط میں جب کانگرس اور مسلم لیگ اپنے اپنے انداز میں حکومت ہند پر دباؤ ڈال رہی تھیں تاکہ ان کو اپنی شرطوں پر اقتدار میں شریک کیا جاسکے لیکن اس دور میں صرف کیمونسٹ ہی تھے جو منظم مزدور طبقے کے ذریعے جنگ مخالف تحریک کو ایک اجتماعی تحریک میں تبدیل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے اس لیے حکومت ہند نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت ہندوستان بھر سے کیمونسٹ قائدین اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کرلیا اور ان کے ساتھ بہت سے سوشلسٹوں کو بھی جو تحریک کے حامی تھے۔ اس طرح یہ سب راجستھان کے علاقہ دیولی میں باقاعدہ ایک نظربندی کیمپ میں محبوس تھے۔

جولائی 1940ء میں حکومت نے فارورڈ بلاک کے صدر سبھاش چندر بوس کو بھی کلکتہ سے گرفتار کرلیا۔ ان گرفتاریوں نے کانگرس کی قیادت کو خاصا پریشان کردیا۔ کیونکہ ان گرفتاریوں کی وجہ سے کانگرس کے اندر اس رجحان کو یکایک تقویت ملنی شروع ہوگئی کہ کانگرس حکومت کے خلاف بھرپور تحریک چلائے چنانچہ کانگرسی قیادت کے تمام لیت و لعل کے باوجود کانگرس اور گاندھی جی کو تحریک کے اجرا پر مجبور کردیا گیا۔ اس طرح ستیہ گرہ تحریک کو بہت ہی محدود کرنے کے لیے یہ انفرادی ستیہ گرہ کا اہتمام ہوا اور ستیہ گرہ کرنے کے لیے افراد کا انتخاب بھی خود گاندھی جی کے پاس تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ستیہ گرہ تحریک بہت بے دلی سے شروع کی گئی تھی اور حکومت اس بے دلی کو بہت اچھی طرح سے جانتی تھی چنانچہ اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا صرف وائسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کرکے کانگرس اور مسلم لیگ کو شامل کرنے پر ہی اکتفا کیا لیکن دونوں سیاسی جماعتوں نے اس پیش کش کو رد کردیا۔

17 جنوری 1941ء کو سبھاش چندر بوس اپنے گھر سے خاموشی سے فرار ہوگئے مارچ میں وہ اطالوی پاسپورٹ کے ذریعے کابل سے ماسکو اور پھر ماسکو سے سیدھا برلن پہنچ گئے جہاں جرمنی کے وزیر خارجہ ربن ٹراپ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ایک معاہدہ

کے تحت سبھاش چندر بوس برلن ریڈیو سے انگریز مخالف تقریریں اور جرمنی میں جو ہندوستانی جنگی قیدی تھے ان سے وہ آزاد ہند فوج ترتیب دینے پر مامور ہو گئے۔

22 جون 1941ء کو جرمنی نے پوری قوت کے ساتھ سوویت یونین پر اچانک حملہ کر دیا تو سبھاش چندر بوس نے ہندوستانی قیدیوں اور جرمنی میں مقیم ہندوستانی باشندوں پر مشتمل تین بٹالین پیدل فوج منظم کرنے کا منصوبہ بنایا۔

سبھاش چندر بوس کو یقین تھا کہ جرمنی کو اس جنگ میں فتح حاصل ہو گی اور جب جرمنی سوویت یونین کو شکست دیتا ہوا وسطی ایشیا سے گزرے گا تو اس وقت ان کی آزاد ہند اور جرمن فوج ہندوستان پر حملہ آور ہو گی تو ایسی صورت میں برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہی اپنی فوجیں چھوڑ کر ان کی آزاد ہند فوج کے ساتھ آملیں گے۔

1939ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تھی تو اس وقت ریڈیو سیٹ عام خلقت کے لیے اتنے عام نہیں ہوئے تھے اور عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھے لیکن جب لوگوں کو پتہ چلا کہ جرمنی کے برلن ریڈیو سے کوئی حبیب الرحمٰن' پھر عبدالرؤف اور پھر سبھاش چندر بوس تقریریں کرتے ہیں تو ریڈیو سیٹ کی مانگ میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ حالانکہ اس زمانے میں حکومت ہند نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ رولز کے تحت جرمن ریڈیو سننے پر پابندیاں عائد کر رکھیں تھیں لیکن اس کے باوجود ہر گلی اور ہر کوچے میں ایک ایک ریڈیو کے گرد سو سو انسانوں کا مجمع ہوتا جو برطانیہ کی شکستوں پر بغلیں بجاتے' یہ جگ بیتی نہیں ہڈ بیتی ہے۔ خود میں نے اصرار کر کے اپنے دادا جان کو ریڈیو خریدنے پر مجبور کیا اور جب شام کو آٹھ بجے برلن کی خبریں ہوتیں تو مختلف کونے کھدروں سے لوگ خبریں سننے کے لیے جمع ہونا شروع ہو جاتے۔

جب جب آگ کے شعلے مختلف ملکوں میں بلند ہو رہے تھے۔ سامراجی ملکوں کو شکست ہو رہی تھی۔ تب تب ہندوستان میں برطانوی حکومت اپنی گرفت سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں پر مضبوط سے مضبوط کر رہی تھی۔

سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے کے بعد کی صورتحال اور کمیونسٹ پارٹی کی نئی پالیسی کے متعلق آہستہ آہستہ معلومات جمع ہو رہی تھیں۔ سوویت یونین نے اپنے جنگی مقاصد کی وضاحت 3 جولائی 1941ء کو سرکاری طور پر کی اور اس کی وضاحت میں کمیونسٹ

پارٹی کے سیکریٹری جنرل سٹالن نے قوم کے نام ایک تقریر میں کہا:۔
"تمام قومیں اور ممالک جو نازی جرمنی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں ان کا اولین فریضہ جلد سے جلد فیصلہ کن شکست دینا ہے اور اس فریضہ کی تکمیل کے لیے ان تمام طاقتوں کو نازیوں کے خلاف متحد ہو کر اپنے تمام ذرائع کو اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے صرف کر دینا چاہیے۔"

کمیونسٹ کا روزنامچہ

جنگ کے پیش نظر خود سوویت یونین کی اشتراکی ساخت کی بنیاد پر دنیا بھر کی کمیونسٹ پارٹیوں نے اس جنگ کے کردار کی تبدیلی کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ وہ پارٹیاں تھیں جو اب تک اس جنگ کو بجا طور پر سامراج کی جنگ قرار دیتی تھیں۔ اور اپنے اپنے ملکوں میں اس جنگ کے خلاف رائے عامہ منظم کرتی تھیں۔

سوویت یونین کی جنگ میں شرکت سے جو صورتحال تبدیل ہوئی اس کا احساس ہم جیسے کمیونسٹوں میں آہستہ آہستہ اجاگر ہونا شروع ہوا کیونکہ کمیونسٹ قیادت کا کثیر حصہ دیولی کیمپ میں نظر بند تھا لیکن ایک قلیل گروہ باہر تھا جو خفیہ طریقوں سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔

یہی بات تھی کہ ان دنوں میں اپنی زندگی کے مختلف رویوں پر غور و فکر کر رہا تھا۔ اور انہی دنوں میں روزنامچوں کی صورت میں ان کیفیات کو قلم بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کیفیات کی چند جھلکیاں یہ ہیں:۔

"شام ہو چکی ہے دیئے جل گئے ہیں روزے کھل گئے ہیں میں ابھی ابھی باہر سے گھر پہنچا آتے ہی نماز پڑھی۔ اس لیے کہ میں نے سوچا اگر یہ دنیا اتنی سی بات سے خوش ہو جاتی ہے تو اس میں میرا کیا نقصان ہے۔

صبح سحری کے وقت آنکھ کھل گئی اٹھا اور سحری کھائی اور ریڈیو کو یونہی ہلانا شروع کر دیا ایک اسٹیشن اس وقت اپنی نشریات جاری کیے ہوئے تھا فجر کی اذان ہوئی اور میں نے نماز پڑھی اور رفیق کے ساتھ سیر کو نکل پڑا۔ سیر سے ہو کر فیض صاحب کی طرف گئے فیض صاحب سے کچھ عقیدت سی ہو گئی ہے۔ ان کو اپنی کتاب "گاندھی جی اور

ہماری تحریک" کا مسودہ بھی تو تصحیح کے لیے دیا ہوا تھا۔ اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا "میں پڑھ رہا ہوں"۔ سیر سے واپس گھر لوٹے۔

بعد میں اکیلا دہلی مسلم ہوٹل میں حمید کو ملنے چلا گیا۔ اس کی عمر تقریباً چھبیس ستائیس سال ہو گی لیکن اس کے باوجود وہ کافی دلکش ہے اس کا بدن روئی کے گالوں کی مانند ہے اس کے پاس بیٹھا رہا وہاں سے اٹھ کر میں پلازا سینما میں فلم "COMURADE" دیکھنے چلا گیا۔

اس فلم میں اشتمالی تہذیب پر چوٹ کی گئی تھی' لیکن یہ دیکھ کر کوفت نہیں ہوئی بلکہ خوشی ہوئی۔ اور میرے خیالات کو تقویت ملی اور اس کے بعد سرمایہ دار تہذیب کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا اور تاریخ کا درخشاں فیصلہ صاف لفظوں میں لکھا ہوا نظر آنے لگا کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنی ٹانگیں قبر میں لٹکا چکا ہے۔ اور وہ اب استحصالی تہذیب اور اس نظام کے چرکے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی تمام فلمیں چرکے کی کسک ظاہر کرتی ہیں جو سرمایہ دارانہ تہذیب اور نظام کے سینہ میں محسوس ہو رہا ہے۔

دنیا جنگ کی ہولناکیوں سے تنگ آچکی

فلم دیکھ کر گھر آیا۔ دراصل سینما گھر سے بہت خوش نکلا تھا اس کی وجہ بالکل عجیب اور انوکھی تھی۔ قمر سینما ہال میں ملا اس نے آوازے کسے کہ ابھی تک حسین ہو' یہ سن کر میرے گالوں میں خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی۔ میرا چہرا خوشی سے تمتما اٹھا۔ میری چال میں بھی یکایک ایک گونہ تبدیلی سی نمودار ہو گئی۔ میری گردن فخر سے بلند ہو گئی۔ میرا سینہ باہر نکل آیا۔ میری مسکراہٹ--- فتح کے نقارے پر چوٹ تھی۔ جس کی صدا میرے کانوں میں لوٹ لوٹ کر آ رہی تھی۔ اب آٹھ بجنے والے ہیں خیال ہے کہ پیونگا۔ آج نہ جانے کیوں اتنی پینے کو جی چاہ رہا ہے کہ پیتے پیتے تھک جاؤں اور آنکھیں خمار سے بند ہو جائیں۔

رات بھر بالکل نہیں سویا۔ رات بہت بے لطفی رہی۔ پینے کا پروگرام تھا۔ اس لیے تصور کی دنیا خم و ساغر سے آباد تھی لیکن شراب مہیا نہ ہو سکی۔ اس واسطے پروگرام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ریڈیو پہ مشاعرہ تھا وہ سنا۔ رفیق تو اسی دوران چلا گیا۔ لیکن حافظ صاحب باتیں کرنے لگے دل چاہا کہ ان سے بہت دیر تک باتیں کروں چونکہ بہت

سی باتیں ایسی تھیں جو ان سے کرنے والی تھیں کیونکہ وہی ایک ایسے انسان ہیں جن سے ہر بات کا ذکر کر دیتا ہوں چونکہ دماغ فلسفیانہ ہے اس لیے ہم دونوں بات کرتے ہیں تو ایک دوسرے کو سمجھ کر پس منظر کو دھیان میں رکھ کر' لیکن ابھی باتیں شروع ہی ہوئی تھیں کہ رفیق دوبارہ آ گیا--- اور پھر صبح اور ہی باتوں میں ہو گئی۔

رات ایک اور واقعہ ہوا کہ میرا روزنامچہ میرے چھوٹے بھائی عبدالرؤف نے دیکھ لیا۔ میں بہت پریشان ہوا کیونکہ میں نے اس میں رفیق کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ اس کی نظر ان صفحات پر پڑی جہاں میں نے فلموں کے بارے میں تنقید لکھی تھی۔ اس لیے اس نے مجھے دھمکاتے ہوئے کہا تھا میں امی جان کو بتا دوں گا کہ عبداللہ بہت فلمیں دیکھنے لگا ہے۔ سہ پہر چار بجے کے قریب دادا جی باہر خوش الحانی سے قران پاک پڑھ رہے ہیں ان کی آواز کانوں میں آ رہی ہے اور یہ میرے خیالات کی دنیا میں عجیب سی ہلچل پیدا کر رہی ہے یہ بے کیف سی زندگی یہ بے مقصد سے سانس۔ یکدم اٹھ کر میں ڈاکٹر بھگت رام کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر سے ملاقات نہ ہو سکی تو میں سید عبداللہ کے ہاں چلا گیا۔ مدت سے سید صاحب سے اپنی گناہگار زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتانے کو جی چاہا لیکن ہر دفعہ کسی نہ کسی وجہ سے نہ بتا سکا لیکن آج ضمناً ذکر ہو گیا تو انہوں نے کہا انسان کو اپنی صحت سے محبت کرنی چاہیے۔

سید صاحب سے کوئی آدھ گھنٹہ کی نشست کے بعد نگینہ بیکری میں چلا آیا وہاں قریشی صاحب سے ملاقات ہو گئی وہ سلجھے ہوئے سیاستدان ہیں اور سوشلسٹ نظریے کے حامل ہیں۔

رات نو بجے کے قریب میں اپنے مکان کی سب سے اوپر کی چھت پر بستر پر بیٹھا ہوں بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں کہ زمین میرے پاؤں سے نکل رہی ہے اور میں گرنے والا ہوں میری اپنی بنائی ہوئی عمارت زمین میں دھنس رہی ہے اور زمین کا بوجھ میرے کندھوں کے قریب سے قریب تر ہو رہا ہے۔ میں جس وقت اپنے پر غور کرتا ہوں اور اپنے خیالات کو پرکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر تمام واردات درمیانہ طبقہ کے فرد کی سی ہے جو موت کی طرف کشاں کشاں قدم بڑھا رہا ہے۔ موت سے میرا یہ مقصد ہے کہ وہ اپنے طبقہ سے نکل کر نچلے طبقے کی طرف جا رہا ہے۔ یہ طبقاتی

کشمکش ہر وقت میرے ساتھ رہی۔ اسلامیہ سکول سے میٹرک پاس کیا چونکہ یہاں عموماً درمیانہ طبقہ کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ دادی کا چہیتا تھا وہ خرچنے کے لیے اچھے خاصے وافر پیسے دیا کرتی تھی اس لیے اپنے آپ کی امارت کا احساس پیدا ہوا۔ دوسرا دادا جی کی سماجی اور مالی حیثیت خاصی مستحکم تھی۔ لیکن گورنمنٹ کالج میں امراء طبقہ سے واسطہ پڑا' تو دل میں ان کی برابری کا جذبہ پیدا ہوا' اخراجات کا بوجھ بڑھا۔ دادی جان کی وفات کے بعد احساس ہوا کہ یہ فضول خرچی ہے کیونکہ ہماری تمام سفید پوشی کا دارومدار جائیداد کی آمدن پر تھا وہ دن بدن کم ہو رہی تھی۔ گھر والوں سے بہتیرا پیسہ بٹور کر لے جاتا' وہاں کے دوستوں کی برابری کے لیے۔ لیکن دل میں خلش رہی کہ گھر والے قرض لے کر دیتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں ہی میں نے سیکھا کہ گرما کی تعطیلات سرد پہاڑی علاقے میں گزارنا چاہئیں۔ گورنمنٹ کالج میں ہی میں طبقاتی نظام کی گنجلکوں سے واقف ہوا ورنہ سیدھی سادی انگریز دشمنی کی تربیت تو بچپن سے ہی تھی۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ ساتویں جماعت میں تھا کہ میں نے مصر ہو کر کھدر کا ایک جوڑا بنوایا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں کہ میرا ماحول مذہبی اور احراری قسم کا رہا ہے۔ کچھ ان کی تقریروں کا غیر شعوری طور پر اثر اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں کبھی بھی درسی تعلیم میں نمایاں حیثیت کا مالک نہیں رہا اس احساس کمتری نے بھی خاصہ مشتعل کیا اور نمایاں حیثیت حاصل کرنے کے لیے احرار کی تحریکوں میں عملی طور پر حصہ لیا' قادیانی مخالف جذبہ بیدار ہوا تو قادیان میں احرار کی کانفرنس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انگریز دشمنی نے احراری اور کانگرسی بنا دیا۔ لیکن گورنمنٹ کالج میں یہ چیزیں دب گئیں بلکہ وہاں میں انگریزی تہذیب کا دلدادہ ہو گیا۔ اور ذہن میں یہ سما گیا کہ چونکہ ہم نچلے درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ایسا کرتے ہیں جبکہ اوپر کے طبقہ میں ایسی تنگ نظری اور فرسودہ خیالی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے میں نے اوپر کے طبقے کی زندگی کو اپنا لیا۔ لیکن اب احساس ہوا میں نہ صرف اپنے درمیانے طبقہ بلکہ اس سے بھی نچلے طبقے کی طرف گر رہا ہوں نہ مادی آسودگی حاصل ہے اور نہ روحانی۔ پتہ نہیں ایسے خیالات میں کھو کر میں کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔ صبح سو کر اٹھا اور پھر سارا دن گھر سے غائب رہا۔

رام پور کا سفر

رامپور میں اویاما تھا جس سے خط و کتابت کے بعد میرے دل میں اس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اویاما سے میری پہلی ملاقات دہلی میں فیروزالدین منصور کی وساطت سے ہوئی جہاں میں اپریل 1940ء میں آزاد مسلم کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ اس ملاقات کے کئی ماہ بعد چوہدری نذیر احمد مالک مکتبہ اردو کی وساطت سے خط لکھا اور اس کے بعد ہمارے درمیان باقاعدہ خط کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔

اویاما کی عمر اس وقت چھتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے سر کے بال سب سفید ہو چکے تھے۔ اس کا شمار ہندوستان کے بہترین مصوروں میں ہوتا تھا۔ اویاما کی سب سے بڑی وجہ شہرت اس کا جگر مراد آبادی کا وہ سکیچ تھا جو ان کے پہلے مجموعہ کلام "شعلہ طور" میں چھپا تھا۔ میں 16 اکتوبر 1941ء کو شام چھ بجے کلکتہ میل سے رامپور کے لیے روانہ ہوا۔ اس سفر میں حافظ محمد شفیع میرے ہم سفر تھے۔ سترہ اکتوبر کی صبح ہم رام پور اویاما کے گھر میں تھے۔

میرے ہاتھ اویاما کی نوٹ بک لگ گئی جس میں انہوں نے مصوری کے بارے میں مختلف مصوروں کے اقتباسات انگریزی میں لکھے ہوئے تھے۔ جنہیں میں نے بھی نوٹ کر لیا۔ اس کے ساتھ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ترانے کا ترجمہ پہلی دفعہ پڑھنے کا موقعہ ملا۔

مزدوروں نے ملکوں ملکوں
اب جھنڈا لال اٹھایا ہے
جو ننگا تھا جو بھوکا تھا
اب اس کو غصہ آیا ہے
روکے تو ہم کو کوئی ذرا
سارا سنسار ہمارا ہے

ہم محنت سے مزدوری سے
دھن دولت پیدا کرتے ہیں
پھر لاٹھی جوتا کھاتے ہیں
اور الٹے بھوکے مرتے ہیں
اب ایسا چوپٹ راج ختم
سارا سنسار ہمارا ہے

ہم بستی نئی بسائیں گے
ہم دنیا نئی بنائیں گے
راجہ مہاراجہ بنیوں کو
سب مل کر مار گرائیں گے
کیوں پرجا راج نہ ہو آخر
سارا سنسار ہمارا ہے

اویاما نے میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ ان کے ساتھ دو دن بہت خوشی کے کٹے۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے بھی ملاقات کرائی ان میں سے ایک مسعود الظفر اور ان کی بیوی فاخرہ تھی۔

مسعود الظفر نواب آف رامپور کے ہم زلف ہیں اور محمود الظفر جو نیشنل فرنٹ گروپ سے تعلق رکھتے ہیں ان کے چچا ہیں۔

مسعود الظفر سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ بہت اچھے آدمی ہیں سرمایہ دار ہونے کے باوجود کافی ہمدرد ہیں اور بہت ہی با اخلاق۔

دو دن سے حافظ کی طبیعت خراب رہی۔ دراصل انہوں نے زیادہ پی لی۔

رام پور سے ہم دونوں دہلی آئے اور رائل ہوٹل میں قیام کیا۔ دہلی میں چراغ حسن حسرت سے ملے اور ان کے ہاں دو وقت کا کھانا بھی کھایا اور شراب نوشی کا پروگرام جان بوجھ کر نہیں بنایا کیونکہ سچی بات ہے اب میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ شراب تو کجا اب تو بیئر بھی برداشت نہیں ہوتی۔

دہلی کا قیام کافی تلخ رہا' اس کی وجہ حافظ صاحب تھے دراصل ان میں احساس برتری پیدا ہو گیا ہے چونکہ وہ کافی دیر سے لڑکوں کو پڑھانے کا کام کرتے ہیں اور لڑکوں پر رعب تو ہوتا ہی ہے وہ انہیں آپ کہہ کر بلاتے ہیں۔ اب ان کی یہ عادت بن گئی ہے کہ ہر کوئی اُنہیں آپ کہہ کر پکارے۔

فلم اور معاشرہ

فلمیں مدت سے دیکھ رہا ہوں لیکن تین چار سال سے میں فلم ایک ناقد کی حیثیت سے دیکھتا کہ کہاں تک اس فلم نے ہمارے مسائل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ میرے سامنے فلم کا اچھا معیار یہی تھا کہ آیا فلم ہماری زندگی اور سماج کے تلخ حقائق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے پچھلے سالوں میں اپنے دوستوں میں بیٹھ کر ان فلموں پر سختی سے تنقید کی ہے جو ہنسانے کے سوا کوئی مقصد پورا نہیں کرتیں اور اس طرح سے ہماری بلائی ہوئی جنتا (عوام) کو تھپکیاں دے کر سلانے میں مدد دیتی ہیں۔ بجائے اس کے فلمیں ہمارے عوام کے مسائل کو سمجھائیں ان میں شعور پیدا کریں کہ ہمارے بنیادی مسائل یہ ہیں اور ان کا حل یہ ہے۔

یہ سب جانتا ہوں لیکن اس کے باوجود اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ فلمیں پسند کرتا ہوں جن کے دیکھنے میں چند لمحات کے لیے سب کچھ بھول جاؤں کہ میں کہاں ہوں کیا ہوں کیونکر ہوں۔

دراصل میری زندگی گریز کی طرف کشاں کشاں قدم اٹھا رہی ہے۔ اب میرے دکھ اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اب میں مقابلہ نہیں کر سکتا جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے دل کے احکام کی ہی اطاعت کرتا چلا آیا ہوں۔ لیکن پچھلے تین سال سے دماغ بھی اس قدر جوان ہو گیا ہے کہ اب وہ اس اطاعت پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ لیکن ایک نتیجہ تسلیم ہے کہ دل کی اطاعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ سب کچھ لٹا دو' کس لیے؟ چونکہ تمہارے دل کا حکم ہے۔ سب سے پہلا نقصان جو دل کی اطاعت کے صلے میں ظہور پذیر ہوا وہ 1937ء کے اپریل میں ایف۔اے کا امتحان نہ دے پانا تھا۔ ضمنی امتحان میں پاس ہونے کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ نہ ملا تو میں ایف سی کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن

وہ گھر سے بہت دور تھا اس لیے میں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخلہ لے لیا۔ اور اس کے بعد سے آج تک کامیابیاں ہی کامیابیاں لیکن ناکامیوں کی کسک لیے ہوئے۔

تمام دن آجکل گھر سے باہر رہتا ہوں۔ اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لیے دل کو بہلانے کے لیے زمانے بھر کے مشاغل ڈھونڈے۔ اب سوچتا ہوں اور دل سے کہتا ہوں عبداللہ تم بی اے بھی نہیں کر سکے؟ ایسا کیونکر ہوا؟ یہ سوال میں اپنے آپ سے کرتا ہوں لیکن اس کا جواب نہیں پاتا۔

پھر میں اپنے آپ سے اور سوال کرتا ہوں آخر میں کس لیے پیدا ہوا ہوں؟ ان دنوں زندگی جتنی اداس تھی ایسی پہلے نہ تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہر طرف مایوسی۔ پھر کئی دنوں کے بعد ایک دھندلی سی شعاع دکھائی دی۔ جو میرے خوابوں کی تعبیر اور میری امیدوں کی پناہ بن گئی۔ رات گئے تک جاگتا رہتا ہوں۔

رات کے دو بج چکے ہیں نیند نہیں آرہی۔ نیند آئے بھی تو کیسے' بارہ بجے کے گجر کے بعد نیا سال طلوع ہو گیا ہے۔ HAPPY NEW YEAR 1942 اس کے باوجود نئے سال کے لیے نئی منصوبہ بندی کے لیے بھی جی نہیں چاہ رہا۔ یہاں تک کہ آرام طلب بلکہ آہلکس ہو گیا ہوں کہ اب تو کئی روز سے روزنامچہ لکھنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ حالانکہ کالج کے دنوں میں روزمرہ زندگی اتنی ہنگامہ خیز رہی کہ رات کو میں روزنامچہ نہ لکھتا تو دوسرے دن واقعات و کردار گڈمڈ ہو جاتے لیکن اب یہ سب کچھ بے کار سا بجھائی دیتا ہے۔ اب تو بے معنی آوارگی رہ گئی ہے۔ توجہ یا یکسوئی کسی طرف مرکوز نہیں ہو رہی۔

سٹوڈنٹس یونین نے سینٹ ہال کے سامنے اپنے مطالبات منوانے کے لیے مظاہرہ کیا۔ لیکن وائس چانسلر کی ایما پر چند طلباء نے اس مظاہرہ میں گندگی پھیلانے کی کوشش کی ان طلباء میں عبداللہ بٹ بھی شامل تھا۔ اس دن نگینہ بیکری میں حمید نسیم مجھے ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ آل پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ مجھے اس چیز سے خوشی ہوئی کیونکہ اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چند روز کے بعد میں ریواز ہوسٹل کے کمرہ نمبر 117 اور 119 مین پہنچا۔ اور وہاں حمید نسیم' ظہور عالم شہید اور فصاحت علی سے ملا۔

ظہور عالم شہید بہت اچھا لڑکا تھا کٹر قسم کا مسلمان تھا لیکن اس کے باوجود بہت ہی حد تک سادا ہے۔ اس نے بریڈلے ہال میں تقریر کی تھی کہ یہ طلباء نے جو مظاہرہ میں دنگا کیا ہے بہت برا کیا ہے۔ اس پر ہوسٹل کے لڑکے اسکے مخالف ہو گئے تھے۔

ریواز ہوسٹل میں جانے کا مقصد محض سیاسی تھا۔ لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ میں ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں پھر سے میرے اندر ہیجان برپا ہو جائے گا اور میں پھر سے ایک سال پیچھے چلا جاؤں گا۔ فصاحت کافی دلکش تھا گندمی رنگت لیکن نقوش قیامت خیز تھے۔ بات کرنے کا طریقہ کافی لبھانے والا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اردو بولتا تھا۔ اب میں ہر وقت پڑا اس کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔

زندگی ہر لمحہ کسی نہ کسی تبدیلی سے ہمکنار ہوتی رہتی ہے۔ اور بعض دفعہ اتنی اہم تبدیلیاں دیکھنے میں آتی ہیں کہ انسان خود حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ میں اپنی طرف دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ پہلے میں شب و روز کے واقعات لکھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا اور اس پہ طرہ یہ کہ بے تکان لکھتا جاتا تھا۔ لیکن اب کچھ بھی لکھنے کو بیٹھتا ہوں تو چند سطور سے آگے نہیں لکھ سکتا۔ زندگی اب اعضاء شکنی کا نام رہ گئی ہے۔

جس طرح شراب کے جام لنڈھانے کے بعد ایک وقت آتا ہے جب کیف و سرور و مستی الوداع کہتی ہے اور اس کے بعد سوائے اعضاء شکنی کے باقی کچھ نہیں رہتا۔ یہی حال زندگی کا ہے کیف کا بھرپور جام خالی نظر آ رہا ہے۔

دراصل بیماری جسم کے اندر اتنی گہری اتر گئی ہے کہ اب اس کے اثرات جسم کے ہر عضو پر ظاہر ہو رہے ہیں مثلاً سو کر اٹھتا ہوں تو تھکن اس طرح محسوس ہوتی ہے کہ چار راتوں سے سویا نہیں اور پڑھتا رہا ہوں۔ سر درد محسوس ہوتا ہے جی چاہتا ہے کہ بستر پر پڑا رہوں۔ اور دنیا میں کام کرنے کو کوئی نہ کہے۔ اگرچہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن نہیں لکھ سکتا اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ ایسے جینے سے مر جاؤں۔

میری مثال اس انسان کی طرح ہے جو کھلی فضاؤں میں سانس لے رہا ہو۔ پہاڑوں کی شفاف چوٹیوں پر گھوم رہا ہو چاند کی چاندنی سے اٹھکیلیاں کر رہا ہو ایک خوشی و مسرت سے بھرپور زندگی بیتا رہا ہو۔ تو یکدم اسے غار کی گہرائیوں میں پھینک دیا جائے' وہ آنکھیں کھولے تو زندگی ایک بھیانک غار میں ہو۔

دادا جان کی وفات

6 مارچ 1942ء کو میری زندگی کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ چنانچہ میری وہ زندگی جو ایک جگہ رک سی گئی تھی اور اس پر سرد مہری اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی یکدم میری عملی زندگی میں ہلچل بلکہ ہنگامہ خیزی شروع ہوگئی۔ یہ دھچکا دادا جان کی وفات تھی۔

میری زندگی اس وقت اکیس سال سات ماہ تھی۔ اس موت نے میرے سر سے وہ چھت' چھاؤں چھین لی جس کے سائے میں زندگی کا وہ شعور حاصل کیا جس کا اس عمر میں حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔

میں نے جب انیس برس کی عمر میں اشتراکیت کے حوالے سے "سرمایہ داری" کتاب لکھی تو اس کا انتساب بڑے جذباتی انداز میں اپنے دادا جان کے نام کیا تھا۔ کیونکہ یہ میرے دادا ہی تھے جنہوں نے اپنی اکلوتی اولاد بیٹے کی جواں سال موت کے صدمے کو قبول کرتے ہوئے ہم دونوں بھائیوں اور والدہ کو جس انداز سے سہارا دیا اور تربیت کی یہ ان کی ہی دانائی اور حکمت تھی۔ والد کی وفات کے بعد ہم دونوں بھائی نابالغ تھے۔ دادا اور دادی کی جائیداد کی وراثت کا مسئلہ جو بڑا گنجلک تھا بڑی ذہانت اور فطانت سے سلجھا دیا تھا کیونکہ دادی کے انتقال سے پہلے ہی دادا اور دادی نے اپنی اپنی جائیداد کی وراثت کے لیے ایک مشترکہ وصیت نامہ تحریر کیا۔ اور اس وصیت نامے پر ایک طرف تو انہوں نے علماء سے پوتوں کے جائز وارث ہونے کے فتوے حاصل کئے اور ساتھ ہی اپنے تمام بہن بھائیوں اور ان کی اولادوں سے اس وصیت نامے پر دستخط کرائے کہ ان کا عمدہ جان' نور الٰہی اور محمد عمر کی جائیداد پر کوئی حق نہیں اور وہ محمد عبداللہ اور عبدالرؤف کو جائیداد کا جائز حقدار تسلیم کرتے ہیں۔

اس وصیت نامہ کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا اور پھر عبدالعزیز نامور کاتب سے کتابت کروا کر اس کی نقلیں بنوا کر انہیں باقاعدہ سب رجسٹرار میاں امیرالدین کو گھر بلا کر سرکاری طور پر رجسٹر کروایا۔ یہ وصیت نامہ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔

6- مارچ 1942ء کو دادا جان کی وفات نے میرے اندر ایک طرف جذباتی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی

جائیداد کے تحفظ کا بھی یقین تھا۔ لیکن اس یقین کے ساتھ یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں کرایہ داروں کے ساتھ پھر سے مقدمہ بازی نہ شروع ہو جائے۔ کیونکہ والد کی وفات کے بعد گوالمنڈی کے ہندو کرایہ داروں نے کرایا دینا بند کر دیا کہ اس کا جائز وارث معلوم ہو گا تو ہم اُسے کرایہ دیں گے۔

مجھے یاد ہے کہ دادا جان نے کرایہ داروں سے کرایہ کی وصولی کے بجائے اُن کے خلاف بے دخلی کا مقدمہ دائر کرادیا۔ انہی دنوں دادا جان کے ساتھ مجھے عدالتوں اور کچہریوں کا تجربہ حاصل ہوا۔

مجھے یاد ہے کرایہ داروں کی بے دخلی کا مقدمہ سب جج چوہدری رحمت الٰہی کی عدالت میں چل رہا تھا۔ دادا جان نے فیصلہ اپنے حق میں کرانے کے لیے رشوت کے طور پر آٹھ ہزار روپے جج صاحب کو ادا کرنے کا سودا طے کیا۔

رقم کی ادائیگی کے لیے دادا جان نے مجھے ایک آدمی کے ساتھ جج صاحب کے گھر دل محمد روڈ بھیجا جہاں ہم نے یہ رقم ادا کی۔ لیکن مقدمہ کے فیصلے کی حتمی تاریخ سے دو دن پہلے یہ رقم جج صاحب نے ہمیں واپس بھجوادی۔ ہم نے سمجھا جج صاحب کو رشوت لینے کی وجہ سے ان کے ضمیر نے انہیں ملامت کی ہوگئی چنانچہ اُنہوں نے یہ رقم لوٹا دی۔ ہم بڑے خوش ہو رہے تھے۔

فیصلہ کی تاریخ پر جج نے فیصلہ ہمارے خلاف سُنایا۔ بعد میں ہمیں کرایہ داروں سے معلوم ہوا کہ انہیں جب منشی نور الٰہی کی طرف سے رشوت دینے کا علم ہوا تو ہم نے سو آدمیوں سے فی کس ایک سو روپیہ کے حساب سے دس ہزار روپے اکٹھا کر کے جج صاحب کو دیئے۔

دادا جان کے انتقال کے فوراً بعد عدالتوں کے چکر کاٹنے میں میرے ساتھ میرے دادا کے سوتیلے بھائی منشی کرم الٰہی اور میری والدہ کے ماموں محمد حسین جو میرے دادا کی سگی بہن کے لڑکے تھے دونوں نے میری مدد کی۔ خدا کے فضل سے یہ ہوا کہ اکثر ہندو کرایہ دار معاہدے کے مطابق باقاعدگی سے کرایہ ادا کرتے رہے۔ اس سے فوری طور پر جو مالی تشویش ہمارے کنبہ کو لاحق تھی اس کے بادل فوراً چھٹ گئے۔ اس سے میں نے کمیونسٹ پارٹی کے لیے ایک کل وقتی کارکن کی حیثیت سے کام کرنے کا عزم کیا۔

میرے دادا جان نے طویل علالت کے بعد انتقال کیا تھا اس لیے ان کی طبیعت میں خاصا چڑچڑا پن آگیا تھا۔ مسلسل چھ برس فالج کا شکار رہے۔ مختلف وقتوں میں بدن کے مختلف حصے فالج سے متاثر ہوتے رہے انہوں نے بھی علاج کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دیسی یونانی طب' انگریزی اور ہیومیوپیتھک کوئی علاج نہ چھوڑا۔ طویل علالت کے دوران سب سے زیادہ خدمت سرانجام دینے والوں میں محمد صادق تھے کشمیری بازار میں پٹولیوں کا کام کرتے تھے یعنی نالے پراندے' بنانے کے لیے ان کا شمار اعلیٰ ہنرمندوں میں ہوتا تھا۔ یہ محمد صادق جو مولوی صادق کہلاتے تھے میرے دادا کے سگے بھتیجے تھے۔

دادا جان کی نماز جنازہ بیرون دہلی دروازہ کے باغ میں ادا کی گئی جس کی امامت مولانا داؤد غزنوی نے کی۔ اس جنازہ میں اہل حدیث کے علاوہ مولانا احمد علی اور ان کے اہل خانہ نے بھی شرکت کی ان کے علاوہ اہل محلہ' عبدالرحمٰن چغتائی عبداللہ چغتائی کے علاوہ خواجہ عبدالوحید' سید عبداللہ ایسی شخصیات نے حصہ لیا۔

دوسری عالمی جنگ کا نیا کردار

مارچ 1942ء تک عالمی جنگ کا نیا کردار ابھر کر سامنے آنے لگا۔ دسمبر1941ء میں جاپانیوں کے عالمی جنگ میں کودنے کے بعد ہندوستان میں برطانوی حکومت نے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے خلاف اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنا شروع کر دی۔

جاپانیوں نے شمالی ملایا پر حملہ کیا اور برطانیہ کو شکست دے دی تو 14 پنجاب رجمنٹ کی پہلی بٹالین کے کپتان موہن سنگھ اور دوسرے ہندوستانی اور برطانوی کرنل مع چند فوجیوں کے جاپانیوں کے ہاتھوں بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ملایا کے جنگلوں میں ان کو فرار کی کوئی راہ نہ ملی اور بالاخر انہوں نے اپنے آپ کو جاپانیوں کے حوالے کر دیا۔ ان ہندوستانی افسروں کو جاپانی کمانڈر فوجی ہارا Fuji Hara نے اس علاقہ کی آزاد ہند لیگ کے کرتا دھرتا گیانی پریتم سنگھ سے ملوایا۔ جنہوں نے ان فوجی افسروں پر آزاد ہند لیگ کے ساتھ مل کر آزادی ہند کے لیے کام کرنے کے واسطے خاصا دباؤ ڈالا۔ خاصی بحث و تمحیص کے بعد کپتان موہن سنگھ آزاد ہند لیگ کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ فروری 1942ء کو جب سنگاپور میں برطانوی فوجوں کو شکست

ہوئی تو کرنل ہنٹ (Hunt) نے ہتھیار ڈال دیئے اور چالیس ہزار ہندوستانی فوجیوں کو جاپانی کمانڈر فیوجی ہارا کے حوالے کر دیا اور فیوجی ہارا نے ان چالیس ہزار ہندوستانی فوجیوں کو کپتان موہن سنگھ کے سپرد کر دیا۔

اس موقع پر کپتان موہن سنگھ نے ان قیدیوں سے آزاد ہند فوج میں شامل ہونے کی اپیل کی تاکہ جاپانیوں کے شانہ بشانہ انگریزوں کے خلاف لڑا جائے اور اپنے وطن کو آزاد کرایا جا سکے۔ بہت سے فوجیوں نے شرکت پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ بہرحال کپتان موہن سنگھ کی کوششوں سے پچیس ہزار فوجیوں نے اس آزاد ہند فوج میں شریک ہونے پر رضامندی کا اظہار کر دیا اور اگست 1942ء تک چالیس ہزار فوجی قیدیوں نے آزاد ہند فوج میں شمولیت کے لیے اس فوج کے حلف نامے پر دستخط کر دیئے چنانچہ ان کی تربیت کے لیے کیمپ بھی کھولے گئے۔

22 جون 1941ء کو جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا۔ یہ حملہ ایک سوشلسٹ ملک پر حملہ تھا۔ یہ حملہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ایک رکن ہی نہیں بلکہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے روح رواں ملک پر حملہ تھا۔ اس وقت ہندوستانی کمیونسٹ رہنما دیولی میں نظربند تھے انہوں نے اپنے طور پر بحث و تمحیص کے بعد ایک Thesis تیار کیا۔ جب انڈر گراؤنڈ کام کرنے والے کمیونسٹ کارکنوں اور ان سے ہمدردی رکھنے والوں نے جنگ کی نئی اہمیت کو تسلیم کیا۔ لیکن عملاً پارٹی میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آئی۔ اس کا سب سے اہم ثبوت یہ تھا کہ ہندوستان کی وزارت داخلہ سنجیدگی سے اس امر کے متعلق دسمبر 1941ء تک یہ سوچتی رہی کہ برطانوی سفیر متعینہ ماسکو کے ذریعے سٹالن اور حکومت روس پہ دباؤ ڈالا جائے کہ وہ ہندوستانی کمیونسٹوں کو جنگ کی نئی صورتحال کے بارے میں واضح ہدایت دیں لیکن اس دوران پنجاب کے مشہور کرتی کمیونسٹ لیڈر اچھر سنگھ چھینہ جو کافی عرصہ سے روپوش تھے اور پولیس کو مطلوب تھے گرفتار ہو جاتے ہیں اور یہ گرفتاری ایسے موقعہ پر ہوئی جب وہ ہندوستان واپس آرہے تھے۔

چنانچہ پولیس جب ان سے پوچھ گچھ کرتی ہے تو وہ پولیس کو بتاتے ہیں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کا پیغام لے کر ہندوستان آ رہے تھے جس میں موجودہ جنگ میں برطانوی حکومت کو امداد کی ہدایات دی گئی تھیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس زمانے میں خفیہ پولیس کی ایک رپورٹ تیار کی گئی وزارت داخلہ کے اعلیٰ افسروں نے 10 جنوری 1942ء کو اس رپورٹ کے آخر میں کہا کہ کیمونسٹ پارٹی کے قائدین جو آزاد ہیں انہوں نے ظاہرہ طور پر جنگ میں امداد دینے کے متعلق اپنے رویئے کا کوئی اظہار نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے اپنی تخریب کارانہ سرگرمیوں سے دامن کشی ہی کی ہے۔ میاں افتخار الدین نے پٹنہ میں طلباء کی کانفرنس کی صدارت ضرور کی۔ افتخار الدین کے بارے میں پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ وہ ایک طرف پنجاب کانگرس کے صدر تھے تو ساتھ ہی پنجاب کی کیمونسٹ پارٹی کی عنان بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بارے میں خاص طور پر غور ہونا چاہیے۔ کیونکہ پٹنہ میں جب جنگ سے متعلق ریزولیشن پیش کرنے کی باری آئی تو میاں افتخار الدین نے تھوڑی دیر کے لیے جان بوجھ کر کرسی صدارت ہی چھوڑ دی اور ان کی غیر موجودگی میں جنگ میں غیر مشروط امداد کی قرارداد منظور ہوئی بلکہ کیمونسٹ قائدین پہلے کی طرح ہڑتالوں کے لیے فضا پیدا کر رہے ہیں۔

صحیح یہ ہے کہ چھ ماہ گزر جانے کے باوجود ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی برطانوی کیمونسٹ پارٹی کی مانند صحیح معنوں میں اپنی پالیسی کو نئے سانچے میں نہیں ڈھال سکی۔

اس کے ساتھ ہی حکومت ہند کے وزارت داخلہ کے سکریٹری R.TOTTENHAM کی طرف سے تمام صوبوں کے چیف سیکرٹریوں کو ایک خفیہ میمورنڈم بھیجا گیا۔ جس میں اہم شخصیتوں اور گروہوں کے بارے میں جو پہلے جنگ میں حصہ لینے کی مخالفت کرتے تھے اب ان کے رویے میں تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ ایسے نظربندوں کے بارے میں از سر نو غور کرنے کے مسئلے پر اپنی رائے سے آگاہ کرنے کو کہا گیا' اس دوران مرکزی حکومت کی طرف سے سیکورٹی نظربندوں کے معاملات پر نظرثانی کرنے والی کمیٹی نے سولہ کیمونسٹوں کی رہائی کی سفارش کی۔ ان میں سجاد ظہیر بھی شامل تھے۔

حکومت ہند کی وزارت داخلہ نے مرکزی نظرثانی بورڈ کی سفارشات اور کیمونسٹوں کے نام جن کی رہائی کے لیے بورڈ نے سفارش کی تھی۔ صوبائی حکومتوں کو ایک مراسلے میں لکھ بھیجے جس میں دریافت کیا گیا اگر ان کیمونسٹوں کو رہا کر دیئے جانے

کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر کمیونسٹ پارٹی پر پابندی جاری رکھنے کا کوئی جواز رہتا ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل جو پالیسی اور تنظیم دونوں سے متعلق تھے حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کو خاصے پریشان کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی پریشانی کو دور کرنے کے لیے حکومت ہند کی وزارت داخلہ کے سکریٹری MAXWELL R.M.H نے خفیہ پولیس کے محکمے کو ہدایت کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری پی سی جوشی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے تاکہ کمیونسٹ پارٹی کی اصل سوچ کا پتہ چل سکے۔

پی سی (پورن چند) جوشی

پی سی جوشی جو اس زمانے میں روپوش تھے کی ملاقات کا اہتمام جب حکومت ہند کی وزارت داخلہ اور خفیہ پولیس کے اعلیٰ افسروں سے ہوا تو اس سے پہلے کمیونسٹ پارٹی نے اپنی نئی پالیسی اور کام کے طریقہ کار کے بارے میں پارٹی مراسلوں سے اظہار کر دیا تھا۔ اور یہ مراسلے خفیہ پولیس کے پاس مئی 1942ء تک پہنچ چکے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی نے اپنی دستاویز میں کہا تھا "ہم اس جنگ کو عوامی جنگ تسلیم کرتے ہیں یہ ایک ایسی جنگ ہے جو عالمی آزادی کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ جس میں ہندوستانی عوام کو اپنے مفاد اور اپنی آزادی کے حصول کے لیے حصہ لینا چاہیے ہم اپنی پالیسی کو اپنے لٹریچر کے ذریعے مقبول بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنی اس پالیسی کو ان تمام قانونی سیاسی جماعتوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا ہے جن میں ہم سرگرم ہیں کل ہند طلبا کی تنظیم اور کل ہند کسان سبھا' مجالس عاملہ کو ہم اس پالیسی پر متفق کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن آل انڈیا ٹریڈ یونین کانفرنس کمیٹی جس کا اجلاس واردھا میں ہوا کو قائل کرنے میں ناکام رہے۔ جیسے جیسے فسطائی حملہ کے خطرات ہماری سرحدوں پر بڑھتے جا رہے ہیں ویسے ہی خاصے محبان وطن ہمارے ہم خیال ہوتے جا رہے ہیں اور قومی تحریک کے اچھے خاصے عناصر جنگ کے بارے میں ہمارے تجزیے سے متفق ہوتے جا رہے ہیں ہم پہلی سیاسی جماعت ہیں جس نے فاشسٹ حملہ آوروں کے خلاف ایک متحدہ مزاحمت کا نعرہ دیا ہے۔

ہم کانگرس کی قیادت اور عام محبان وطن کے اس نظریئے سے متفق ہیں کہ فاشسٹ

حملہ کے خلاف متحدہ اور موثر مزاحمت بغیر قومی حکومت کے نہ تو موثر ہو سکتی ہے اور نہ کامیاب۔ لیکن ہم کانگرس کے قائدین اور ان کے ہم خیال لوگوں کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ عوام موجودہ جنگی کوششوں میں تعاون نہ کریں کیونکہ ہم پر ایک بیرونی طاقت حکومت کر رہی ہے اور ہمیں قومی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نکتہ نظر خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ رویہ اپنے دفاع اور مزاحمت کو کمزور کرتا ہے اور فسطائی حملہ آوروں کی مدد کرتا ہے۔

ہم برطانوی حکومت کے اس نظریئے کے بھی مخالف ہیں کہ موجودہ جنگ صرف فوجی طاقت کے بل بوتے پر جیتی جا سکتی ہے اور ہندوستانی عوام کا صرف یہ فرض ہے کہ موجودہ حکومت کو جوں کا توں رہنے دیں۔

ہمارا یقین ہے کہ ہندوستان کے اپنے دفاع کی جنگ ایک ہی صورت میں موثر طور پر لڑی جا سکتی ہے کہ یہاں کی حکومت عوام کے معتمد نمائندوں کے ہاتھ میں ہو اور صحیح معنوں میں ایک قومی حکومت قائم ہو جس کو پوری قوم کا اعتماد حاصل ہو اور وہ اس جنگ کو ایک عوام کی جنگ کے طور پر لڑے۔

ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ حالات سخت نازک ہیں اور یہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ حالات کی اس نزاکت کا مداوا حکومت کے پاس ہے کہ آیا وہ ہمیں جاپانیوں کے خلاف عوام کو منظم کرنے کی سہولت دیتی ہے یا نہیں اور اس مقصد کے لیے ہم حکومت سے گفتگو کرنے کے لیے تیار ہیں حالانکہ اس حکومت کے خلاف ہمارے اندر شدید تلخی ہے۔ چنانچہ ہم نے حکومت کے سامنے اپنے چند مطالبات رکھے ہیں کیونکہ ان مطالبات کی تکمیل سے ہی ہم جاپانیوں کے خلاف موثر مزاحمت کر سکتے ہیں۔ جنگی کوششوں کو تیز کر سکتے ہیں اور عوام کی اس جنگ کے لیے تائید حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر حکومت ہمارے مطالبات تسلیم کرے تو جنگ میں بھرپور امداد کے لیے اپنا منصوبہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔

ہمارے مطالبات میں کمیونسٹوں نظربندوں کی غیر مشروط رہائی، تمام کمیونسٹ جن کے خلاف وارنٹ ہیں واپس لیے جائیں اور جن جن کمیونسٹوں کے خلاف کسی قسم کی پابندیاں ہیں وہ واپس لے لی جائیں اور تمام روپوش کمیونسٹوں کو کھلے عام کام کرنے کی

آزادی دی جائے۔ اس کے علاوہ پارٹی کے اخبارات نیشنل فرنٹ اور نیوایج پر سے پابندی ہٹائی جائے۔ اسی طرح کمیونسٹ پارٹی کے تمام صوبائی اخباروں پر سے بھی پابندی ہٹائی جائے اور نئے اخبارات اور رسائل کے لیے ڈیکلریشن دیئے جائیں۔

ہماری چوٹی کی تمام قیادت جیلوں میں بند ہے جو تھوڑے بہت بچے ہیں ان کو روپوش رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ان رکاوٹوں کی وجہ سے موجودہ بدلے ہوئے حالات میں ہم بالکل غیر موثر ہو گئے ہیں کوئی بھی سیاسی جماعت اپنی قیادت کے بعد نہ تو عوام تک اپنی پالیسی پہنچا سکتی ہے نہ ان کو منظم کر سکتی ہے۔ موجودہ خلاف قانون حالات میں پارٹی کا عوام کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے۔ جو لوگ باہر ہیں وہ اتنے نوجوان اور ناتجربہ کار ہیں کہ ان کے لیے پارٹی پالیسی کو عوام تک پہنچانا ناممکن ہے۔ ہماری نئی پالیسی کا دفاع کرنا اور ان کو عوام میں مقبول بنانا ایک کٹھن کام ہے۔ اس سے ہماری آزمودہ اور تجربہ کار قیادت ہی عہدہ برا ہو سکتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہماری موجودہ پالیسی اور ہمارے نظربند رفقا کے واضح اعلانوں کے باوجود حکومت یہ کہتی سنائی دیتی ہے کہ وہ تمام نظربندوں پر اعتماد نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے لیے کیمونسٹوں اور ففتھ کالمسٹوں میں تمیز کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ ہم تمام کیمونسٹ قیدیوں اور نظربندوں کی فہرست دینے کو تیار ہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ یہ سو فیصد فاشسٹ دشمن ہیں۔ اگر حکومت ہمارا تعاون چاہتی ہے تو اسے ہماری فہرست پر یقین کرنا ہو گا کیونکہ ہم حکومت سے زیادہ ففتھ کالمسٹوں کو ختم کرنے کے خواہشمند ہیں۔

ہمارے رہا شدہ رفقا پورے ملک کا دورہ کریں گے جلسے کریں گے جلوس نکالیں گے اور لوگوں کو اس جنگ کی اہمیت بتائیں گے ہم جنگ میں تعاون کرنے کے لیے ڈرامے اور ناٹک کریں گے اور اس طرح سے لوگوں کی حب الوطنی جگا سکیں گے۔ حکومت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے بعد صرف ہماری جماعت ہے جو ملک گیر پیمانے پر سیاسی کام جاری رکھ سکتی ہے اور لوگوں کو متحرک کر سکتی ہے۔

ہم جلد سے جلد گوریلا جنگ کے لیے اپنے کارکنوں کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے گوریلے جو اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر دشمن کی صفوں کے پیچھے جا کر حملہ کے لیے تیار ہوں گے۔ یہ کفن بردوش فوجی دستے کہلائیں گے۔

یہ ہمارے اپنے جیالے رفقا یعنی مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہوں گے۔ ہم جیالا کارکن اس کو کہتے ہیں جو ہماری تحریکوں مثلاً مزدوروں کی ہڑتال ہو کسانوں کا مورچہ ہو اس میں شریک ہو کر انہوں نے سیاسی شعور اور تجربہ حاصل کیا ہو۔ یہ کارکن عام طور پر پڑھے لکھے ہوتے ہیں یہ عوام سے گفتگو کر سکتے ہیں ان کو قائل کر سکتے ہیں یہ دستے رضاکارانہ طور پر مشکل سے مشکل کام کرنے کے لیے تیار ہوں گے ہم چاہیں گے کہ ان کو مختصر سی فوجی تربیت دے کر میدان جنگ میں بھیج دیا جائے۔ حکومت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ صوبہ بنگال جو جاپانی حملے کی زد میں ہے وہاں پر ہمارا غیر معمولی اثر و رسوخ ہے۔ وہاں کے کسان مزدور اور طلبا سبھی ہماری بات دھیان سے سنتے ہیں فارورڈ بلاک کے بعد دوسرے درجے پر یہی ہماری جماعت ہے جو عوام میں مقبول ہے۔

یہ دستاویز 23 اپریل 1942ء کو حکومت کو پہنچی اور اس کے بعد حکومت ہند کی وزارت داخلہ کی طرف سے پی سی جوشی کے ساتھ سلسلہ ملاقات شروع ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے جی احمد نے جو وزارت داخلہ کے محکمہ خفیہ پولیس میں غالباً ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ پی سی جوشی سے ملاقات کی انہوں نے اس ملاقات کی روداد اپنے افسران بالا کو بھیجی کہ سہ پہر پی سی جوشی کے ساتھ میری چار گھنٹے گفتگو ہوئی۔ جوشی پست قد' طالب علموں کی طرح بغیر داڑھی مونچھ چشمہ لگائے ہوئے نہایت باتونی' الفاظ پر زور دے کر تیز تیز بولنے والا نوجوان ہے۔ تیز بولنے کی وجہ سے اس کی باتیں کبھی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ مجموعی طور پر وہ خوش مزاج ہے لیکن جوش اور کیف سے عاری ہے۔ میں نے اسے اس کی مرضی کے مطابق خوب باتیں کرنے دیں کہ اس سے فوراً ہی مجھ پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ وہ اپنے نئے خیالات و نظریات کے اظہار کے لیے بے تاب ہے چنانچہ اس بارے میں وہ بات کرتے وقت بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

اپنے نئے افکار کی تبلیغ کے لیے وہ بے چین تھا اس کی گفتگو سے اس کے دو تین رویے نمایاں ہو رہے تھے اور وہ ان کا بار بار اظہار کر رہا تھا۔ مثلاً سب سے شدید رویہ تو جرمنی اور اٹلی اور خاص طور سے جاپان سے سخت نفرت کا تھا۔ ان طاقتوں کے خلاف ہر ممکن طریقے سے جنگ کرنے کی خواہش بہت نمایاں تھی۔ مزید براں مزدوروں میں

کمیونسٹ افکار پھیلانے اور ان کو منظم کرنے کا عزم اور دعوے پر اس کا اصرار تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ گفتگو کا رخ کمیونسٹ حکمت عملی کی یادداشت اور کام کے منصوبے کی طرف موڑ دیا یہ یادداشت ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے میں نے اس سے پوچھا کہ آیا اسے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے تمام اختیارات حاصل ہیں۔

اس نے کہا "ہاں ہیں اور دستاویزات دستخط کرنے کے لیے دی تھیں۔" پارٹی کی صوابدید پر میری بھی ایسی ہی خواہش ہے۔ جیل میں پارٹی رہنماؤں نے اس یادداشت کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی لیکن میں اس بارے میں ان کے تمام خیالات سے آگاہ ہوں اور ان کی طرف سے یادداشت کو مکمل طور پر تسلیم کرنے کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں۔

اسے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جیسے ہی رہنماؤں سے ملاقات ہو گی وہ یادداشت کی تصدیق کر دیں گے اور اس موضوع پر "عام اعلان جاری" کریں گے۔ ہماری اطلاع کے مطابق یادداشت کی کچھ نقول پارٹی لیڈروں کو جیل میں بھیج دی گئیں ہیں اس نے بعد میں کہا کہ اگر ضروری ہوا تو لیڈروں سے ہنگامی طور پر دستخط کرائے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اسے آزادی کی جانب Forword To The Freedom نامی پمفلٹ میں سے متعلقہ عبارتوں کی طرف لے آیا۔ جس میں سپاہیوں سے منسوب شکوے 'اے آر پی' سول ڈیفنس اور سول گارڈ کی تنظیم کا ذکر تھا اور جنگی چندہ کی وصولی کے سلسلے میں جبر کی شکایتیں تھیں اور ساتھ مزدوروں کے مطالبات تھے۔

میں نے سوال کیا یہ پمفلٹ اور یادداشت جو ہمارے سامنے ہے اس میں تضاد نہیں ہے؟ اس کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے کہا کہ طبع شدہ مواد "آزادی کی جانب" جسے راج گوپال اچاریہ کی منظوری مل گئی ہے ایک سیاسی دستاویز ہے جو حریت پسندوں کے مفاد میں لکھی گئی یہ یادداشت جنگی نقطہ نگاہ سے ترتیب نہیں دی گئی بلکہ عام فہم زبان میں پارٹی کی سیاسی دستاویز ہے۔ نہ اس کے ذہن میں تھا اور نہ وہ اس کو تسلیم کرنے کو تیار تھا کہ جو نظریئے اس کتابچے میں بیان کئے گئے ہیں وہ یادداشت کے بیانات سے متصادم ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا یادداشت کتابچے کی جگہ لے لے گی؟ اس نے کہا "نہیں" لیکن جب میں نے تجویز پیش کی کہ ہو سکتا ہے یہ کتابچہ اس کے نظریات

میں بہتری لانے میں کسی مرحلے پر راہنمائی کرے تو اس نے اس کا بڑی بے دلی میں اثبات میں جواب دیا۔ اس نے اس امر پر بار بار اصرار کیا کہ جاپان کے خلاف جنگ جیتنا بہت ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ تم ہمیں لفظوں سے نہیں بلکہ ہمارے عمل سے پرکھ سکتے ہو۔ ہمارے اعمال تمہارے سامنے ہوں گے اس نے مزید اس امر پر بھی اصرار کیا کہ اگر حکومت کو پارٹی کے منصوبے کے کسی حصے پر اعتراض ہو تو وہ اس کو ترک کرنے کے لیے تیار ہے مثلاً اگر پارٹی ممبروں کی مسلح افواج میں بھرتی پر اعتراض ہے تو پارٹی ان اراکین کو فوج سے واپس بلا لے گی لیکن یہ اس صورت میں ہو گا کہ اگر یہ ایسا کرنا چاہیں گے۔

وہ پارٹی کے صحیح اعتماد پر اعتراضات سے بڑا رنجیدہ ہو رہا تھا لیکن اس نے تکرار سے کہا کہ بندوقیں جاپان کے خلاف لڑ رہی ہیں وہ وہیں ہیں جہاں ہم چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس نے دکھ کے ساتھ متعدد بار کہا کہ "قابض فوج" آزادی کی فوج بنتی جا رہی ہے۔ مقبوضہ علاقوں میں صورتحال کی جاسوسی کے بارے میں اس کے خیالات اگر پختہ ہوتے تو خاصے دلچسپ تھے۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ پارٹی راہنماؤں نے معاملے کو قابل غور گردانا ہے اور ان پر سوچ بچار کیا ہے اور بہتر نتائج کے منتظر ہیں۔ اسے پارٹی کی منظور شدہ مزدور انجمنوں کو مہیا کئے گئے ثابت قدم مزدوروں کے سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی کی اہلیت پر بھروسہ تھا۔ مزدور راہنماؤں کو اجازت دی گئی کہ وہ مزدور کمشنروں کی نگرانی میں کام کریں۔ اسے کئی جگہ طلب کیا گیا مثلاً بمبئی کی جنگی پیداوار کی فیکٹری کی ہڑتال کے تازہ واقعات میں!

جہاں فوری نتیجے کے حصول کے لیے ہڑتالیں رکوانے کے سلسلے میں کمیونسٹوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ اپریل کے آخر میں ہونے والی جی' آئی' پی پی ریل ورکشاپ میں ہونے والی ہڑتال کی طرف اشارہ تھا۔ جب مزدور انجمن کے راہنماؤں نے ہڑتال کی راہنمائی کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کارکنوں کی مانگیں بلاوجہ ہیں اس لیے کہا کہ جنگی پیداوار میں تیزی آنا کمیونسٹوں کا اولین مقصد ہے اگرچہ کمیونسٹ ٹی' سی' یو کی زیادہ تنخواہیں مہنگائی الاؤنس اور ہڑتال کے حق میں تخفیف وغیرہ کی مانگوں میں ان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ وہ ان مانگوں پر خوش نہیں تھے اور جنگی ضروریات

کے تحت اسے ثانوی حیثیت دیتے تھے۔

بعد میں جب میں نے یہ معلوم کیا کہ حکومت پر کمیونسٹوں کی تنقید کی حدود کیا ہیں اور ان کی جنگی کوششیں کیا ہوں گی؟ اس نے کہا کہ پارٹی کو حکومت پر آزادی کے ساتھ تنقید کرنے اور جنگی کوششوں میں کوتاہی کو اجاگر کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن ایسی تنقید ایمانداری کے ساتھ ہونی چاہیے اور وسیع اور تعمیری ہونی چاہیے۔ میں نے وضاحت کی کہ دشنام طرازی اور بے قابو تنقید کے نتیجے میں تو کمیونسٹ ادیبوں اور مقرروں کو کسی قانونی کارروائی کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا وہ اس نقطہ پر تو آتا دکھائی دیا لیکن وہ اپنے مفاہیم سے کوئی خاص پریشان نہیں ہوا۔

لگتا تھا پی سی جوشی یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر سے پابندی نہیں اٹھائی جا رہی ہے۔ اس نے "نیشنل فرنٹ" اور "نیو ایج" کی بحالی کے متعلق پوچھا۔ ان کی اشاعت فی الحال قانون "دفاع ہندوستان" 41 بی کے تحت ممنوع ہے۔ اس نے کہا کہ جیسے ہی یہ جریدے بحال ہوں گے "کمیونسٹ' پارٹی لیٹرز' اور پارٹی تنظیم" جیسی "غیر قانونی" تحریریں ختم ہو جائیں گی۔ دہلی اور بمبئی پارٹی کی نشرو اشاعت کے مراکز تھے۔ اس نے سب سے پہلے کمیونسٹ نظربندوں کو عام آزادی دینے کا مطالبہ کیا لیکن بعد میں اس نے کہا کہ وہ پچاس کمیونسٹوں کی فہرست مہیا کرے گا اور ان کی رہائی کے لیے کہے گا جو پارٹی کے جنگ کے حالیہ منصوبے کو فوری طور پر عمل میں لائیں گے۔ اس نے اگلے روز مجھے ملنے اور فہرست دکھانے کا وعدہ کیا۔ کیونکہ وہ اس بات پر بڑا متوحش تھا کہ ہر کام بڑی سستی سے ہو رہا ہے اس لیے پارٹی کا جنگ کی حمایت میں مستقبل قریب میں کام شروع کرنے کا وقت ضائع نہیں ہونا چاہیے میں نے اسے اس کی تجاویز پر اپنے ممکنہ ردعمل کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔

اس گفتگو کے نتیجے میں حکمرانوں کا یہ تاثر میرے ذہن میں مرجھا گیا کہ جوشی اور اس کے دوست یا ان میں سے ایسے جن سے وہ رابطہ کر سکتا ہے دل سے جنگ کے حامی ہیں۔ جرمنی اور اٹلی کے خلاف ہیں۔ اور جنگ میں مدد دینے کی اپنی نمایاں دلی خواہش کو عملی طور پر ظاہر کرنے کے لیے تیار ہیں۔

میں نے اپنی رپورٹ وزارت داخلہ کے سیکرٹری مسٹر میکسویل کو بھیج دی۔

چنانچہ اس رپورٹ کے بعد وزارت داخلہ کے سیکرٹری نے پی سی جوشی سے خود ملاقات کی اور اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا!

"کچھ ہی مدت پہلے کیمونسٹ برطانوی سامراج کو اندرون ملک دشمن کی حمایت سمیت ہر طریقے سے تباہ کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ خاص طور پر روس کے جنگ میں کودنے سے پہلے کیمونسٹوں کا نظریہ یہ تھا کہ برطانیہ اور اٹلی و جرمنی زیادہ تر ایک ہی طرح کی حکومت چاہتے ہیں لیکن سوویت روس کا نظام ان سے مختلف ہے۔ لیکن جب روس نمایاں طور پر جنگ میں اتر آیا اور اس کا برطانیہ وغیرہ سے متحدہ محاذ قائم ہو گیا تو جنگ کے کردار میں واضح تبدیلی رونما ہو گئی اور اب اتحادیوں کی جنگ دنیا کی آزادی اور خود مختاری کی جنگ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

جب میں نے پی سی جوشی سے اس ظاہری مقصد کے لیے کام کرنے والی دوسری جماعتوں کے ساتھ کیمونسٹ پارٹی کے ممکنہ تعلقات کے بارے میں پوچھا کہ آیا اس میدان میں کیمونسٹ پارٹی کے ظاہر ہونے سے محض رقابت شروع نہیں ہو جائے گی۔ اس سے حقیقت میں جنگی پیداوار میں مزاحمت پیدا ہوگی۔

پی سی جوشی نے دعویٰ کیا کہ کیمونسٹ پارٹی طویل عرصہ زیر زمین رہنے کے باوجود ٹریڈ یونین کانگرس میں زیادہ اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ اس نے کل ہند طلباء فیڈریشن اور کسان تحریک پر بھی دسترس کا دعویٰ کیا۔ میرے پاس قدرے تفصیل کے ساتھ دیگر معاملات میں جانے کے لیے وقت نہ تھا۔

پنجاب کمیونسٹ پارٹی

ہندوستان کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری پورن چند جوشی کی حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کے اعلیٰ افسران سے خفیہ ملاقاتوں اور افسران بالا کے تاثرات ثابت کرتے ہیں کہ فاشزم کے خلاف جدوجہد میں کیمونسٹ پارٹی سنجیدہ ہے۔ چنانچہ جنگی تیاریوں War Efforts میں کیمونسٹوں کی مدد کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے حکومت کی ریویونگ کمیٹی نے سولہ صف اول کے رہنماؤں کو رہا کر دیا جنہیں Security prisoners کے طور پر قید کیا گیا پھر بھی کمیٹی نے تمام کیمونسٹوں کو رہا کر دینا

ناقرین مصلحت گردانا اور تجویز کیا کہ ہر دفعہ کی رہائی کے عملی نتائج کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کمیونسٹوں کو رہا کیا جائے۔

اس فیصلے پر عمل کرتے ہوئے حکومت پنجاب نے مئی 1942 کو صوبے کے آٹھ معروف کمیونسٹوں کو رہا کرنے کا حکم جاری کیا۔ پنجاب کے چیف سکریڑی مسٹر بورن نے صوبے کے تمام ڈپٹی کمشنروں کو لکھا کہ اگر کمیونسٹوں کی خفیہ سرگرمیاں امن عامہ اور جنگ کے لیے خطرہ بنیں تو انہیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کرنے اور قید کر لینے میں ہچکچاہٹ کا قطعاً مظاہرہ نہ کیا جائے اور 23 جولائی 1942 کو کمیونسٹ پارٹی پر عائد کی گئی پابندی ہٹا دی گئی۔

جون 1942 میں پی سی جوشی نے پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کو دوبارہ سے منظم کرنے کے لیے لاہور کا دورہ کیا اور ایک صوبائی کمیٹی تشکیل دی جس کا صدر دفتر میکلوڈ روڈ پر قائم کیا گیا۔

میکلوڈ روڈ پر یہ عمارت لیڈی سر فضل حسین کے نام پر تعمیر ہوئی تھی اور کچھ عرصہ بعد کمیونسٹ سٹوڈنٹ یہاں کرایہ پر رہنے لگے۔ جس سے یہ ایک طرح سے خفیہ کمیونسٹوں کا مرکز بن گیا۔ پہلی بار مجھے اندر موہن یہاں لے گئے اور یہاں پر ہی اندر کمار گجرال سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

جب دیولی کیمپ سے کمیونسٹوں اور کرتیوں کی رہائی شروع ہوئی تو ان کا پہلا پڑاؤ یہاں ہی ہوتا تھا۔ اس لیے پی سی جوشی نے پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کی نئی تنظیم سازی کے لیے بھی اسی مقام کو منتخب کیا اور یہاں ہی "قومی جنگ" کے حق میں تحریک کا آغاز کیا۔

"جنگ آزادی" کے نام سے جب لاہور سے ایک رسالہ جاری ہوا تو اس کے ایڈیٹر فیروز دین منصور منتخب ہوئے اور انہوں نے اسسٹنٹ کے طور پر میرا نام تجویز کیا۔ چنانچہ میں اس رسالے کا معاون ایڈیٹر بن گیا اس طرح سے میں نے کمیونسٹ پارٹی کے ایک کل وقتی کارکن کے طور پر دفتر میں پارٹی کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔

کمیونسٹ پارٹی پر پابندی اٹھنے کے بعد پریت نگر (امرتسر) بھی کمیونسٹوں کا گڑھ بن گیا۔ پنجابی کا ادبی پرچہ "پریت لڑی" جس کے ایڈیٹر گوربخش سنگھ تھے ان کے بیٹے

نوتیج سنگھ جو کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ ان کی وجہ سے پریت لڑی ترقی پسند تحریک کا نمائندہ بن گیا "جنگ آزادی کے اردو ایڈیشن کے علاوہ پنجابی گورمکھی رسم الخط میں شائع ہونے لگا۔ ہفت روزہ رسالے کے ایڈیٹر ارجن سنگھ گرگج اور جگجیت سنگھ آنند تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بن جانے کے بعد میں ہر دن پارٹی کے نزدیک سے نزدیک ہوتا گیا۔ اب طبیعت میں ایک خاص قسم کا متشدانہ رویہ پیدا ہو گیا۔ ظلم سے سخت نفرت کا جذبہ میرے اندر جواں ہونے لگا۔ فاشسٹوں کے خلاف جنگ کے سوال پر میری مٹھیاں بھنچ اور رگیں پھول جاتیں اور میں اپنے اندر اتنی طاقت محسوس کرنے لگا کہ اچھے خاصے مضبوط انسان کو بھی اٹھا کر دیوار سے مار سکتا تھا۔ اس سے پہلے زندگی میں جتنی فرار کی راہیں تلاش کر سکتا تھا کیں لیکن اب مجھے اپنی زندگی کا نیا راستہ مل گیا تھا۔ میں نے اس پر پوری تندہی اور ایمانداری سے چلنے کا فیصلہ کیا اور زندگی کے لیے ایک ہی مقدس فرض اپنایا کہ صرف پارٹی کے لیے کام کرو اور اس جدوجہد میں "سرخ جھنڈے" تلے اپنی جان دے دو۔

اس طرح دس جون سے میں نے "جنگ آزادی" کے دفتر میں کام شروع کر دیا۔

پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر 114 میکلوڈ روڈ پر دو منزلہ لیڈی فضل حسین بلڈنگ میں واقع تھا۔ نچلی منزل میں دفاتر اور اوپر کی منزل کے کمروں میں باورچی خانہ اور ساتھ کھانا کھانے اور چائے پینے کا معقول انتظام تھا جہاں بعض لیڈروں کی بیویاں بھی کبھی کبھار عارضی رہائش رکھتیں اور باورچی خانہ میں ہاتھ بٹاتیں۔

بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پارٹی کا استقبالیہ کمرہ تھا جس کے مدارالمہام دیس راج چڈھا تھے۔ پارٹی کا تمام حساب کتاب ڈاک کی وصولی اور پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور دوسرے تمام راہنماؤں اور کارکنوں کی تمام سرگرمیوں کا ان کے پاس باقاعدہ ریکارڈ ہوتا تھا۔ اس لیے ہر فرد کا بلڈنگ میں داخل ہوتے ہی دیس راج چڈھا سے ضرور واسطہ پڑتا۔

اس مرکزی دفتر کے سامنے ایک بڑے کمرے میں ٹریڈ یونین کا دفتر تھا جس کے انچارج فضل الٰہی قربان اور کامریڈ دت تھے۔ اس بڑے کمرے کے پیچھے آمنے سامنے دو کمرے تھے جن میں ایک میں پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور دوسرے میں کسان کمیٹی کے

انچارج اچھر سنگھ چھینہ اور جگجیت سنگھ جو کسان محاذ کے انچارج تھے اکٹھے بیٹھتے تھے۔ جبکہ کونے والا کمرہ اردو اور پنجابی (گورمکھی) ہفت روزہ پارٹی کے اخبار "جنگ آزادی" کے لیے مختص تھا۔

اس کمرہ میں "جنگ آزادی" اردو کے ایڈیٹر فیروزالدین منصور اور میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر جبکہ "جنگ آزادی" کے پنجابی (گورمکھی) کے ایڈیٹر ارجن سنگھ گڑگج اور اسسٹنٹ ایڈیٹر جگجیت سنگھ آنند بیٹھتے تھے۔ ہمارے دونوں کے درمیان دیوار کے ساتھ لکڑی کے تخت پر کاتب بیٹھتا تھا۔

میں نے جون 1942ء سے یہاں کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن کی حیثیت سے اپنا کام شروع کیا تھا۔ میرے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ اور مشاہدہ تھا کیونکہ یہاں مختلف مذاہب ہندو سکھ اور مسلمان سب مل کر پارٹی کے لیے کام کر رہے تھے اُن کا تعلق مختلف مذاہب سے تھا لیکن نظریاتی طور پر پارٹی کے لیے وہ سب ایک تھے نہ ہندو نہ مسلمان نہ سکھ نہ عیسائی۔ سب کمیونسٹ تھے۔ میرے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا۔ یہاں پر پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ ان کی بیویوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں جو یہاں آکر ٹھہرتیں اور پارٹی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتیں۔

دفتر میں دن بھر آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ان میں مقامی کالجوں کے طلبا ہی نہیں طالبات بھی تھیں جن میں پیرن بھروچا' سوریا ملہوترا' کٹی بھروچا' خدیجہ منہاس جو بعد میں خدیجہ عمر ہوئیں اور پھر شہلا بھاٹیہ۔ دن بھر بحث و مباحثہ چلتا رہتا۔ ان آزاد اور روشن خیال لوگوں میں رہ کے میرے دل میں بے پناہ کشادگی اور وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ لیکن میرا خاندانی پس منظر مجھے عجیب طرح کے احساسات اور کیفیات سے دو چار کرنے پر مجبور تھا۔ ان نفسیاتی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے میں روزنامچہ قلم بند کرنے لگا۔

نیا ماحول مجھ پر دو طرح سے اثر انداز ہوا ایک یہ کہ اس ماحول میں مذہب کو ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ دوسرا اس ماحول میں شادی شدہ عورتوں کے علاوہ کنواری لڑکیوں کے ساتھ مل کر پارٹی کے کام کاج کے ساتھ ساتھ بے تکلف گفتگو' بحث و مباحثہ ہنسی ٹھٹھا سب چلتا تھا۔

ان دنوں میں اپنے ہم عصروں میں جن کا سیاسیات میں عمل دخل تھا نمایاں طور پر سامنے آیا۔ میرے مسلمان ہم عصروں کے میرے خلاف حسد جلن کے جذبات بھی ابھرے اور رشک کے بھی کیونکہ متعدد مسلمان نوجوانوں میں کمیونسٹ پارٹی ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جسے خدا کا منکر تصور کیا جاتا۔ یہ سب سیاسی پراپیگنڈہ تھا۔ لیکن میں نے اس کی پرواہ نہیں کی اس پر میری دلیری اور جرات کی میرے ہم عصروں نے دل کھول کر داد بھی دی کیونکہ ایسے مسلمان نوجوان کا جس کا تعلق متشدد مذہبی گھرانے سے ہو یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔

لاہور میں پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ "جنگ آزادی" کا میں پرنٹر پبلشر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ جبکہ فیروزالدین منصور ایڈیٹر تھے۔ فکر انگیز مضامین اداریئے پمفلٹ اور کتابچے لکھ کر پارٹی کے اصل مقاصد کو بڑے احسن طریقے سے عوام تک پہنچانے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن

8 جون 1942ء سے میں نے پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں باقاعدہ کل وقتی کارکن کی حیثیت سے کام شروع کیا اس سے پہلے میں کمیونسٹ پارٹی کا خفیہ پیغام رساں تھا۔ بلکہ مئی 1942ء میں ایف سی کالج لاہور میں لگنے والے خفیہ کیمپ سے ابتدائی فوجی تربیت حاصل کی تھی۔ یہ خفیہ کیمپ آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کی پنجاب شاخ اور لاہور سٹوڈنٹ یونین کی طرف سے لگایا گیا تھا۔ جس میں آٹھ دس دن گوریلا جنگ میں شمولیت کے لیے ابتدائی فوجی تربیت دی گئی تھی۔ اس کیمپ میں پنجاب کے مختلف اضلاع سے پانچ پانچ دس دس کی تعداد میں کارکنوں نے شمولیت کی۔ اس کیمپ کے انچارج راج ہنس کرشن تھے۔ اس تربیتی کیمپ میں پی ٹی کی مشقوں کے علاوہ دیولی اور دوسری جگہوں سے رہائی پانے والے کمیونسٹ رہنماؤں نے جنگ کی نئی صورتحال پر لیکچر دیئے۔ لیکچر دینے والوں میں خاص طور پر پی پی ایل بیدی اور ان کی اہلیہ فریدہ بیدی' سوہن سنگھ جوش' اچھر سنگھ چھینہ' تیجا سنگھ سوتنتر اور فضل الٰہی قربان پیش پیش تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بننے کا مطلب تھا ایک نئی زندگی کی شروعات

جس میں ہر وقت سیاست، ہر لمحے عمل، جدوجہد اور پارٹی کے مقصد کی ترجمانی۔ اس طرح میرے شب و روز میرے پارٹی کے کاموں کے لیے وقف ہو گئے۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے جب حکومت نے پابندی اٹھائی اور کمیونسٹ پارٹی نے بحیثیت ایک قومی سیاسی جماعت کے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو کمیونسٹ پارٹی کا مرکزی دفتر علاقہ کھیت والی بمبئی میں قائم کر کے پارٹی کا ترجمان ہفت روزہ اخبار تین زبانوں میں شائع کرنا شروع کیا۔ انگریزی میں پیپلزوار (People's War) اردو میں "قومی جنگ" اور ہندی میں "جن یدھ"۔

مرکزی اخبارات کے ساتھ ساتھ ہر صوبہ سے صوبائی زبانوں میں بھی اخبارات شائع کرنا شروع کئے۔ انگریزی "پیپلزوار" اور اردو "قومی جنگ" کے ایڈیٹر پی سی جوشی تھے جو پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے دفتر سے شائع ہونے والا اردو اور پنجابی ہفت روزہ اخبار "جنگ آزادی" تھا۔ ہفتہ میں دو دن جب بمبئی سے اردو اخبار قومی جنگ اور پیپلزوار آتے تو ہم سب اخبارات کو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں لے کر نکلتے اور سارے شہر میں پھیل جاتے۔ ہم بازاروں بارونق گلی محلوں میں اخبارات کی سرخیاں بلند آواز میں پڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے جب لوگ ہمارے گرد جمع ہو جاتے تو ہم کھڑے ہو کر بعض خبروں کو انہیں پڑھ کر سناتے تاکہ وہ اخبار خرید لیں۔ ان اخباروں کے ساتھ ساتھ ہم کمیونسٹ پارٹی کی اپنی پالیسیوں اور کانگرس اور مسلم لیگ جو اس سیاسی فضا میں ایک دوسرے کے مخالف سمت چل رہی تھیں انہیں قومی مفاد کے لیے اتحاد پر آمادہ کرنے کے لیے تقریریں بھی کرتے تھے۔

شام کو جب سب لوگ دفتر میں اکٹھے ہوتے تو ہم سب آپس میں مل بیٹھ کر اپنے مشن کے متعلق گفتگو کرتے۔ جس ٹولی نے سب سے زیادہ اخبار فروخت کئے ہوتے انہیں بے پناہ داد دی جاتی۔ سب کی محنت کا یہی ایک صلہ تھا جو انہیں بڑا حوصلہ دیتا۔ تاکہ دوسرے دن اس سے بھی زیادہ عزم اور حوصلہ سے پارٹی کے لیے کام کریں۔

اس اہم سیاسی دور میں کمیونسٹ پارٹی ہی غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت تھی جو کانگرس کی حلیف پارٹی ہونے کے باوجود مسلم لیگ کی مسلمانوں کے حق میں خود اختیاری

کو تسلیم کرتی تھی۔
اس لیے میں اپنے ہم عصروں میں بالخصوص لاہور کے مسلم عوام اور سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والوں میں خاصہ مقبول ہوگیا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کی مسلمانوں میں مقبولیت بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور یہ سیاسی جماعت جسے پہلے نوابوں' جاگیرداروں اور ٹوڈیوں کی نمائندہ جماعت کہا جاتا تھا یکدم عوامی سیاسی کردار ادا کرنے لگی۔ جہاں تک سیاسی عمل کو آگے بڑھانے کا تعلق ہے تو طالب علم جماعتوں میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جس کے روح رواں اس دور کے مختلف کالجوں کے مسلم طلباء پیش پیش رہے۔

مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور میں حق خودارادیت پر زور دیا گیا تھا۔ اس میں بڑی حد تک شدت آگئی تھی۔ ہندوستان میں "حق خودارادیت" پر کمیونسٹ پارٹی کا موقف بڑا جاندار تھا۔

کمیونسٹوں کا قومیت کا تصور

کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "قومی جنگ" نے اپنے پہلے شمارے 5 جولائی 1942ء میں ہی اپنی سیاسی پارٹی کے بارے میں کھل کر کہہ دیا تھا:۔
"کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا برصغیر کی پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے ہندوستان کو کثیرالاقوام ملک تسلیم کیا اور برملا کہا کہ اس خطے میں بسنے والی ہر قوم کا حق خودارادیت ہی نہیں بلکہ حق علیحدگی بھی تسلیم کیا جائے گا۔ کمیونسٹوں نے کانگرسیوں کو بھی اس عمل پر قائل کرنے کی پوری پوری کوشش کی کہ اگر ان اقوام کے حقوق کو تسلیم کرلیں گے تو پھر علیحدگی کے امکان کم ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ علیحدگی پر اصرار ہی اس لیے ہو رہا ہے کہ کانگرس اس حق کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہی ہے اور جیسے جیسے کانگرس گریز کرتی چلی جاتی ہے ویسے ویسے ہی مسلم لیگ علیحدگی پر زیادہ مصر ہوتی چلی جا رہی ہے۔
کمیونسٹوں کے نزدیک قوم کی تعریف وہی تھی جو سٹالن نے کی تھی' "قوم عبارت ہے زبان' علاقیت' معیشت اور نفسیاتی انداز فکر کی اس مضبوط وحدت سے جو تاریخی عوامل کے نتیجے میں ابھری ہو اور جن کا ظہور ایک ثقافتی وحدت کی صورت میں ہو۔"

کمیونسٹوں نے موجودہ جنگ کو "قومی جنگ" یعنی عوام کی جنگ قرار دیا لیکن کانگرس اس بات کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا سامراج ہمارے سروں پر سوار ہے۔ اس لیے اس جنگ کو عوامی جنگ نہیں کہا جا سکتا لیکن کمیونسٹوں کا موقف تھا کہ سب سے پہلا مسئلہ وطن کی حفاظت کا ہے۔ جسے انہوں نے اپنی نئی پالیسی میں واضح کر دیا تھا کہ بے شک ہمارے ملک میں غیر حکومت بدستور قائم ہے۔ حکومت فوج اور عوام کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے۔ اس وقت ایک ہی قوت ایک ہی سہارا ہماری پشت پناہی کے لیے رہ جاتا ہے وہ ہے ہمارے اتحاد کی قوت اور حب الوطنی کا جذبہ' ملک کی ہر سیاسی جماعت اور گروہ متحدہ ہو کر فاشسٹ حملہ آوروں کے سامنے ایک لوہے کی دیوار بن جائیں۔ ہمارے نزدیک اس زبردست قومی اتحاد کی بنیاد کانگرس اور لیگ کا اتحاد ہے۔ یہی دو ادارے ہیں جن پہ آج ہمارے ملک کی اکثریت کا اعتماد ہے۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سیاسی تضاد کا ایک رخ مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی "قرردادلاہور" تھی۔"

مسلم لیگ نے 23 مارچ کو ملک بھر میں "یوم پاکستان" کے طور پر منایا اس موقعہ پر انہوں نے اپنے مختلف جلسوں میں اس امر کی وضاحت کی کہ مسلم لیگ ہندوستان میں کسی مشترکہ حکومت میں شرکت کے لیے تیار نہیں مسلمانوں کے ہندوؤں سے راستے الگ ہیں اور منزلیں جدا ہیں۔ چنانچہ قائداعظم مسلمانوں کو کانگرس کی تمام سیاسی تحریکوں سے الگ رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ دسمبر 1941ء میں لکھنؤ میں پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت مسلم لیگ کے سیکرٹری لیاقت علی خان نے کی۔ پاکستان کا مفہوم یہ بتایا کہ "ہندوستان کو دو ایسے خود مختار اور آزاد حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ جہاں ہندو اور مسلمان اپنے اپنے ملک پر آزادانہ حکومت کریں۔" اس کے خلاف بنگال میں مولوی فضل حق اور پنجاب میں سر سکندر حیات کے ردعمل سے کانگرس نے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ جس سے ہندوستان میں مزید سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت دوسری عالمی جنگ میں شریک تھی چنانچہ جاپانی افواج بڑی تیزی سے ہندوستان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دسمبر 1941ء کو جاپانیوں کے فضائی حملوں نے امریکی بحری بیڑے کی کمر توڑ کر شنگھائی کی بندرگاہ پر

قبضہ کر لیا۔ اس کے چوبیس گھنٹے بعد جاپانی فوجیں آسام اور ملایا پر قابض ہو گئیں جبکہ فروری 1942ء کو سنگاپور فتح کر کے 8 مارچ تک رنگون میں داخل ہونے کے ساتھ ساتھ جزائر انڈمان یعنی ہندوستان کے ساحل پر شدید بمباری کی۔ جاپانیوں کی اس پیش قدمی کے بعد برطانوی حکومت نے ہندوستان کے اندرونی سیاسی بحران کے حل کے لیے 22 مارچ کو سر سٹیفورڈ کرپس کو سیاسی پارٹیوں کے مختلف اور متضاد مطالبات کے درمیان مفاہمت کا راستہ نکالنے کے لیے نئی تجاویز کے ساتھ ہندوستان بھیجا۔ جسے "کرپس مشن" کا نام دیا گیا۔ تجاویز کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ایک ڈومینین کی صورت یا اگر کوئی صوبہ یا صوبے الگ ہونا چاہیں تو ایک سے زیادہ ڈومینین کی صورت میں آزادی دینے کے متعلق تھا۔ جبکہ دوسرے حصے میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو فی الفور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں جگہ دینے کے متعلق چند شرائط رکھی گئی تھیں۔ سٹیفورڈ کرپس کا خیال تھا کہ ان تجاویز کے دونوں حصوں کو ایک ساتھ منظور کیا جائے دوسرا کانگرس اور مسلم لیگ دونوں سیاسی جماعتیں متفق ہو گئیں تو ان تجاویز کو عمل میں لایا جائے گا۔ اس عالمی جنگ کو ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیاں سامراجی جنگ قرار دے چکی تھیں اور انہوں نے اس جنگ میں عدم تعاون کی پالیسی کو اپنایا۔ لیکن سوویت روس پر حملہ کے بعد ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی جنگ میں عدم تعاون کی پالیسی کو ترک کر کے اسے "قومی جنگ" قرار دے کر اس میں شمولیت کو قومی مفاد سمجھتے ہوئے اس سیاسی بحران کے حل کے لیے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان "اتحاد" پر زور دینے لگی۔

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے کرپس تجاویز کے جنگ کے بعد کے حصے کو منظور نہ کیا جبکہ کانگرس تقسیم ملک کے اصول کے بالکل خلاف تھی۔ دوسرا ان کا خیال تھا کہ برطانیہ جنگ ہار رہا ہے اس لیے ہندوستان کی حکومت فوری طور پر ان کے حوالے کر دی جائے۔ اس طرح کانگرس اور مسلم لیگ کے اس رویئے سے "کرپس تجاویز" مسترد ہو گئیں اور سٹیفورڈ کرپس واپس لنڈن چلے گئے اس سے ہندوستان کی اندرونی سیاسی صورتحال بڑی گھمبیر ہو گئی۔ ہندوستان میں کرپس مشن کی موجودگی میں کانگرس میں ایک تضاد "مسٹر راج گوپال اچاریہ" کی صورت میں ابھرا۔

مسٹر راج گوپال اچاریہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلم لیگ ہندوستان کے ایک حصہ میں اپنی علیحدہ حکومت بنانے پر مصر ہے تو کانگرس کے پاس کوئی چارہ نہیں کہ وہ مسلم لیگ کے اس مطالبہ کو باہمی سمجھوتے کے تحت قبول کرلے۔ کیونکہ موجودہ صورتحال میں یہی بہتر حل ہے کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتیں مل کر آزادی ہند کی طرف اپنے قدم بڑھائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صوبے مدراس کی معطل شدہ اسمبلی کے کانگرسی ممبروں اور صوبائی کانگرسی نمائندوں کو 23 اپریل 1942 کو اکٹھا کرکے انہیں اس بات پر قائل کیا کہ وہ ان سفارشات کو قرارداد کی صورت میں کانگرس کے آئندہ اجلاس میں پاس کرائیں۔

اس قرارداد میں جن سفارشات کا ذکر کیا گیا وہ یہ تھیں کہ کانگرس کو آئندہ آئین کے سلسلے میں مسلم لیگ کا مطالبہ "تقسیم ملک" تسلیم کرلینا چاہیے اور اس بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ گفتگو شروع کرنی چاہیے تاکہ باہمی سمجھوتے کے ذریعے موجودہ ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے "قومی حکومت" قائم کرنے کی سفارش کی جاسکے اس قرارداد میں حکومت سے مدراس اسمبلی اور وزارت کی بحالی کا اور مسلم لیگ کو وزارت میں شرکت کی دعوت کا بھی مطالبہ تھا۔

صوبہ مدراس کی ان دو قراردادوں نے بالخصوص تقسیم ملک کے معاملے نے کانگرسی حلقوں میں سنسنی پھیلادی۔

29 اپریل 1942ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے الہ آباد کے اجلاس میں جب یہ قراردادیں پیش ہوئیں تو انہیں بھاری اکثریت سے مسترد کردیا گیا۔ بلکہ ان قراردادوں کے برعکس یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر ایسی تجویز جس کا مطلب ملک کے حصے بخرے کرنا ہو نہ صرف عوام کے مفاد کے خلاف ہے بلکہ یہ ہندوستان کے صوبوں ریاستوں بلکہ پورے ملک کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اس پر راج گوپال اچاریہ احتجاج کرتے ہوئے کانگرس کی مجلس عاملہ سے مستعفی ہوگئے۔ کانگرس کی طرف سے گاندھی نے 10 مئی 1942 کو حکومت برطانیہ سے ہندوستان چھوڑو کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر اس ملک سے چلی جائے۔

سول نافرمانی

7- اگست 1942 کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے ایک اجلاس میں "سول نافرمانی" کا فیصلہ کیا تو حکومت نے دوسرے روز گاندھی اور کانگرس کی مجلس عاملہ کے تمام ممبروں کو گرفتار کرلیا۔ تقریباً دو ماہ تک یہ مہم جاری رہی۔ کئی جگہ فساد قتل وخون اور آتشزدگی کی وارداتیں ہوئیں۔ اس تحریک کا مرکز یوپی کا ضلع بلیہ تھا۔ آخر یہ تحریک بہت جلد ختم ہوگئی اور حالات معمول پر آگئے۔ سوائے ان رہنماؤں کے جو جیل میں جاپانی فوجوں کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ وہ ہی انہیں رہائی دلائیں۔

گاندھی کی اس تحریک سے مسلم لیگ نے تو اختلاف کرنا ہی تھا۔ تحریک کے سبب ہندو مہا سبھا اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی اختلافات سامنے آئے۔ یہاں تک کہ کانگرس کی مجلس عاملہ کے مستعفی رہنما راج گوپال اچاریہ نے 15 جولائی 1942 کو مدراس کی معطل شدہ اسمبلی کی کانگرس پارٹی کا جس کے وہ لیڈر تھے ایک اجلاس بلاکر مدراس اسمبلی سے رسمی طور پر استعفیٰ دے دیا ان کی پارٹی کے سات اور ممبروں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے 16 اگست کے ایک اجلاس میں مسلمانوں کو گاندھی کی ہندوستان چھوڑدو کی تحریک سے الگ رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ وہ اپنی نئی شرائط کے ساتھ ہندوستان آئے اور مسلمانوں کو ان کے حقوق اور آئینی اختیارات دے کیونکہ مسلم لیگ کا اب ایمان بن گیا ہے کہ ہندوستان کے مسائل کا حل صرف پاکستان کی سکیم کو قبول کرنے میں ہے۔

سیاسی بحران

ہندوستان کے اس جنگی اور سیاسی بحران کے پیش نظر کمیونسٹ پارٹی ہی واحد سیاسی جماعت تھی جو آزادی اور حفاظت وطن کے لیے ہندو مسلم کو متحد ہونے اور حق خود ارادیت کا پیغام دے رہی تھی۔

زندگی میں باقاعدہ نظم وضبط کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن کی حیثیت سے میرے اندر یکدم پیدا ہوا۔ دفتری امور کے ساتھ پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں کی رپورٹ

بھی مجھے لکھنا پڑ گئی تھی لیکن میں اپنے آپ کو ابھی تک اس کا اہل نہ سمجھتا تھا۔ لیکن میرے اندر یہ اعتماد موجود تھا کہ میرا کل آج سے بہتر ہو گا کیونکہ انسان میں آگے بڑھنے پھلنے اور پھولنے کی صلاحیت موجود ہو تو صرف اُسے حوصلہ چاہیے اور ماحول بھی اس کی صلاحیتوں کو جلا دیتا ہے چنانچہ میں نے آئندہ زندگی کیلئے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا۔

زیادہ سے زیادہ شوق اور توجہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کام اور زیادہ سے زیادہ پڑھائی یکم ستمبر 1942 کو میں رات آٹھ بجے دفتر سے گھر پہنچا۔ کل چونکہ چائے اور کافی زیادہ پی لی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیند ختم ہو گئی اس لیے میں اور رفیق فلم "امر جیوتی" دیکھنے چلے گئے۔ امر جیوتی کافی پرانی فلموں میں سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک بہت کم فلمیں اس کے مقابلے کی بنی ہیں۔ یہ فلم پربھات کمپنی کی ہے۔ پربھات کمپنی کے تمام ڈائریکٹر پڑھے لکھے ہندو سرمایہ دار تھے۔ یہ فلم 1937 کی انقلابی فضاؤں میں بنی تھی اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ہندی بورژوا آزادی کے غیر مبہم نعرے بلند کر رہا تھا۔ اس فلم میں بھی آزادی کا ایک غیر مبہم پرتو تھا۔ مکالمے بڑے جاندار اور معنی خیز تھے۔

جیسا کہ سدامنی اس جدوجہد سے تنگ آ کر کہتی ہے "کیا لہروں کا ان چٹانوں سے ٹکرانا اور واپس چلا جانا ہی میری زندگی ہے۔

شیکھر اس کا خاوند جواب دیتا ہے "لہریں آتی ہیں چٹانوں سے ٹکراتی اور ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے لیکن اس کے باوجود چٹانیں گھس رہی ہیں۔ کوشش کیے جانے سے ضرور ایک دن ختم ہو جائیں گی۔"

بدلتی ہوئی دنیا عوام کی بیداری بین الاقوامی حالات یہ سب کچھ ہماری فلمی دنیا پر اثرانداز ہو رہے تھے۔ لیکن اس وقت ہمیں اس تبدیلی کے اثرات کا احساس نہ ہو رہا تھا لیکن نتائج کے لحاظ سے یہ ضرور دوررس تھے۔

دنیا کے عوام آگے بڑھ رہے ہیں جنہوں نے ملکوں کی دیواروں کو منہدم کر دیا ہے اب ایک بین الاقوامی برادری سر نکال رہی ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں برطانیہ کے ترقی پسند عوام بھی پوری تندہی سے ہندوستان کی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

باب 8

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس

آل پنجاب مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے دوسری طلباء کی تنظیموں سے بھی میرا گہرا رابطہ رہا۔ نومبر 1942 کو آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے جالندھر میں ایک آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کرنی تھی اس موقعہ پر پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر لے کر ہم چار پارٹی دوست کامریڈ رندھیر سنگھ جوش ستیہ پال ڈانگ اور ظہورالحسن 13 نومبر کو جالندھر پہنچ گئے۔

رندھیر سنگھ جوش بڑا فعال اور سرگرم طالب علم تھا۔ رندھیر سنگھ اس کا اصل نام اور جوش تخلص تھا وہ پنجابی اور انگریزی میں شاعری کرتا تھا۔ بعد میں وہ مغل پورہ میں انجینئرنگ کالج کے پہلو میں قائم ہونے والے سکھ نیشنل کالج میں لیکچرار مقرر ہوا۔ جبکہ ستیہ پال ڈانگ پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد مختلف طلباء کی تنظیموں کے سرکردہ ممبروں سے ملے اور انہیں کیونسٹ طلبہ کی طرف سے شائع کیا اشتہار پڑھنے کے لیے دیتے۔ جس میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کو ہدیہ تبریک پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کیونسٹ طلبہ کی سیاسی پالیسی کو بھی واضح کیا گیا تھا کہ ہم اپنے ملک کی آزادی اور تمام قومیتوں کے حق خودارادیت کے لیے آپ کے دوش بدوش لڑیں گے اور اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں گے۔ آیئے ہم دوش بدوش کھڑے ہو کر قومی اتحاد کا مقدس کام شروع کریں اور قومی حکومت اور قومی دفاع سے قومی آزادی کی منزل تک پہنچیں۔

میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں جن کا تعلق پنجاب کی میاں برادری سے تھا اور وہ مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے جب یہ اشتہار پڑھا تو خوش ہوئے اور پھر یہ اشتہار قائداعظم کو پڑھانے اور ان سے ملاقات کا وعدہ کیا۔ یہ حقیقت تھی کہ میاں بشیر احمد ایسے روشن خیال عناصر کے علاوہ بہت سے رجعت پسند انٹی کانگرس مسلم لیگی بھی موجود تھے اور ان کا یہ رویہ کھل کر سامنے بھی آیا اور انہوں نے کیمونسٹ طلباء پر نہ صرف نکتہ چینی کی بلکہ ان پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود بہت سے طلبہ رہنماؤں نے ہماری ان کوششوں پر ہمیں شاباش دی جس سے ہمارے عزم اور ارادے اور مضبوط ہوئے اس طرح ہم میں دوری کی جگہ قربت' بے رُخی کی جگہ اشتیاق اور مخالفت کی جگہ موافقت نے لے لی۔ اس طرح ہم سب مل کر صبح نو بجے جالندھر ریلوے اسٹیشن پر قائداعظم محمد علی جناح کے پرتپاک استقبال کے لیے پہنچے۔ تمام ریلوے اسٹیشن عوام سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں پر بھی ہم نے اُردو اور انگریزی کے اشتہار پڑھنے کے لیے تقسیم کیے۔ جسے پڑھنے کے بعد بعض کا فوری ردعمل یہ تھا کہ ہمیں آپ کی دیانتداری پر تو ذرہ بھر شک نہیں لیکن ہمیں کانگرس پر بالکل اعتماد نہیں۔

اس کے جواب میں ہم نے انہیں بتایا آپ انہیں غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیمونسٹ کانگرسی بہن بھائیوں کو یہ سمجھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے کہ قومی دفاع کو تباہ و برباد کرنا عوام کے لیے فائدہ مند نہیں ہے۔ آزادی کی منزل تک پہنچنے کی راہ صرف "قومی اتحاد" میں ہے اور تمام قومیتوں خصوصاً مسلم قومیتوں کے حق خودارادیت اور حق علیحدگی کو تسلیم کرکے ہی یہ اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے یہ سن کر انہوں نے ہمیں تحسین بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہمارا اشتہار پڑھ کر ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا "میں نے پہلی بار ایک دیانتدار جماعت دیکھی ہے خدا آپ کو ہمت دے"

قائداعظم سے ملاقات

ٹھیک سات بجے شام قائداعظم سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کا وقت مقرر ہوا۔

ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا قائداعظم اس وقت تشریف نہیں رکھتے البتہ میاں بشیراحمد وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ قائداعظم کی آپ سے گفتگو پروگرام میں شامل ہے چنانچہ آپ تشریف رکھیں۔ چند منٹوں کی تاخیر کے بعد قائداعظم تشریف لے آئے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے کہا "معاف کیجئے گا مجھے دیر ہوگئی اور آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

ہم نے باقاعدہ گفتگو کے آغاز کے لیے پوچھا "کیا آپ نے ہماری اپیل پڑھی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی جڑ دیا۔" آپ نے لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ قومی دفاع آپ کا فرض ہے قومی دفاع کے لیے آپ کون سا راستہ بہتر سمجھتے ہیں؟

"قومی حکومت" قائداعظم بولے تو ہم نے کہا "لیکن یہ کیسے ہوگا؟"

"جب کانگرس اور لیگ کا سمجھوتہ ہمارے حق خودارادیت کی بنا پر ہوگا۔"

"کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور راستہ ہے؟"

"بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔"

قائداعظم کا یہ دوٹوک فیصلہ سن کر ہم سب خوش خوش واپس لوٹ آئے کیونکہ ہمارے نزدیک آج سے قومی اتحاد کے امکانات بہت بڑھ گئے تھے۔ کیونکہ برصغیر میں ہندو مسلم اتحاد ہی فاشسٹ طاقتوں کے بڑھتے قدموں کو روک سکتا تھا۔ رات کو عوام سے بھرپور ایک بہت بڑے پنڈال سے قائداعظم نے خطاب کرتے ہوئے کہا "ملک کو بچانا ہمارا فرض ہے کیونکہ ہماری سرحدیں دشمن گھیرے ہوئے ہیں۔" خطاب میں قائداعظم نے راج گوپال اچاریہ کی بھی تعریف کی اور کمیونسٹوں کی پالیسی سے بھی ہم آہنگ باتیں کیں جیسا کہ اُنہوں نے کہا "آج کہا جارہا ہے کہ حق خودارادیت صرف مسلمانوں تک ہی کیوں محدود رہے باقی کی قوموں کو بھی حق خودارادیت ملنا چاہیے۔"

مسلمان حق خودارادیت کا مطالبہ کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک قوم ہیں اُن کے پاس ایک علاقہ ہے جہاں وہ بھاری اکثریت میں ہیں کیا کبھی تاریخ نے ایسی مثال پیش کی ہے کہ ایک اقلیت جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہو اُسے بھی علیحدہ ریاست بنانے کا حق دیا جائے۔ ان کے لیے کہاں سے ریاست مہیا کی جائے مثلاً صوبہ جات متحدہ میں چودہ فی صد مسلمان ایک قوم نہیں وہ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں اُن کو سوائے اس حق کے جو

ایک مہذب حکومت میں اقلیت کو مل سکتا ہے اور کچھ نہیں مل سکتا۔

جناح صاحب کے یہ الفاظ قومیت کی تعریف کر رہے ہیں یعنی قومیت کے لیے ایک مخصوص علاقہ ثقافتی لسانی، ذہنی و اقتصادی یکسانیت ضروری ہے اور انہیں خصائص کے مالک افراد کو قوم کہا جا سکتا ہے اور اُسے حق خود ارادیت دیا جا سکتا ہے۔

رات ایک بجے کانفرنس ختم ہوئی اور ہم سب اپنے اپنے خیموں میں لوٹ آئے اور باہم مل کر تبادلہ خیال کیا۔ اکثریت یہ محسوس کر رہی تھی کہ کانگرس نے جگت نرائن کی قرارداد پاس کر کے ہندو مسلم اتحاد کے تو سارے دروازے بند کر دیئے ہیں یہ درست تھا۔ لیکن جس طاقت نے کانگرس کے صدر اور جواہر لال نہرو کو دہلی قرارداد کی حمایت میں بیان دینے پر مجبور کیا وہی طاقت یقیناً کانگرس کو تمام قومیتوں کے حق خود ارادیت پر رضامندی کے لیے مجبور کر سکتی ہے۔ یہ طاقت عوام کی طاقت ہے جس میں ہندو اور مسلم دونوں شامل ہیں۔

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے مندوبین نے ہماری ہندو مسلم اتحاد اور قومیتوں کو حق خود ارادیت کی کوششوں کو بہت سراہا اور کہا ہم ان کوششوں میں آپ کے ساتھ ہیں۔

میں مسلم لیگ کی کونسل کے مختلف اراکین سے بھی ملا اور انہیں واضح الفاظ میں کہا کہ آج مسلم لیگ اور کانگرس کا اتحاد ہی ملک کو بچا سکتا ہے ورنہ ہم ہمیشہ کے لیے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ جائیں گے چنانچہ کونسل کے بعض عہدیداروں نے ہمارے مطالبہ پر دستخط کیے اور ہمارے نعروں کانگرس لیگ اتحاد کے جواب میں زندہ باد کہا۔

ہندو مسلم اتحاد

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کے خلاف کانگرسی سوشلسٹوں نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے حق میں جبکہ مسلم لیگ کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کانگرس کی اس تحریک کی مخالفت کر رہی تھی۔ اس بنا پر کانگرس کی متشدد کارروائیوں کے حامی سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ہندوستان میں اس وقت سب سے بڑے غدار کمیونسٹ اور مسلم لیگی ہیں۔

آل انڈیا کانگرس کو حکومت نے خلاف قانون قرار دے دیا تھا اب اس نے پارٹی کی طرف سے خفیہ لٹریچر شائع کر کے اس کی تقسیم کا خفیہ بندوبست کر لیا تھا۔ چنانچہ جب آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس اور اس کے بعد میری رپورٹ "جنگ آزادی" میں شائع ہوئی تو کانگرسی سوشلسٹوں نے اس کانفرنس کے متعلق اپنے خفیہ سرکلوں میں عجیب طرح کا واویلا مچانا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے اس کانفرنس میں ہونے والی گفتگو کو کمیونسٹ مسلم لیگ اور برطانیہ کی حکومت کا نیا معاہدہ قرار دیا۔

اس کے بعد کانگرس سوشلسٹ پارٹی کے جے پرکاش نرائن نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری پی سی جوشی نے اپنا ایک خصوصی پیغام عبداللہ ملک کے ذریعہ مسٹر جناح تک پہنچایا اور انہوں نے کانگرس اور ہندوستان کی آزادی کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا ہے۔

کانگرس سوشلسٹ پارٹی کا کمیونسٹ پارٹی کی ہندو مسلم اتحاد کی پالیسی کے خلاف ردعمل سامنے آیا۔

کیونکہ اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری پی سی جوشی جو بمبئی سے مرکزی پارٹی کے شائع ہونے والی انگریزی ہفتہ وار "پیپلزوار" اور اردو ہفتہ وار "قومی جنگ" کے ایڈیٹر تھے۔ اخباروں کے ذریعے "ہندو مسلم اتحاد کی تحریک کے لیے عوام کو منظم کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد کے لیے عوام کو منظم کرنا ایک ایسی قومی حکومت حاصل کرنے کی جدوجہد ہے جو ہندو اور مسلم عوام کی صحیح نمائندگی کرے ان کے نزدیک حکومت کا کمیونسٹ پارٹی کو بحال اور قانونی بنانا اور کانگرس کے رہنماؤں کی گرفتاری اور اسے غیر قانونی جماعت قرار دینا اور سارے ملک میں جبر و تشدد کی گرم بازاری دراصل سامراجی جدوجہد ہے جس کا مقصد ہماری قوم اور ملک کو غلام بنائے رکھنا اور ہمارے عوام کو حفاظت وطن' عزت اور سعادت سے محروم کر دینا ہے۔ انہوں نے کانگرس کی توڑ پھوڑ کی تحریک کو آزادی کی جدوجہد نہیں کہا بلکہ اسے براہ راست قومی حفاظت کو نقصان اور فاشسٹ جاپانی حملہ آور کو فائدہ پہنچانا قرار دیا۔ پی سی جوشی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے پارٹی لٹریچر مرکزی کمیٹی کا اعلان نامہ اور قومی رہنماؤں کی رہائی کے بارے میں خاصہ مواد شائع کیا۔ انہوں نے قومی اتحاد کے چار خاص نعرے

دیئے۔

i۔ کانگرس کے رہنما رہا کیے جائیں۔

ii۔ توڑ پھوڑ سے احتراز کیا جائے۔

iii۔ کانگرس لیگ سے سمجھوتے کی کوشش کی جائے جو محبان وطن کی تمام سیاسی جماعتوں کے اتحاد کی بنیاد ہے۔

iv۔ قومی حکومت قومی حفاظت اور آزادی کے لیے قومی اتحاد کی تعمیر کی جائے۔

چنانچہ کمیونسٹ عوام کے پاس اتحاد کا پیغام لے کر گئے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ان کی آواز پہنچے۔ اس طرح تمام صوبوں اور ریاستوں میں "ہندو مسلم اتحاد" کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ لائلپور ضلع کے کمیونسٹوں نے "ہفتہ اتحاد" بڑی شان سے منانے کے لیے یکم نومبر 1942ء کو اس کے افتتاحی اجلاس میں ایک بڑے جلوس کا اہتمام کیا۔ جلوس کے آگے کانگرس مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے جھنڈے لہرائے گئے جلوس میں کوئی پانچ چھ ہزار آدمی تھے جن میں بڑی تعداد کسانوں اور مزدوروں کی تھی۔

جلوس نے جب تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تو پولیس نے اس جلوس کو روک دیا کیونکہ جلوس میں ایک غیر قانونی عمل کیا جا رہا تھا ایک پولیس افسر کا ہاتھ کانگرس کے جھنڈے کو لہرانے والے کے گریبان کی طرف بڑھا تو ضلع کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری کامریڈ بسنت سنگھ نے آگے بڑھ کر پولیس افسر کا ہاتھ تھام کر پوچھا یہ تم کیا کر رہے ہو؟

پولیس آفیسر نے کہا آپ جانتے نہیں کہ کانگرس خلاف قانون جماعت ہے؟ آپ اس کا جھنڈا نہیں لہرا سکتے۔ اس پر کامریڈ بسنت سنگھ نے کہا "بھولے بادشاہو' قانون نوں سمجھدے ہویاں دی بے سمجھی دی گل کر رہے او' پارٹی خلاف قانون اے جھنڈا نہیں"۔

پولیس آفیسر جھینپ کر رہ گیا اور پھر پوچھا' "آپ کس لیے جلوس نکال رہے ہیں؟"

کامریڈ بسنت سنگھ نے بتایا "ہندو مسلم اتحاد لئی۔" (ہندو مسلم اتحاد کے لیے)

"ہفتہ اتحاد کی افتتاحی تقریب میں کمیونسٹ پارٹی کے سرخ جھنڈے دو آنہ فی جھنڈا

کے حساب سے بارہ سو جھنڈے فروخت ہوئے جبکہ ہفت روزہ "جنگ آزادی" کے چالیس (40) اور ہفت روزہ "قومی جنگ" کے ستر (70) مستقل خریدار بنے۔

اس کے باوجود کمیونسٹ' کانگرس سوشلسٹ پارٹی کی زبردست تنقید کا نشانہ بن رہے تھے۔ کانگرسی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے درمیاں نئی مخاصمت سامنے آئی۔ کل ہند کانگرس ورکنگ کمیٹی کی 8- اگست 1942ء کو "ہندوستان چھوڑ دو" کی قرارداد کی منظوری کے بعد 9- اگست 1942ء کو جب قرارداد آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں کمیونسٹ ارکان کی پرزور مخالفت کے باوجود منظور ہوئی تو کانگرس کے سوشلسٹوں نے حکومت کے خلاف متشدد احتجاج شروع کر دیا جس پر حکومت نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان بلکہ ملک بھر میں کانگرس کے کارکنوں کی بڑی تعداد کو بھی گرفتار کرلیا۔ بلکہ پنجاب کی حکومت نے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے بہت سے ارکان کو بھی گرفتار اور نظربند کردیا تھا۔ جس پر پنجاب کانگرس کی متشدد کارروائیوں کی لپیٹ میں آگیا کیونکہ کانگرس کی سوشلسٹ پارٹی اور فارورڈ بلاک نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں پرجوش حصہ لیا۔

اس سارے عمل میں کمیونسٹوں نے تحریک کی مخالفت کے ساتھ ساتھ کانگرسی رہنماؤں کی گرفتاریوں اور نظربندی کے خلاف حکومت پر کڑی تنقید کی کیونکہ اس سے حکومت نے حالات میں مزید بگاڑ پیدا کر دیا تھا۔

پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے اندر بھی کمیونسٹ ارکان نے یونینیسٹ حکومت جو انگریزوں کی حامی تھی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ وہ کانگرس کے خلاف اپنی روا رکھی ظالمانہ کارروائیوں کو بند کرے۔ سوہن سنگھ جوش' تیجا سنگھ سوتنتر اور بی بی رگھبیر کور نے کانگرسی اور کمیونسٹ قیدیوں کے بارے میں کئی سوال کیے۔ سوہن سنگھ جوش نے اسمبلی پر واضح کردیا کہ "آزادی کا تصور کانگرس اور لیگ اتحاد اور قومی حکومت سے مشروط ہے۔

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس میں مسلم لیگ اور کمیونسٹوں کے خلاف کانگرسی سوشلسٹوں کے خفیہ پراپیگنڈے کی اشاعت کے اثرات کو بے اثر کرنے کے لیے پی سی جوشی نے ہفت روزہ اردو "قومی جنگ" اور انگریزی کے "پیپلز وار" کی 6 دسمبر 1942 کی

اشاعت میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کی پوری روائیداد شائع کردی۔ قومی جنگ کے پہلے صفحہ پر سرخی جمائی' ہندوستان کے بچاؤ کے لیے کانگرس لیگ سمجھوتہ ہی واحد راستہ ہے' مسٹر جناح: جبکہ انگریزی ہفتہ وار Peoples war کی شہ سرخی تھی۔

Jallunder Muslim Students conference: Jinnah interviewed communists among muslim students by Abdulh Mullick

دسمبر 1942 کے آخری دنوں میں پنجاب کی سیاست میں ایک زبردست بھونچال آیا جس نے ایک لحاظ سے سب سے زیادہ کمیونسٹوں کو متاثر کیا۔ یہ بھونچال پنجاب کے وزیراعظم سر سکندر حیات کی موت تھی۔

سر سکندر حیات کی موت سے کمیونسٹ دو طرح سے متاثر ہوئے تھے ایک تو وہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی طرف سے پنجاب کے وزیراعظم تھے دوسرے ان کی بیٹی طاہرہ حیات کی شادی مشہور کمیونسٹ مظہر علی خان سے ہوئی تھی جو فوج سے چھٹی لے کر آئے تھے۔

کمیونسٹ اور فوج

کمیونسٹوں کا فوج میں جانا پارٹی کی جنگ کے بارے میں نئی پالیسی کے تحت عمل میں آیا۔ کمیونسٹ تو اس جنگ کو فاشسٹ کا نام دے کر اس میں فوجی شمولیت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے لیکن سوویت یونین پر جرمنوں کے حملے سے یکدم جنگ کمیونسٹوں کے لیے قومی جنگ بن گئی اور انہوں نے اس جنگ میں شمولیت کی تحریک چلائی جس میں پنجاب کے نوجوانوں خاص کر زمینداروں اور کسانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

کمیونسٹ رہنماؤں اور دانشوروں میں چراغ حسن حسرت' فیض احمد فیض اور مظہر علی خان نے بھی فوج کی ملازمت کرلی اور اس طرح وہ ہندوستانی فوج میں جرنیل کرنیل بن گئے تاکہ وہ اس جنگ کو صحیح معنوں میں قومی جنگ میں تبدیل کردیں۔

کمیونسٹوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے سب سے پہلے پارٹی پالیسی کے خلاف فوج میں ملازمت کرلی۔ اُن کی ڈیوٹی برلن ریڈیو کے پراپیگنڈے کو بے اثر کرنا تھا۔ برلن ریڈیو جنگ کی صحیح صورتحال کی بجائے فاشسٹ

فوجوں کی جنگی کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا تھا۔ چونکہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں جنگ کے خلاف تھیں اس لیے ان کو برلن ریڈیو زیادہ متاثر کر رہا تھا۔ حکومت نے برلن ریڈیو سننے پر پابندی بھی عائد کر دی اس کے باوجود عوام برلن ریڈیو میں بڑی دلچسپی لینے لگے اس پر عوام کی رائے کو بدلنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو نے باقاعدہ برلن ریڈیو کے خلاف بقول ان کے "جھوٹ کا پول کھولنے کے لیے باقاعدہ پروگرام شروع کیا۔ حکومت نے بائیں بازو کے دانشوروں سے رابطے کیے اور انہیں فوج میں شمولیت اختیار کرنے کو کہا تو ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً فوج میں چلے گئے۔

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کی فوج میں شمولیت اور ابن الوقتی کے خلاف باتیں کرتے ہوئے فیض احمد فیض صاحب نے مجھے بتایا یہ تاثیر ایک طرف تو اپنے آپ کو کیمونسٹ کہتا ہے اور دوسری طرف وہ فاشسٹ قوتوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

جب میں نے ان سے پوچھا' "فیض صاحب یہ ڈاکٹر تاثیر صاحب فوج میں گئے کیسے؟" تو انہوں نے بتایا کرنل مجید ملک اور مشتاق احمد گورمانی کی وساطت سے۔

"وہ کیسے؟" یہ میرا سوال تھا۔

وہ ایسے کہ کرنل مجید ملک جو کہ حلقہ نیاز مندان لاہور اور سالنامہ "کارواں" کے حوالے سے ہمارے ساتھی رہے تھے۔ انہوں نے جنگ کے بعد نئی صورتحال کے پیش نظر دوبارہ ہم تک رسائی حاصل کی اور ہمیں فوج میں شامل ہونے کے لیے کہا ہم نے تو صاف کہہ دیا کہ جب تک ہمیں پارٹی اجازت نہیں دے گی ہم فوج میں نہیں جائیں گے لیکن ڈاکٹر تاثیر سے رابطہ کیا تو وہ تو جیسے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔"

جب جرمنوں نے سوویت یونین پر حملہ کیا اور اس کے بعد انٹرنیشنل کیمونسٹوں نے جنگ کی نئی صورتحال کے پیش نظر ایک نئی جنگی پالیسی بنائی اور اسے تمام دنیا میں پھیلا دیا تو ہندوستان کے کیمونسٹوں کے لیے بھی یہ جنگ "قومی جنگ" بن گئی اور جنگ میں نہ صرف کیمونسٹ رہنماؤں نے عملی طور پر حصہ لیا بلکہ انہوں نے جنگ میں بھرپور حصہ لینے کے لیے ایک تحریک چلائی جس سے پنجاب میں بہت تعداد میں مسلمان اور سکھ نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے۔ اس طرح پنجابی' سپاہیوں سے لے کر جرنیلوں اور

کرنیلوں کے عہدے تک پہنچے' کمیونسٹ مظہر علی خان بھی ایسے نوجوانوں میں شامل تھا۔ لیکن فوج میں جانا اس کے لیے ایک ذاتی مسئلہ تھا یعنی شادی اور شادی بھی پنجاب کے اس وزیراعظم کی بیٹی سے جس نے برطانوی حکومت کے لیے پنجاب میں جنگ کے لیے نہ صرف مالی امداد کی بلکہ پنجاب سے فوجی بھرتی بھی کرائی یہاں تک کہ وزیراعظم کے دو بیٹوں نے اس جنگ کے لیے کمیشن لے لیا تھا۔ یہ دونوں بیٹے عظمت حیات اور شوکت حیات تھے۔

مظہر علی خان

مظہر علی خان نواب مظفر علی خان کے بیٹے تھے اور سر سکندر حیات وزیراعظم پنجاب کے بھتیجے۔ سر سکندر حیات کی بیٹی طاہرہ خاتون کوئین میری کالج کی ذہین طالبہ تھی۔ مظہر علی خان اور طاہرہ ایک دوسرے سے دلچسپی رکھتے تھے اور یہ معلوم ہوا کہ دونوں آپس میں شادی کے لیے خواہش مند ہیں۔

بات جب سر سکندر حیات تک پہنچی تو نئی سیاسی صورتحال میں یہ شادی ناممکن تھی کیونکہ سر سکندر حیات اس وقت یونینسٹ پارٹی کے قائد تھے اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ جبکہ مظہر علی خان کی سیاسی وابستگیاں ایک ایسی سیاسی پارٹی سے تھیں جو خلاف قانون تھی اس لیے اس کی تمام تر سیاسی سرگرمیاں خفیہ تھیں۔ جنگ عظیم دوئم کے شروع ہوتے ہی ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے جنگ کے خلاف محاذ بنایا جس کی وجہ سے حکومت نے انہیں قید یا نظربند کر دیا۔ یہ صورتحال کوئی چار ماہ جاری رہنے کے بعد جرمنی نے جب سوویت یونین پر حملہ کیا تو انٹرنیشنل کمیونسٹ پارٹی نے ایک نئی پالیسی وضع کی تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی اپنی پالیسی بدلنی پڑی اور پھر انہوں نے اس جنگ کو قومی جنگ قرار دے دیا۔

سر سکندر حیات کے قریبی دوست اور عزیز رشتے دار مظہر علی خان اور طاہرہ خاتون کو سیاست کی نذر ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے قربان علی خان کو سر سکندر حیات سے اس مسئلہ پر تفصیل سے بات کرنے کے لیے بھیجا تو سکندر حیات نے مظہر علی خان کے متعلق جن خدشات کا ذکر کیا ان میں یہی دو اہم مسئلے تھے ایک تو

اس وقت جبکہ وہ یونینسٹ پارٹی کا وزیراعظم تھا۔ اُسے پنجاب کی تمام مخالف سیاسی پارٹیوں کی حکومت مخالف سیاست کو کچلنا تھا۔ ان حالات میں وہ اسے اپنا داماد کیسے بناتے؟

دوسرا مسئلہ مظہر علی خان کمیونسٹ ہونے کے ناطے خود ساختہ بے روزگار بھی ہے کیونکہ وہ سرکاری نوکری کے خلاف ہے ان دو مسئلوں کے ہوتے ہوئے میں اپنی بیٹی اس کے حوالے کیسے کرسکتا ہوں؟

یہ سب کچھ سن کر قربان علی نے کہا کچھ بھی کہو وہ آپ کے بھائی نواب مظفر علی خان کا بیٹا ہے' وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے دور حکومت میں میری مخالفت پر وہ جیل جاچکا ہے۔ قربان علی خان کی رگ ظرافت پھڑکی اور بولے یہ تو سیاسی عمل ہے آپ بھی تو جیل جاسکتے ہیں۔

جب سر سکندر حیات کو محسوس ہوا کہ قربان علی خاں اس شادی پر بضد ہے تو انہوں نے کہا دیکھو میرے دونوں بیٹے شوکت حیات اور عظمت حیات فوج میں ملازم ہیں۔ اگر مظہر علی خان کو تم فوج میں کمیشن لینے پر رضامند کرسکو تو میں شادی پر رضامند ہو جاؤں گا۔

اچھا یہ ہے تو پھر آپ شادی کے لیے تیار رہیں۔ قربان علی خان نے بڑے یقین سے کہا کیونکہ وہ کیمونسٹوں کی نئی جنگی پالیسی سے آگاہ ہو چکا تھا۔

مظہر علی خان کی فوج میں کمیشن لینے کے فیصلے کی مخالفت میں مقبول محمود سب سے پیش پیش تھے اُن کا کہنا تھا کہ مظہر مزدوروں اور کسانوں کا ساتھ چھوڑ کر مہاراجوں اور نوابوں کے ساتھ مل گیا ہے۔

کیمونسٹ پارٹی کی نئی جنگی پالیسی کے پیش نظر حکومت نے کیمونسٹ پارٹی کو جو غیر قانونی تھی قانونی قرار دے دیا تو پورے ہندوستان میں کیمونسٹ پارٹی کی تنظیم نو کی گئی۔ پی سی جوشی کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تو انہوں نے پارٹی کی نئی حکمت عملی کی پیروی کے لیے ملک گیر دورہ کیا۔

کیمونسٹ پارٹی کی نئی پالیسی کے واضح ہوتے ہی مظہر علی خان نے فوج کی ملازمت اختیار کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ اس طرح مظہر علی خان دونوں طرف سے

سرخرو ہوئے۔ کمیونسٹ حلقے میں مظہر علی خان کا فوج میں جانا اور سر سکندر حیات کی بیٹی سے منگنی کی خبر خاصی دلچسپی کا باعث بنی۔ پارٹی کے بعض کارکن تک اس شادی میں شرکت کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ قانونی پارٹی بننے کے صرف چھ ماہ بعد دسمبر 1942ء کو مظہر علی خان اور طاہرہ کی شادی ہوئی۔ یہ شادی خوشیوں کے ساتھ ایک دکھ دینے والی خبر بھی لائی جس نے پنجاب کی نئی سیاسی فضا کو خاصا غمگین کر دیا۔

سر سکندر حیات کی وفات

ہوا یوں کہ سر سکندر حیات کے داماد کے فوج میں کمیشن لینے سے اس گھر کے تین فرد دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی فوج کی طرف سے محاذ جنگ میں لڑ رہے تھے۔ مظہر علی خان سے پہلے سر سکندر حیات کے دو بیٹے شوکت حیات عظمت حیات پہلے ہی فوج میں تھے وہ جلد ان کی شادیوں کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے لیکن سب سے بڑا مسئلہ بیٹوں کا فوج سے چھٹی لینا تھا۔ کیونکہ جنگ کے دوران فوج میں چھٹی لینا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اتفاق سے تینوں کی چھٹی کے اسباب پیدا ہو گئے چنانچہ ان دنوں میں ہی سر سکندر حیات نے ان فرائض کی ادائیگی کا فیصلہ کیا۔

عظمت حیات اور طاہرہ خاتون کے رشتے تو طے ہو چکے تھے بس مسئلہ شوکت حیات کا تھا اس لیے فوری طور پر سکندر حیات امرتسر پہنچے اور مقبول پارلیمنٹری سیکریٹری پنجاب لیجسلیٹو کی بیٹی سے شوکت حیات کا رشتہ طے کیا۔

23 دسمبر 1942ء کو نواب مظفر علی خان اپنے بیٹے مظہر علی خان کی بارات لے کر سر سکندر حیات کی رہائش جو مال روڈ پر واقع تھی' پہنچے۔ سہ پہر کو طاہرہ کی ڈولی لے کر رخصت ہوئے۔

24 دسمبر کو سر سکندر حیات اپنے بیٹے عظمت حیات کی بارات لے کر حکیم احمد شجاع اسسٹنٹ سکریٹری پنجاب لیجسلیٹو کے ہاں پہنچے اور شام سے پہلے بہو لے کر گھر پہنچے۔ 25 دسمبر کی دوپہر کو عظمت حیات کی دعوت ولیمہ تھی جس میں صرف مسلمان رشتہ داروں اور معزز مسلمانوں نے شرکت کی۔ دعوت ولیمہ جمعہ کی نماز سے پہلے دی

گئی کھانے کے بعد نماز پڑھی گئی۔ اس شام سر سکندر حیات اپنے بڑے بیٹے شوکت حیات کی بارات لے کر امرتسر پہنچا۔ یہ رات کی بارات تھی جو امرتسر میں ایک یادگار شادی کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔ 26 دسمبر کی صبح کو بارات واپس لاہور پہنچی۔ اُسی روز دوپہر کو دعوت ولیمہ دی گئی۔ اس میں بھی صرف اپنے عزیزوں رشتہ داروں اور فقط مسلمان احباب کو شریک کیا گیا۔

26 دسمبر کی شام کو اپنی کوٹھی کے وسیع لان میں ایک گارڈن پارٹی کا انتظام کیا جس میں ہر مذہب و ملت کے اصحاب بڑی تعداد میں مدعو کیے گئے ساڑھے پانچ بجے ہز ایکسی لینسی گورنر پنجاب سر برٹرنیڈ گلینسی اپنی بیوی کے ہمراہ تشریف لائے۔ پارٹی کے آخر میں فوٹو سیشن ہوا اس کے بعد مہمان رخصت ہوئے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد سکندر حیات نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے گھل مل کر باتیں کیں ان کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ دن بھر کے کام کاج سے سر سکندر حیات بہت تھک چکے تھے۔ دن میں دوڑ دھوپ کرتے ہوئے انہوں نے کئی بار سینے میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا مگر کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ رات کو کچھ زیادہ تھکن محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے معمول سے پہلے اپنے کمرے میں آرام کی خاطر چلے گئے۔

آج وہ اپنی خوابگاہ میں معمول سے پہلے جا کر لیٹ گئے اس لیے چھوٹی بیگم یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا وہ سو رہے ہیں گیارہ بجے کے قریب کمرے میں آئیں۔ "دیکھا کہ وہ بے سدھ پڑے ہیں بیگم نے ہلکی سی آواز دی تو کوئی جواب نہ پا کر سوچا کہ تھکن کی وجہ سے گہری نیند لے رہے ہیں انہوں نے پاؤں دابنے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائے تو محسوس ہوا کہ وہ تو اکڑے ہوئے ہیں تیزی سے ان کے ہاتھ پنڈلیوں تک آئے جو بالکل بے جان تھیں بیگم کی یکدم چیخ نکل گئی۔

خوابگاہ سے اٹھنے والی چیخ سے سارا گھر دہل گیا گھر میں موجود ہر کوئی ادھر دوڑا آیا۔ ٹیلی فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا گیا جنہوں نے آ کر دل کی حرکت اچانک بند ہونے کی وجہ سے موت کی تصدیق کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

راتوں رات یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی 27 دسمبر کی سہ پہر کو انہیں شاہی مسجد کے مرکزی دروازہ کے ساتھ دائیں طرف دفنا دیا گیا۔

پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کی اس اچانک موت کے بعد گورنر پنجاب سر برٹرنیڈ گلینسی نے سر فیروز خان نون کو پنجاب کی وزارت کی تشکیل کی دعوت دی تھی۔ فیروز خان نون جو ان دنوں مرکزی کابینہ میں شامل تھے انہیں مرکزی حکومت میں اپنی ذمہ داریاں زیادہ دلچسپ معلوم ہوئیں اس لیے انہوں نے گورنر پنجاب کو مشورہ دیا کہ موجودہ سیاسی حالات میں سر خضر حیات ٹوانہ ہی بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ گورنر پنجاب نے سر خضر حیات ٹوانہ کو نئی وزارت تشکیل کرنے کی دعوت دی۔

پنجاب کی سیاسی فضا میں مسلمانوں کی جماعتوں میں یونینسٹ پارٹی جو برسراقتدار پارٹی' اور مسلم لیگ شمار ہوتی تھیں دونوں کا تعلق اعلیٰ طبقہ سے تھا۔ مسلم لیگ اور سر سکندر حیات کی وزارت عظمیٰ اور حکومت میں ایک محبت اور نفرت کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور اس جنگ میں اس وقت بظاہر سکندر حیات اور ان کی یونینسٹ حکومت کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا لیکن اس دور میں دو اموات نے اس جنگ کا پانسہ مسلم لیگ اور قائداعظم کے حق میں پلٹ دیا۔

پہلی موت نواب سر شاہ نواز ممدوٹ کی تھی جو اُس وقت سر سکندر حیات کی ایما اور پشت پناہی کے ساتھ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے چنانچہ پہلی شخصیت جن سے 1942ء کے سال پنجاب کے مسلم معاشرے کو محروم ہونا پڑا یہی نواب سر شاہ نواز ممدوٹ ہے ان کی وفات کی تاریخ 28 مارچ 1942ء ہے اور اس موت کے ٹھیک نو ماہ بعد سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب 26 دسمبر 1942ء کو اللہ کو پیارے ہوئے۔

اس وقت پنجاب اسمبلی کے منجھے ہوئے پارلیمنٹرین دیوان چمن لال بھیم سین سچر' ماسٹر ہری سنگھ' ماسٹر کابل سنگھ' سوہن سنگھ جوش' تیجا سنگھ سوتنتر' اچھر سنگھ چھینہ یہ سب کے سب کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کانگرس کے ٹکٹ پر 1937ء کے انتخابات میں منتخب ہوئے تمام سکھ اراکین بنیادی طور پر ہندوستان کی خلاف قانون کمیونسٹ پارٹی کے رکن بھی تھے۔ اس زمانے میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے دروازے کسان سبھا ٹریڈ یونین کمیونسٹ پارٹی اور سوشلسٹ پارٹیوں کے اراکین کے لیے کھلے ہوئے تھے اور تو اور خود میاں افتخار الدین جو مسلم نشست سے کانگرس کے ٹکٹ پر یونینسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل سردار حبیب اللہ کو شکست دے

کر منتخب ہوئے تھے وہ بھی مارکسی افکار سے متاثر تھے۔ اور ہندوستان کی خلاف قانون کیمونسٹ پارٹی کے قریبی ساتھی تھے ادھر یونینسٹ پارٹی کے بنچوں پر سرکاری اراکین میں خاصے اہم پارلیمنٹرین تھے۔ جو اسمبلی میں اپنا موقف بیان کرنے اور قائل کرنے کی پوری اہلیت رکھتے تھے ان میں میر مقبول' نواب مشتاق احمد گورمانی' راجہ غضنفر علی خود وزیراعظم پنجاب سر سکندر حیات' سر چھوٹو رام' سر منوہر لال اور سندر سنگھ مجیٹھیہ جبکہ آزاد بنچوں پر بیٹھنے والوں میں میاں عبدالعزیز مالواڈیہ ملک برکت علی' مولوی مظہر علی اظہراور چودھری عبدالرحمٰن تھے یہ سب کے سب خاصے موثر پارلیمنٹرین مقرر تھے۔

جب سر سکندر حیات کی موت ہوئی تو سرکار دربار میں کہرام مچ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ سر سکندر حیات اپنی سب خوبیوں کے باوجود خاصی متنازعہ شخصیت تھے ہر وزیراعظم کے مقدر میں مقبولیت کے ساتھ غیر مقبولیت بھی ایک لازمہ ہوتی ہے لیکن یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان کا دور حقیقتاً ہنگاموں کا دور تھا جس میں مسلم لیگ کی مقبولیت کی راہیں ایک انداز میں استوار کرنے کی جدوجہد کا بھرپور طریقے سے آغاز ضرور ہو گیا۔

خضر حیات ٹوانہ

سکندر جناح پیکٹ کی خواہ کسی بھی طرح تشریح کی جائے اس زمانے میں یہ پیکٹ زبردست بحث کا موضوع بھی رہا اور خود ڈاکٹر اقبال جو اس وقت پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے انہوں نے اور ان کے ہم نواؤں نے اس پیکٹ پر شدید نکتہ چینی کی لیکن آخر اس پیکٹ ہی نے یونینسٹ پارٹی کی تدفین کا اہتمام کیا اور یہ سوچنے کی بات ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سکندر حیات کل ہند سطح پر مسلم لیگ کو تسلیم کرتے ہیں اور پنجاب میں اپنی پارٹی کی بالادستی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس تضاد کو ختم کرنے اور مسلم لیگ کی بالادستی منوانے کی جدوجہد میں انہی کا لخت جگر سردار شوکت حیات اگر ایک طرف ان کی موت کے بعد کارزار سیاست میں کودتا ہے تو اسی دور میں سر سکندر حیات کے ایک پارلیمانی سکریٹری اور اس کے یار غار احمد یار دولتانہ کا فرزند میاں ممتاز احمد خان دولتانہ بھی میدان میں اترتا ہے اور اسی یونینسٹ پارٹی کے ایک

اہم ستون نواب سر شاہ نواز ممدوٹ صدر پنجاب مسلم لیگ کی موت پر ان کے بڑے بیٹے نواب افتخار حسین ممدوٹ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت سنبھالتے ہیں اور وہ بھی یونینسٹ پارٹی کے خلاف پنجہ آزمائی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کیونکر ہوا اس کے پیچھے پنجاب کے مسلم زمیندار خانوادوں اور قبائل کی چپقلش صاف دکھائی دیتی ہے' بلکہ نہ صرف مسلم بلکہ سکھوں اور ہندو جاٹوں کے قائدین کی سیاسی اور سماجی سوچ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ کلید ہے جس کے ذریعے سردار شوکت حیات' میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نواب افتخار حسین ممدوٹ اور میاں افتخار الدین کی اس دور کی جدوجہد کو سمجھا جاسکتا ہے لیکن پہلے سر سکندر حیات کی موت اور خضر حیات ٹوانہ کے پنجاب کے نئے وزیر اعظم بننے کا قصہ پنجاب کے گورنر سر برٹرینڈ گلینسی کے مکتوب میں جو انہوں نے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو لکھا تھا۔

بصیغہ راز۔ ڈی۔ او نمبر 425

گورنمنٹ ہاؤس لاہور۔

2 جنوری 1942ء

اُمید ہے میرا 30 دسمبر 1941ء کا تار ڈیئر لنلتھگو نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا۔ جس میں میں نے اس بات پر اظہار خیال کیا تھا کہ سر سکندر کے انتقال کے بعد ان کا جانشین تلاش کرنے کی مجھے ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس ضمن میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیل نیچے درج کرتا ہوں۔

ابتداء ہی سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ صحیح معنوں میں صرف دو اُمیدوار ایسے ہیں جن کے دعوؤں پر غور کیا جاسکتا ہے۔ ایک خضر حیات ٹوانہ اور دوسرا سر فیروز خان نون یہ صحیح ہے کہ اور لوگوں نے بھی ہاتھ پیر مارے اور جوں جوں وقت گزرنے لگا سازشوں کی گرم بازی میں شدت پیدا ہونے لگی۔ کھٹڑوں کا دعویٰ یہ تھا کہ چونکہ سردار سکندر حیات کھٹڑ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا جانشین بھی کھٹڑ ہی ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ سردار سکندر حیات کے بڑے بھائی سردار لیاقت حیات اور ان کے قریبی رشتہ دار مظفر خان کا نام پیش کرتے تھے۔

سب سے پہلے میرے پاس وزیر خزانہ سر منوہر لال آئے اور کہنے لگے کہ میری اور

میاں عبدالحیٔ اور سردار بلدیو سنگھ کی متفقہ رائے ہے کہ خضر حیات سے بہتر آدمی کوئی نہیں۔ انہیں وزارت عظمیٰ سونپ دینی چاہیے۔ وزیر مال سر چھوٹو رام دورے پر گئے ہوئے تھے اس لیے ان سے فی الحال گفتگو نہیں ہو سکی۔ سر منوہر لال کا خیال تھا کہ باقی تمام امیدوار نہایت ادنیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور جس قدر جلد اس مسئلے کا تصفیہ کردیا جائے اتنا ہی اچھا ہے ورنہ سازشوں کا جال پھیلتا چلا جائے گا یہ سب کچھ پیر کے روز 28 دسمبر کو ہوا یعنی سر سکندر کی تجہیز و تکفین کے اگلے روز۔ میں نے کہا خضر حیات کی قابلیت کا بڑا معترف ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ چند روز اور انتظار کرلینا چاہیے تاکہ معلوم کر سکیں کہ خضر کو اپنی پارٹی کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو سکے گا یا نہیں۔ فیروز خان نون سے میری ایک طویل ملاقات ہوئی انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ وزارت عظمیٰ کے امیدوار نہیں ہیں۔ اس وقت وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ہیں اور وہاں سے ان کا الگ ہونا محال ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ پنجاب کے وزیراعظم بن جائیں تو اس صورت میں خضر حیات کو وزارت سے محروم ہونا پڑے گا کیونکہ خضر حیات اور فیروز خان نون دونوں ہی سرگودھا کے ایک قبیلے کی دو شاخوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کی آپس میں رشتہ داری بھی ہے۔ یوں بھی خضر حیات فیروز کے بڑے عزیز دوست بھی ہیں اور وہ ان کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتے۔

خضر حیات نے ابھی تک اپنے حامیوں کا الگ جتھا بنانے سے گریز کیا ہے اور اگر انہوں نے جتھا بنانے کی کوشش کی تو لوگ صبح و شام سودے بازی میں مصروف ہو جائیں گے کہ بتاؤ کیا دیتے اور کیا لیتے ہو۔

چھوٹو رام دورے سے واپس آئے تو میں ان سے 30 دسمبر کو ملا انہوں نے اپنے گزشتہ اخباری بیان کی تائید کی کہ وہ وزارت عظمیٰ کے اُمیدوار نہیں ہیں ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ سر سکندر نے دوبار یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان کے بعد چھوٹو رام کو پنجاب کا وزیراعظم بنایا جائے لیکن میں نے اُسی وقت کہہ دیا تھا کہ پنجاب کا وزیراعظم مسلمان ہی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ چھوٹو رام کا گروپ خضر کی پوری مدد کرے گا تاکہ یونینسٹ پارٹی قائم اور بحال رہے۔

آخر میں میں نے خضر حیات سے ملاقات کی انہوں نے کسی قسم کی رورعایت اور

تکلف سے کام نہیں لیا اور بالمشافہ کہا کہ اگر انہیں اس منصب جلیلہ کے لیے منتخب کیا گیا تو وہ پوری تن دہی سے کام کریں گے۔ ان کی رائے میں میاں فضل حسین کے بعد پنجاب کی وزارت عظمٰی کے صحیح معنوں میں صرف دو امیدوار تھے ایک فیروز اور دوسرے سکندر۔

"فیروز نے انگلستان میں ہائی کمشنر کا عہدہ قبول کر کے میدان خالی کر دیا اس کے بعد میں نے سر سکندر کی پوری نیک نیتی سے خدمت کی اور انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے ہرگز یہ اُمید نہیں تھی کہ سر سکندر کی ناگہانی موت سے مجھے یکایک ان کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا جائے گا۔ لیکن اب اس قسم کا موقع پیدا ہو گیا ہے تو مجھے قبول کرنے سے انکار نہیں' ہاں اگر آپ میرے علاوہ کسی اور مسلمان کو یہ منصب عطا کر دیں تو میں پورے خلوص سے اس کی خدمت کروں گا۔ صرف میں ہی نہیں پوری یونینسٹ پارٹی اس کی خدمت کو تیار ہو گی۔"

اسی روز شام کو میں مظفر خان سے ملا میں نے مختلف ذرائع سے سُنا کہ اگرچہ مظفر نے بعض لوگوں سے کہا ہے کہ وہ پنجاب کی وزارت عظمٰی کے اُمیدوار نہیں لیکن درپردہ انہیں پنجاب کی وزارت عظمٰی کی خواہش ضرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اگر ان کے ایک رشتہ دار لیاقت حیات کا کانٹا نکل جائے تو وہ یقیناً آگے بڑھ کر اپنا دعویٰ پیش کر دیں گے۔ بظاہر وہ کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کو ہر صورت میں قائم و دائم رہنا چاہیے اور بحیثیت مجموعی لیاقت ان کے خیال میں بہترین امیدوار ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں حال میں ہی پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر ہوا ہوں اور اپنے اس عہدے سے بالکل مطمئن ہوں اس سے زیادہ کی مجھے ہوس نہیں۔ بایں ہمہ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں زیادہ زور دیتا تو وہ یقیناً مان جاتا لیکن میں نے ایسا کرنا مناسب خیال نہیں کیا یوں بھی اس کی عمر تریسٹھ برس ہو چکی ہے اور میرے خیال میں وہ چند دن بھی کامیابی کے ساتھ نہیں گزار سکیں گے کیونکہ ماضی میں ان سے بعض ایسی حرکات سرزد ہو چکی ہیں جن سے ان کی پارٹی کے بہت سے ممبران ان سے ناراض ہیں اور ان کی قیادت میں کام کرنے کو قطعاً تیار نہیں۔ بہرحال مظفر نے مجھے یقین دلایا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کو قائم رکھنے کے پوری کوشش کرے گا اور جس شخص کو بھی میں لیڈر کی کرسی پر بٹھاؤں گا اس

کی اطاعت قبول کرے گا۔

میں لیاقت سے نہیں ملا اسے پنجاب سے نکلے بیس برس ہو گئے ہیں اور پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی ان کی پشت پہ نہیں ہیں۔ لیاقت کی تائید اور حمایت میں جو شخص زیادہ سرگرمی دکھا رہا ہے وہ ہمارا پُرانا دوست میر مقبول محمود ہے۔ مقبول سکندر کی اہلیہ کے بھائی ہیں اور ان کی بیٹی کی شادی حال ہی میں شوکت حیات سے ہوئی ہے۔ مقبول کی عام شہرت سخت خراب ہے اور انہیں پنجاب کا سب سے بڑا سازشی شخص سمجھا جاتا ہے چاروں طرف لوگ مجھے ہوشیار رہنے اور اس شخص کے ہتھکنڈوں سے بچنے کی تاکید کر رہے تھے کیونکہ لیاقت کی آڑ میں وہ اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس روز شام کو میں نے خضر کو بلایا اور کہا کہ میں نے آپ کو وزیراعظم مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ پارٹی کی اکثریت آپ کے ساتھ ہے۔ کیا آپ موجودہ کیبنٹ کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا اس میں کچھ تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ خضر نے صرف ایک شخص کے بارے میں کچھ شک و شبہ کا اظہار کیا اور وہ شک و شبہ صحیح تھا۔ چنانچہ شخص مذکورہ کے علاوہ کیبنٹ کے باقی تمام ممبر گورنمنٹ ہاؤس آئے انہوں نے خضر کے تقرر پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور اس کے تحت کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

میں نے کیبنٹ کے جملہ ارکان سے کہا کہ اگر وہ پسند کریں اور مناسب سمجھیں تو اپنی اپنی وزارت سے مستعفی ہو جائیں اس طرح وہ یہ ثابت کر سکیں گے کہ ان کو خضر حیات پر مکمل اعتماد ہے۔

چنانچہ انہوں نے استعفے لکھ کر میرے حوالے کر دیئے۔ اس کے فوراً بعد ان کا دوبارہ تقرر کر دیا گیا۔ جیسا کہ جناب کو معلوم ہے کہ اس بات کا اعلان اخباروں میں کر دیا گیا جو اگلے روز 31 دسمبر کی صبح کو تمام اخبارات میں چھپ گیا۔

اس اعلان کا بڑا خوشگوار اثر ہوا۔ جو امید ہے قائم رہے گا جو وزارت خالی ہوئی اس کے لیے آج کل بڑے زوروں سے رسہ کشی ہو رہی ہے پارلیمانی سکریٹری کی خالی آسامی پُر کرنے کے لیے بھی سفارشوں اور سازشوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں۔ مجھے

اُمید ہے کہ خضر اچھی طرح کام سنبھال لے گا۔ وہ ایک مضبوط دل ودماغ کا مالک شخص ہے اور محنت کرنے سے نہیں گھبراتا۔ سر سکندر کی بات اور تھی خضر میں اگرچہ اپنے پیش رو جیسا رکھ رکھاؤ نہیں ہے لیکن اس کی بھی تربیت خاصے معقول طریقے سے ہوئی اور اس میں اس لحاظ سے بہت ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ اُسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ کابینہ میں جو لوگ ہیں وہ عمر میں اس سے بڑے ہیں ان کا احترام بھی اس پر واجب ہے۔ میں نے پبلک میں تقریر کرتے ہوئے اُسے کبھی نہیں سنا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اچھا خاصا بول لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ ترقی کرے گا۔ اسمبلی میں جب وہ بولتا ہے تو اس کی تقریر میں خاصی روانی ہوتی ہے۔

سو یہ ہے جناب عالی پنجاب کی سیاست کی حالیہ روئیداد جو میں نے بیان کر دی ہے۔

تابعدار برٹرینڈ گلینسی

دانیال لطیفی

کمیونسٹ پارٹی کے قانونی جماعت بننے کے بعد پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل نو میں لاہور ضلع کے جنرل سکریٹری دانیال لطیفی منتخب ہوئے۔

دانیال لطیفی بمبئی کے ایک نامور بوڑھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خانوادہ اپنے علم وفضل کے لیے پورے علاقے میں بڑا نام رکھتا تھا۔ چنانچہ ان کے والد الما لطیفی اس صدی کے ابتدائی سالوں میں انڈین سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو کر پنجاب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس لحاظ سے وہ انڈین سول سروس کی پنجاب CADER سے متعلق رہے اور پنشن پانے تک پنجاب ہی میں رہے۔

الما لطیفی نے پنجاب کی صنعتی ترقی کے متعلق کئی ایک تصنیفات بھی رقم کیں۔

دانیال لطیفی اور ممتاز دولتانہ ہم جماعت تھے اور تعلیم سے فارغ ہو کر دونوں دوست قریب قریب ایک ہی وقت میں انگلستان سے واپس ہوئے۔ دانیال لطیفی انگلستان کے قیام کے دوران ہی برطانوی کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہو گئے تھے۔ 1939ء میں جب دانیال لطیفی واپس لوٹے تو پنجاب ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اس وقت ہندوستان میں

کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو خفیہ طور پر جاری کیا۔

ستمبر 1939 کو جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو کمیونسٹ پارٹی نے اسے سامراجی جنگ قرار دیا اور جنگ کے خلاف خفیہ طور پر لٹریچر کو عوام تک پہنچانا شروع کیا۔ انہی خفیہ سرگرمیوں میں مصروف دانیال کو خفیہ پولیس نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا اور آٹھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا۔

جیل میں دانیال لطیفی کی ملاقات اُن سیاسی رہنما قیدیوں سے ہوئی جو ستیہ گرہ تحریک میں گرفتار ہو کر جیل پہنچے تھے یہاں پر کانگرس کے میاں افتخار الدین اور کمیونسٹ پارٹی کے مظہر علی خاں اور اس کے بھائی محمود علی خاں سے ان کی گہری دوستی ہو گئی۔ جیل سے رہائی کے بعد دانیال زیادہ وقت لاہور میں گزارنے لگے خاص کر کے میاں افتخار الدین کے ساتھ۔ جب میاں محمود علی قصوری نے سول لبرٹیز کے مقدمات میں دلچسپی لینی شروع کی تو دانیال لطیفی کے ان کے ساتھ مراسم گہرے ہوئے۔

جب جرمنی نازی ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر کے جنگ کے کردار کو یکدم تبدیل کر دیا اور کمیونسٹ پارٹی نے اپنا نیا لائحہ عمل پرولتاری راستہ Prolitrian path چنا تو اس کی خفیہ تنظیم میں دانیال لطیفی نے نمایاں کردار ادا کیا۔

حکومت نے جب کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اٹھالی تو پنجاب کی کمیونسٹ پارٹی کے ضلعی جنرل سکریٹری کے لیے دانیال لطیفی سے بڑھ کو کون ہو سکتا تھا۔

یوم لینن

دانیال لطیفی نے 21 جنوری 1943 کو لاہور میں "یوم لینن" منانے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے ہوئے مجھے موجودہ صورتحال کے پیش نظر ایک مختصر ڈرامہ پیش کرنے کو کہا تو میں انکار نہ کرسکا چنانچہ لاہور میں کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر کو منتخب کیا گیا۔

لینن کی پوری زندگی محنت کش طبقہ کی زندگی سے وابستہ رہی۔ مزدوروں اور

مظلوموں کو سرمایہ داری کے خونیں چنگل سے چھڑانے کے لیے اس نے اپنی ہستی وقف کردی۔ اس نے روس کے اٹھارہ کروڑ انسانوں کو غلامی اور پستی سے نکال کر انقلاب اور آزادی کی بلند سطح پر کھڑا کردیا۔

سوویت روس کی موجودہ طاقت جس نے نازیوں کے چھکے چھڑا دیئے لینن کی محنت اور جانفشانی کی مرہون منت ہے۔ اسٹالین کی شخصیت اور عظمت لینن کی عملی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اسٹالین کہتا ہے "میں تو صرف لینن کا شاگرد ہوں اور اپنے کو اس کی شاگردی کے قابل بنانا چاہتا ہوں۔ لینن روس ہی کے نہیں بلکہ ہر جگہ کے مزدوروں کے مسائل اور حالات سے دلچسپی رکھتا تھا۔"

لینن محنت کش طبقہ کا سب سے بڑا آرگنائزر تھا۔ لینن نے بالشویک پارٹی کی تنظیم کی' اسے ترقی دی' مارکسٹ کی حمایت میں انتہائی کڑی جدوجہد میں عزم اور استقلال' ٹھوس تنظیم سخت اور ایک مجاہدانہ شان یہ چیزیں ابتدا ہی سے بالشویک پارٹی کی خصوصیات رہی ہیں۔ لینن کی رہنمائی میں بالشویک پارٹی کو تین انقلابوں کا تجربہ ہوا اور انقلاب نومبر 1917 میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ بالشویک پارٹی کے تجربات پر لینن نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی۔ لینن اس پارٹی کا متفقہ رہنما تھا۔

لینن جنگ اور سوشلسٹ انقلاب کے زمانے میں محض محنت کش عوام کا سب سے بڑا رہنما ہی نہیں تھا بلکہ وہ مارکس اور اینگلز کی تعلیمات کا بہت بڑا ماہر اور اپنے عہد کا بہت بڑا مفکر تھا۔ لینن نے جس بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی وہ آج دنیا کے ہر ملک میں عوام کی آزادی کی کوشش کر رہی ہے۔ لینن کی پارٹی سوویت یونین کی رہبری میں سامراج کے بدترین اور سب سے زیادہ بھیانک روپ فاشزم کے خلاف جنگ کر رہی ہے اور ایک آزاد اور بہتر سماج کے لیے کوشاں ہے۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا انقلابی لیڈر لینن 21 جنوری 1924ء کو اس دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ اسی حوالے سے کمیونسٹ پارٹی کے ضلعی سکریٹری دانیال لطیفی نے "یوم لینن" منانے کا فیصلہ کیا۔

21 جنوری 1942ء کو لاہور کی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں ایک سو کے قریب پارٹی ممبر اور پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے اکٹھے ہوئے۔ شام کو دفتر کی عمارت کی چھت پر باقاعدہ تقریب کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے دانیال لطیفی نے اعلان کیا کہ پارٹی

کے دو لاکھ روپے فنڈز کے لیے لاہور نے اپنے حصے کے پانچ ہزار روپے جمع کر لیے ہیں۔ اس اعلان کے سنتے ہی ہر طرف سے خوشی کے نعرے بلند ہوئے تو سکریٹری نے مزید بتایا کہ ابھی ہم پوری طرح مطمئن نہیں ہیں ہم پارٹی کے لیے اس سے بھی زیادہ رقم جمع کر سکتے ہیں اور انشاء اللہ جمع کریں گے۔ مالا بار اور آندھرا کی پارٹیوں کی مثال ہندوستان کے ہر کمیونسٹ کو زیادہ سے زیادہ قربانی دینے پر آمادہ کر رہی ہے۔ کامریڈ اقبال سنگھ ممبر مرکزی کمیٹی نے اپنی ساری جائیداد زیوارت میڈل غرض کہ کامریڈ کے پاس جو کچھ بھی تھا پارٹی کی نذر کر دیا ہے۔ ہمیں اپنی پارٹی کو مضبوط اور وطن کو آزاد کرانے کے لیے پرعزم ہونا ہے۔ ان اعلانات کے بعد میرا تحریر کردہ مختصر ناٹک One act play پیش کیا گیا جس میں لینن گراڈ کے بہادر سپاہیوں کی قربانی کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا تھا یہ یک بابی ناٹک یوں تھا کہ منظر کھلتے ہی۔

"ایک طرف پرجوش اور پُرعزم روسی فوج کے سپاہیوں کے بڑھتے ہوئے قدم دکھائے گئے تھے جبکہ دوسری طرف جاڑے سے ٹھٹھرے ہوئے جرمن سپاہیوں کو دکھایا گیا جنہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی آنکھیں لینن گراڈ کا محاصرہ توڑنے والے بہادر سپاہیوں کو دیکھ رہی ہیں اور ان کے کانوں میں ایک فاتح فوج کے سپاہیوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز گونج رہی ہے۔

یہ ناٹک اس خیال کی نشاندہی کر رہا تھا کہ جرمن فوج کی موت بالکل قریب ہے۔ بس پرعزم ارادے سے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔

اس مختصر یک بابی ناٹک کے بعد انقلابی گیت گائے گئے۔ آخر میں کامریڈ بھگت سنگھ بلگا نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا' ہمیں اپنے سوویت کے بہادر ساتھیوں کے زبردست انقلابی عزم کی تقلید کرنی چاہیے اور ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے تب ہی ہم لینن کے سچے پیروکار کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

انہوں نے مزید بتایا کہ ضلع جالندھر میں بھی پارٹی ممبروں نے اپنا پانچ ہزار روپے فنڈ کو ناپورا کر دیا ہے۔ یہ روپیہ کیسے جمع ہوا پارٹی کا ہر ممبر ضلع کے ایک ایک کسان کے پاس گیا تو کسی نے بھی ہماری پارٹی کو چندہ دینے سے انکار نہیں کیا۔ اختتام پر تمام کامریڈوں نے کھڑے ہو کر وہ قسم کھائی جو اسٹالین نے لینن کے مرنے کے بعد کھائی

تھی۔ اس قسم کے بعد بین الاقوامی ترانہ گایا گیا۔

آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگرس

مئی کے آخری ہفتہ میں کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگرس بمبئی میں منعقد ہوئی ہندوستان کمیونسٹ پارٹی پر 1934 میں پابندی عائد کی گئی تو اس وقت کمیونسٹوں کی تعداد صرف دو سو تھی۔ مگر ان دو سو نے سرخ جھنڈے کو مزدور طبقہ میں بڑی مضبوطی سے گاڑ دیا تھا۔ انہوں نے بڑی بڑی ہڑتالیں کرائیں اور عوامی ٹریڈ یونینیں قائم کیں جن کی بنیادیں عوامی جماعتوں کے ذریعے عوامی تنظیم پر تھیں۔ 1942ء میں پورے آٹھ سال بعد جب پارٹی سے پابندی اٹھائی گئی تو خفیہ طور پر کام کرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔

پارٹی سے پابندی اٹھ جانے کے بعد بھی کئی کمیونسٹ رہنما جیلوں میں قید تھے لیکن جیلوں کے باہر کمیونسٹوں نے مختلف طبقوں میں فعال کام کر کے فعال کارکنوں کو کمیونسٹ پارٹی میں شامل کیا۔ اس لیے چند ماہ کے اندر طالب علموں مزدوروں کسانوں اور محنت کشوں میں فعال کارکنوں کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہماری پارٹی کی نشوونما اور اس کی طاقت کا راز حب الوطنی کا وہ لافانی شعلہ تھا جس کی گرمی ہماری سیاسی پالیسی میں تھی۔ اس کا راز سنجیدہ اور سلجھی ہوئی حقیقت پرستی ہے جو مارکسٹ اور لیفنٹ اصولوں کو ماننے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے مسلسل عوام کی حب الوطنی کو ابھارا اور انہیں احساس دلایا کہ سامراجی بددماغی اور نوکرشاہی کی حماقتوں سے بچنے کا طریقہ صرف "عوام کا اتحاد" ہے۔ ہم نے کانگرس اور مسلم لیگ کے اتحاد کی پوری پوری کوشش جاری رکھی تاکہ قومی حفاظت کے لیے ایک قومی حکومت تشکیل دے سکیں۔

ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگرس میں تمام ہندوستان کے سولہ ہزار کارکنوں کے 139 نمائندے شریک ہوئے جن کا تعلق ہندوستانی قوم کے ہر طبقہ اور گروہ سے تھا۔ 139 مندوبین میں 86 کا تعلق اہل علم و دانش طبقہ سے تھا جب کہ 22 مندوب مزدوروں سے تھے جو ٹریڈ یونین تحریک اور تین لاکھ منظم مزدوں کے سیاسی رہنما تھے

جبکہ 35 کسان مندوبین پارٹی کے پانچ ہزار کسانوں کی نمائندگی کر رہے تھے اس طرح تین جاگیردار دو چھوٹے زمیندار اور ایک تاجر بھی مندوبین میں شامل تھے۔ اس کانگرس میں ہندوستان کی تمام اقلیتوں نے خاص کر کے شرکت کی جیساکہ مسلمان سکھ پارسی' عیسائی اور جینی۔ کانگرس میں 13 مندوب خواتین سات سو خواتین کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ ان سب مندوبین کے چہروں سے وطنی جدوجہد کا پورا ماضی جھلک رہا تھا۔

میں پنجاب کے مندوبین میں سب سے کم سن تھا۔ صرف بائیس برس کا نوجوان یا پھر پیرن بروچا جو پنجاب کی خواتین کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ پیرن بروچا گورنمنٹ کالج میں میری ہم جماعت تھی۔ وہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بروچا کی صاحبزادی تھی جس کی شادی بعد میں جواں سال کمیونسٹ ردیش چندرا سے ہوئی جو کمیونسٹ پارٹی کا میری طرح کل وقتی کارکن تھا۔ ردیش چندرا مشہور آئی سی ایس رام چندرا کا اکلوتا بیٹا تھا۔

پنجاب کے دوسرے مندوب ہمارے بزرگ تھے جیساکہ سوہن سنگھ بھکنہ جو 1913 کو امریکہ میں قائم ہونے والی غدر پارٹی کے صدر رہ چکے تھے۔ تیجا سنگھ سوتنتر جنھوں نے غدر پارٹی سے ہوتے ہوئے ترقی کی۔ فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل رہے۔ سوہن سنگھ جوش جو 21-1920 میں اکالی دل اور گردواروں کو ہندو مہنتوں سے آزاد کرانے کی تحریک سے ہوتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔ یہی سوہن سنگھ جوش تھے جنھوں نے 1926 میں پنجاب سے پہلا ترقی پسند آزاد رسالہ کرتی (آزادی) جاری کیا۔ اس کی ادارت میں فیروز دین منصور بھی شامل رہے جو ہجرت تحریک سے ہوتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی میں آ گئے۔

میرے لیے اس عمر میں ایسا تجربہ خاصا ہیجان خیز تھا۔ کہاں یہ ہستیاں اور پھر کہاں وہ مزدور رہنما جنھوں نے مزدوروں اور محنت کشوں کو منظم کیا اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی کانگرس کے کرتا دھرتا تھے جیساکہ کامریڈ ڈانگے جو آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کے صدر تھے اور پھر مہاراجکر اور ادھیکاری' یہ سب بیسویں صدی کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے بمبئی میں پہلی بار ٹریڈ یونین احتجاج کیا تھا جس میں سوویت یونین کے سوشلسٹ انقلاب کے رہنما لینن نے اپنے ہاتھ سے پیغام لکھ کر بھیجا۔ ڈانگے

نہ صرف ایک کامریڈ تھا بلکہ وہ دانشور اور نقاد بھی تھا۔ وہ مہاراشٹر ادب کے ایک نقاد کے طور پر بھی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ انہوں نے کیمونسٹ پارٹی کے ابتدائی دور میں مراٹھی اور انگریزی میں "گاندھی اور لینن" نام سے ایک کتاب شائع کی۔ ادھیکاری بھی اس زمانے میں برلن سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے۔

اس طرح اس کانگریس میں، میں پہلی بار پورے ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کے کارکنوں سے ملا، اور ان کا تعارف حاصل ہوا۔ کانگرس کے اختتام پر سجاد ظہیر نے مجھے بمبئی ہی میں رکنے اور پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" میں کام کرنے کے لیے کہا۔ میں چونکہ پارٹی کا کل وقتی کارکن تھا اس لیے انکار کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"قومی جنگ" کے مدیر اعلیٰ سجاد ظہیر جبکہ ان کے رفقا میں سبط حسن، اور سردار جعفری شامل تھے۔ پنجاب میں پارٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں میرے تبصرے اکثر "قومی جنگ" اور "پیپلز وار" میں نقل کیے جاتے۔ قائداعظم محمد علی جناح سے کیے گئے میرے انٹرویو نے خاصی تہلکہ خیزی مچائی، اس بنیاد پر سجاد ظہیر نے پنجاب کیمونسٹ پارٹی کے قائد سردار سوہن سنگھ جوش سے بھی کہا تھا کہ وہ عبداللہ ملک کو پنجاب سے شائع ہونے والے کیمونسٹ پارٹی کے اردو اخبار "جنگ آزادی" کے ادارتی عملے میں شرکت کی اجازت دیں۔ اب جبکہ میں پارٹی کی پہلی کانگرس میں پنجاب کی طرف سے ایک مندوب کی حیثیت سے شامل ہوا تو سجاد ظہیر نے مجھے "قومی جنگ" کے عملہ ادارت میں یہ کہہ کر شامل کر لیا کہ پنجاب کی سیاست پر لکھنے والا یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔



باب 9

بمبئی خوابوں کا شہر

بمبئی شہر اس وقت میرے ہی نہیں ہر اُس نوجوان کی خوابوں والی سرزمین تھی جو شہرت' دولت اور عزت کے خواب دیکھتے تھے۔ اس وقت بمبئی سیاسی ادبی اور ثقافتی مرکز کے طور پر ایک نئے دور میں داخل ہو رہا تھا۔ ویسے تو بندرگاہ کے طور پر بمبئی کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی لیکن یہ دور اس کی سیاسی اور ہندوستانی معاشرتی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کا مظہر تھا۔ یہاں پر مرہٹوں' گجراتیوں' تاملوں' ملیالوں' بنگالیوں' پٹھانوں اور پنجابیوں نے اپنی ایک پہچان بنالی تھی۔ میرے لیے بھی یہ ایک نئی دنیا تھی جس میں' میں مختلف ثقافتوں سے متعارف ہوا بلکہ مجھے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ اس لیے میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کیمونسٹ پارٹی کے لیے عزت اور توقیر تھی جس کی رکنیت نے مجھے وسعت نظری اور روشن خیالی دی۔ نئی نئی تہذیبوں اور نئے نئے رویوں کے جاننے کا موقع فراہم کیا۔

ہندوستان کیمونسٹ پارٹی نے اپنا ہیڈکوارٹر یونہی بمبئی شہر کو نہیں بنایا تھا۔ کیونکہ اس شہر میں اس کی جڑیں بڑی گہری تھیں۔ کیونکہ تمام کیمونسٹ لیڈروں نے خواہ وہ ڈانگے ہوں یا ادھیکاری' یا مہاراجکر یہ سب کے سب اس شہر کی بدولت مزدور لیڈر بنے تھے۔ اگرچہ ان سب کا تعلق مزدور طبقہ سے نہ تھا۔ یہ اعلیٰ طبقوں سے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے دوران ہی مارکسزم اور کیمونزم اور انقلاب روس سے متاثر ہو کر انھوں نے ہندوستان کے مزدوروں اور محنت کشوں کو منظم کیا۔

ہندوستان کیمونسٹ پارٹی کا ہیڈکوارٹر کھیت واڑی روڈ چوپاٹی قلعہ' بھنڈی بازار اور

چوپاٹی جانے والی سڑکوں کے چوراہے کی ایک بلڈنگ میں واقع تھا۔ گراؤنڈ فلور میں کتابوں کی دکان اور پریس تھا۔ پہلی منزل پر دس پندرہ کمرے پارٹی کے مختلف دفتروں کے لیے مخصوص تھے۔ سب سے بڑے کونے والا کمرہ میں پارٹی کے جنرل سیکریٹری پی سی جوشی بیٹھتے تھے۔ اس کے ساتھ والے کمرہ میں ادھیکاری جو کہ پارٹی کے چوٹی کے دانشور اور IdealoGue تھے۔ ان کے ساتھ پارٹی کے مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں کے ایڈیٹرز اور ادارتی عملے کے لوگ بیٹھتے تھے۔ سب کمروں کے درمیان میں استقبالیہ تھا۔ جہاں دفتر میں آنے والے مہمان بیٹھتے اور جن سے ملنا ہوتا اس سے ملاقات کرتے' سامنے کی قطار میں لائبریری اور ریفرنس سیکشن تھا جس کا انچارج منجھا ہوا کامریڈ تھا۔ دوسری منزل پر کچن اور ڈائننگ روم تھا۔ جس کی انچارج ایک ادھیڑ عمر کی مرہٹی خاتون تھی۔ ان کے بیٹے بھی پارٹی کے کل وقتی کارکن تھے۔ وہ بڑی شفیق خاتون تھیں اور ہر ایک کا فرداً فرداً خیال رکھتیں تھیں کچن میں اس کی مدد کے لیے دو نوجوان کارکن لڑکیاں بھی تھیں۔ ڈائننگ روم میں فرشی نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں دوپہر کی گھنٹی بجتے ہی تمام عملہ یہاں ایک ساتھ مل کر کھانا کھاتا۔ دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریاں جاری تھیں۔ گندم کی بجائے باجرے کی روٹی' سرخ مرچوں والی پتلی دال اور بھات چاول روز کا معمول تھا۔ آخر سجاد ظہیر نے شور مچا کر ہفتہ میں ایک دن گوشت یا شمالی ہندوستانی کھانے کے لیے مقرر کروا لیا۔ اس دن کھانا سجاد ظہیر کی بیگم رضیہ خود پکاتی تھی۔

اکیلا پنجابی

میں پورے عملے میں واحد پنجابی تھا۔ سب سے زیادہ یعنی پانچ کامریڈ یوپی کے تھے اور باقی دو دو تین تین کا تعلق مہاراشٹر' گجرات' اندھرا پردیش ملیالم' تامل اور بنگال سے تھا۔ بمبئی میں میری رہائش کا بندوبست دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ میں کر دیا گیا تھا۔ جہاں پر پہلے سے سبط حسن اور سردار جعفری موجود تھے۔ میں نے ان کے ساتھ ہی زمین پر اپنا بستر بچھا دیا۔ یہ فلیٹ اصل میں شاکر علی کا تھا جو اس وقت بمبئی کے آرٹ سکول میں زیر تعلیم تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک رامپوری دوست جس کا نام

"نواب" تھارہ رہا تھا۔ نواب فلموں کے چکر میں بمبئی آیا ہوا تھا۔۔۔اس طرح فلیٹ کے دو کمروں میں دو دو آدمی رہ رہے تھے جبکہ میرے آنے سے ایک کمرے کی تعداد تین ہوگئی۔ سبط حسن' سردار جعفری اور عبداللہ ملک۔

سبط حسن اور سردار جعفری مجھ سے بڑے تھے' دوسرا تہذیبی حوالے سے بھی ان دونوں کا گہرا ساتھ تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے زیادہ گھل مل نہ سکے۔ دوسرا ان کے اپنے ذاتی مشاغل اور دوستیوں کے معمول تھے۔ اس لیے میں بھی ان سے بے تکلف ہونے سے گریزاں رہا۔ میں بھی دفتر میں اپنے کام سے کام اور دفتر کے باہر اپنے آرام کے لیے ہر شام زیادہ آوارہ گردی کرنے لگا میں کبھی سمندر کی طرف نکل جاتا اور کبھی شہر کی بھیڑ میں گم ہو جاتا۔ اور فلیٹ پر صرف سونے کے لیے آتا۔

بمبئی میں سجاد ظہیر جسے ہم سب "بنے بھائی" کہتے تھے' وہ اور ان کی بیگم رضیہ نے جس طرح میری دیکھ بھال کی اس نے مجھے بمبئی ایسے اجنبی شہر اور ہر طرف مصروف انسانوں کی بھیڑ سے بھی مانوس کر دیا۔ ان کی محبت پیار اور شفقت نے مجھے اس قدر حوصلہ دیا کہ میں بمبئی کو اپنا گھر اور اس کے لوگوں کو اپنے خاندان کا فرد سمجھنے لگا۔ سجاد ظہیر ہر دوسرے تیسرے روز چھٹی کے بعد اپنے ساتھ گھر لے جاتے جہاں ہم کھانا وانا کھاتے اور گپ شپ لگاتے۔ ان نشستوں نے میری ذہنی کشادگی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ میں بڑی رہنمائی کی۔ ان کو بھی ہر لمحہ میرا احساس رہتا تھا۔

سجاد ظہیر اور ان کی بیوی رضیہ کے بعد بمبئی میں دوسری فیملی سعادت حسن منٹو اور ان کی بیگم صفیہ تھیں۔ جس نے بمبئی ایسے اجنبی شہر کو میرا اپنا گھر بنا دیا۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو سے میری ایک دو ملاقاتیں باری علیگ کے توسط سے لاہور میں ہوئی تھیں۔ سعادت حسن منٹو کو جب میرے متعلق معلوم ہوا کہ میں اس وقت بمبئی میں ہوں اور ان حالات اور مسائل سے دوچار ہوں تو وہ ایک روز مجھے ڈھونڈتے ہوئے فلیٹ پر پہنچے اور مجھ پر برسنے لگے کہ عجیب چغد آدمی ہو کہ ادھر بمبئی میں پہنچ کر بھی مجھے اطلاع نہیں دی۔ خیر انہوں نے کہا کہ اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور میرے ساتھ

میرے گھر چلو لیکن میں فلیٹ پر ہی رہنے کے لیے بضد تھا۔

سعادت حسن منٹو کے اس اصرار کا اثر سبط حسن اور سردار جعفری پر اس قدر ہوا کہ انہوں نے بھی میری طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ منٹو کا چونکہ تعلق پنجاب سے تھا اس لیے انہوں نے آخر مجھ سے یہ بات منوالی کہ میں ہر روز صبح کا ناشتہ ان کے ساتھ کیا کروں گا۔ اس لیے میں جب تک بمبئی میں رہا صبح کے ناشتے کے لیے منٹو کے گھر چلا جاتا وہاں ناشتے کے ساتھ روزانہ ہماری گپ شپ ہوتی اس طرح میری زندگی کی تنہائی میں رعنائی سی آگئی۔

پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" میں اب باقاعدگی سے پنجاب کی سیاسی سرگرمیوں کی خبروں اور ان کے تجزیوں کے ساتھ ساتھ میرے مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ خاص کر کے پنجاب کی کسان تحریک کی کوئی اہم خبر شائع ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ ان سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ میں نے سوویت یونین کی ریاستوں کے معاشی اور ثقافتی حوالے سے تعارفی مضامین شائع کیے۔

ہندوستان پر جاپانی حملوں نے جب شدت اختیار کر لی تو اس کے اثرات عوام پر بُری طرح سے مرتب ہونے شروع ہوئے۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ مجھے اطلاع کی گئی کہ آپ سے ایک مہمان ملنا چاہتے ہیں۔ جب میں نے ان سے مہمان کا نام پوچھا تو انہوں نے کہا۔ وہ اپنا نام نہیں بتاتے کہتے ہیں آپ عبداللہ کو بلوا دیجئے مجھے اس سے گھریلو بات کرنی ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مہمانوں سے ملنے کے لیے علیحدہ استقبالیہ تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو سعادت حسن منٹو کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ میری پریشانی اور حیرانی کو بھانپتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے کہا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں میں بالکل اپنے نجی کام سے آیا اور مجھے معلوم ہے اس وقت تم سے بہتر مجھے کوئی اور نہیں بتا سکے گا۔"

"فرمائیے؟"

بات یہ ہے جیسا کہ تم جانتے ہو جاپان مسلسل شہروں اور بندرگاہوں پر بمباری کر رہا ہے جس سے بے پناہ شہری ہلاک ہو رہے ہیں' میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں ایسی صورتحال میں جب زندگی کے بارے مایوسی' بے یقینی اور خوف اس قدر بڑھ جاتا ہے تو

انسان کی جبلی خواہشات میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ مجھے ہمہ تن خاموش پاکر سعادت حسن منٹو نے سوال کیا۔ "کچھ سمجھے؟" جواب دینے کی بجائے میں نے سوال کر دیا کہ منٹو صاحب کیسی جبلی خواہشات؟ یہ سن کر وہ سٹپٹا کر بولے۔ "جنسی خواہشات اور کیا" میں جاننا چاہتا ہوں کہ ایسی صورتحال میں لوگ کیا طریقہ کار اپناتے ہیں۔

یہ سن کر میں جھینپ گیا' اور بڑی مشکل سے یہ کہہ پایا کہ منٹو صاحب میں تو صحافی ہوں' میں آپ کو جاپانی حملے کے نتیجے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد اور تباہ ہونے والی عمارتوں کی گنتی اور اس سے مالی نقصان ہونے کا تخمینہ بتا سکتا ہوں۔ وہ تو میں کسی بھی اخبار میں پڑھ سکتا ہوں یہ کہہ کر سعادت حسن منٹو فوراً کھڑے ہو گئے اور کہا اچھا کل صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ فوراً دفتر کی سیڑھیاں اتر گئے۔

دوسرے روز صبح ناشتے کی میز پر سعادت حسن منٹو بول تو رہے تھے لیکن چہکار نہیں تھی۔ مجھے بھی اس بات کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ منٹو صاحب توقع لے کر میرے پاس آئے تھے اور وہ مایوس لوٹے تھے۔ یکدم منٹو نے پوچھا۔ "تو ہاں بھئی وہ تمہارے پبلشنگ ادارے کا کیا ہوا؟ میرا افسانوی مجموعہ کب شائع ہو رہا ہے؟"

موضوع کی تبدیلی نے مجھے اور حیرت میں ڈال دیا۔ میں اس کا بھی کوئی معقول جواب نہ دے پایا کیونکہ پارٹی کی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ رفیق اور اس کے ساتھ اشاعتی کاروبار سے میں بالکل بے تعلق ہو گیا تھا۔

رفیق جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میرے دادا کے سب سے چھوٹے بھائی جان محمد کا بڑا لڑکا تھا۔ وہ مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ ہم نے ایک ہی گھر میں آنکھ کھولی اس لیے میری اور اس کی دوستی اور رفاقت کی بنیاد ابتدا سے ہی پڑ گئی تھی۔ میٹرک کے بعد میرے دادا منشی نور الٰہی نے اپنے جاننے والے ایک چمڑے کے تاجر کے ہاں انہیں "منشی" کے طور پر ملازمت دلوائی۔ جہاں رفیق نے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ یار دوستوں میں سب سے زیادہ خرچ کرنے لگا۔ آخر ایک روز کمپنی نے اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر اُس پر "روپیہ غبن" کرنے کا مقدمہ دائر کر دیا۔ میرے دادا نے بڑی مشکل سے ایک بار رقم کی ادائیگی کے بعد انہیں اس الزام سے رہائی دلائی۔ کمپنی سے علیحدگی کے بعد رفیق کے مالی حالات خاصے بگڑ چکے تھے اس لیے دادا

جان نے اُس کی مالی اعانت کرنا شروع کر دی۔ رفیق نے اس مالی بحران سے نکلنے کی مقدور بھر کوشش کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر رفیق نے بمبئی جا کر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ میں نے بھی اس کی مالی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ اس منصوبے کے لیے بڑی رقم درکار تھی جس کا حصول ناممکن تھا چنانچہ رفیق نے لاہور میں ہی رہ کر مختلف چھوٹے چھوٹے کام شروع کر دیئے مثلاً معجون سازی' طلاء برائے قوت مردی' اس کے لیے اس نے دستی پمفلٹ اور اخبارات میں اشتہاری مہم بھی شروع کی جس نے اس کے لیے یہ کام نہایت منافع بخش اور عزت افروز بنا دیا۔

ادبستان

جہاں تک لاہور میں ہمارے خاندان کا نشرواشاعت اور تصنیف و تالیف سے تعلق ہے تو اس میں میرے دادا منشی نورالٰہی کے بھائی دوست محمد جو لاہور کی احمدی جماعت کے مبلغ تھے اس حوالے سے وہ لنڈن کی کنگ مسجد سے بھی منسلک رہے اور بعد میں وہ تمام عمر احمدی جماعت کے ہفتہ وار اخبار "پیغام صلح" سے وابستہ رہے۔ سب سے پہلے باقاعدہ نشرو اشاعت کا سلسلہ میرے دادا جان کی بہن کے بیٹے شیخ محمد اشرف نے کشمیری بازار میں شروع کیا۔

کشمیری بازار اس زمانے میں قرآن مجید کی نشرواشاعت اور اس کے تاجروں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس زمانے میں ملک محمد دین' ملک سراجدین' اللہ والے (ملک چنن دین) بڑے پبلشرز تھے۔ چنانچہ شیخ محمد اشرف نے بڑے چھوٹے پیمانے پر پہلے قرآن مجید اور دینی کتب کی تجارت کا کام شروع کیا۔ 1934ء میں جب مجلس احرار کی قادیانیوں کے خلاف تحریک نے زور پکڑا تو شیخ محمد اشرف نے پروفیسر مجید سے' جو اس زمانے میں "محکمہ دیہات سدھار" میں کام کرتے تھے۔ انگریزی میں قادیانیوں کے خلاف کتاب لکھوائی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد شیخ اشرف نے اسلامیہ کالج کے پرنسپل عبداللہ یوسف کے انگریزی ترجمہ قرآن کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح ہر مہینے ایک پارہ انگریزی میں ترجمہ کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا اور ایک پارے

کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ انگریزی میں قرآن کی طباعت شیخ محمد اشرف کے کاروبار کی وسعت کی بنیاد بنی اور بعد میں عالمی سطح پر اسلام پر انگریزی کتابوں کی اشاعت کا بہت بڑا ادارہ تسلیم کیا جانے لگا۔ شیخ ظفر احمد جو میرے دادا کے چھوٹے بھائی ملک غلام محمد کے بڑے لڑکے تھے، اپنے پھوپھی زاد بھائی شیخ اشرف کی پہلے شاگردی اختیار کی۔ اور کچھ عرصہ کے بعد اپنا الگ سے کاروبار شروع کر دیا۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے رفیق نے ملک سراجدین کی سفارش سے تاج کمپنی کی ایجنسی لے لی، لیکن یہ کام بھی زیادہ نہ چل سکا۔ اسی دوران میرے دادا نورالٰہی وفات پا گئے۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بن گیا۔ اور پارٹی کے ہفتہ وار "جنگ آزادی" میں کام کرنے لگا۔

چنانچہ میں نے رفیق کو ایک پبلشنگ ہاؤس بنانے کا مشورہ دیا۔ رفیق نے مجھ سے اتفاق کیا چنانچہ میں نے چینیاں والی مسجد کے پہلو میں اپنی والدہ کے نام والے مکان کو جو دادی جان نے میرے والد کی وفات کے بعد خرید کر دیا تھا، کاروبار کے سلسلے میں والدہ کو یہ مکان فروخت کرنے پر مجبور کیا۔

مکان کی فروخت کے بعد میں نے رفیق کو پبلشنگ کے کاروبار کے لیے پانچ ہزار روپے دیئے۔ اس پبلشنگ ہاؤس کا نام "ادبستان" تجویز کیا جو کہ آلہ آباد میں اس وقت کے مشہور اشاعت گھر "کتابستان" کی طرز پر تھا۔

ادبستان کی سب سے پہلی کتاب جو شائع کی گئی وہ "1941ء کی بہترین نظمیں" تھیں جن کا انتخاب الطاف گوہر نے حلقہ ارباب ذوق کی تنقیدی نشستوں میں پڑھی گئی نظموں سے کیا تھا۔ الطاف گوہر اس وقت جنازگاہ کے قریب رہائش رکھتا تھا۔ "ادبستان" کی دوسری کتاب قائداعظم کی تقریروں کا مجموعہ تھا جس کا جمیل احمد نے اردو میں ترجمہ اور انتخاب کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ کتاب شیخ محمد اشرف انگریزی میں شائع کر چکے تھے۔ ان دو کتابوں کی اشاعت کے بعد سعادت حسن منٹو سے ان کا افسانوں کا مجموعہ شائع کرنے کا معاہدہ ڈیڑھ سو روپے میں طے پایا۔ ہم نے منٹو کو یہ روپے بھجوا دیئے تھے اس کے ساتھ سید عبداللہ کا ڈی لٹ کا مقالہ اشاعت کے لیے ان سے حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد میں چونکہ کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن تھا اس لیے پارٹی کے لیے مجھے دن رات کام کرنا پڑا جس کی وجہ سے میرا رفیق کے ساتھ قریب قریب تعلق

قطع ہو گیا تھا۔ جب مجھے بمبئی میں پارٹی کے لیے کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تو میرا رابطہ خاندان والوں سے تو کیا گھر والوں سے بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز ناشتہ کی میز پر سعادت حسن منٹو کے اچانک اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ مجھ سے کوئی معقول جواب نہ بن پا رہا تھا۔ اس الجھن میں دیکھتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے کہا اچھا چھوڑو سب باتوں کو تم پہلے ناشتہ کرو۔

اس روز ناشتہ پر بہت کم باتیں ہوئیں میں بھی جلد لوٹ آیا۔ دفتر میں البتہ سارا دن سعادت حسن منٹو کے بارے میں چرچا رہا۔ جو صرف منٹو کی افسانہ' ڈرامہ اور فلم نگاری تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس کی خوش شکلی اور خوش لباسی بھی موضوع بنی۔ منٹو ان سب معاملات میں بڑا ذمہ دار واقع ہوا تھا۔

سیاست اور ادب

بمبئی میں' میں سیاسی جلسوں کے علاوہ ادبی نشستوں میں بھی باقاعدہ حاضری دینے لگا۔ خاص طور پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس میں سجاد ظہیر خود مجھے اپنے ساتھ لے جاتے جہاں نہ صرف ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں سے راہ و رسم بڑھی بلکہ ان کی تحریروں کو پڑھنے سننے اور پرکھنے کا شعور بھی اجاگر ہوا۔

24/25 مئی کو دو روزہ کل ہند ترقی پسند مصنفین کا چوتھا اجلاس تھا۔ اس کانفرنس نے بھی مجھ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس کانفرنس میں مجھے ایک بار پھر ہندوستان کے مختلف حصوں سے مختلف زبانوں میں لکھنے والے ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا جیسا کہ جوش ملیح آبادی' ساغر نظامی' کرشن چندر' مخدوم محی الدین' اسماعیل ذبیح' ہندی کے ادیبوں میں نریندر شرما' امرت رائے (منشی پریم چند کے بیٹے) ایڈیٹر ہنس" اس کے علاوہ گجراتی اور مرہٹی کے مشہور ادیب جو بمبئی میں ہی رہتے تھے۔

جوش ملیح آبادی نے اردو' سرجیو بھائی سنہا نے گجراتی' مسٹر دھرم راگو نے تلگو' پروفیسر جاگیردار نے کناری مسٹر ستند راناتھ مرندار نے بنگالی اور کامریڈ ڈانگے نے مرہٹی زبان کی نمائندگی کی۔ اس ادبی اجتماع کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہمارا ملک اس کی آزادی اس کی تہذیب و تمدن بہت بڑے خطرے میں تھا اس کا اثر ہمارے

ادیبوں پر پڑنا لازم تھا۔ کوئی ادیب جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہنا چاہتا تھا۔ اس حقیقت سے کیسے آنکھیں چرا سکتا تھا کہ فاشزم کی مہلک وباء ہمارے ملک کی سرحدوں تک پھیل چکی تھی۔ اس خطرے سے ملک کو آگاہ کرنے کے لیے ملک کو متحد اور آزاد کرنے کے لیے قوم کو وطن کی حفاظت کے لیے آمادہ کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ادیب بھی متحد و منظم ہوں۔

کانفرنس کا سب سے دلچسپ قابل غور اور پُر مغز کامریڈ ڈانگے کا صدارتی خطبہ تھا۔ کامریڈ ڈانگے ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کے بانیوں میں سے تھے ان کی ساری زندگی مزدوروں کی جدوجہد میں حصہ لیتے ہوئے اور مزدوروں اور کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں گزری تھی اس کانفرنس میں انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ ایک ادبی نقاد اور عالم بھی ہیں۔

کامریڈ ڈانگے نے مرہٹی ادب کی ابتداء عروج اور زوال اور اس کی موجودہ حالت کی تاریخ بتاتے ہوئے ان اسباب پر روشنی ڈالی' جس کی وجہ سے جدید مرہٹی ادیب عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے دور ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ قدیم مرہٹی ادب کا بہترین دور وہ تھا جب مرہٹی شاعر مہاراشٹر کے غریب کسانوں اور عام لوگوں کے احساسات کی ترجمانی کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ یہ ترجمانی مذہبی گیتوں اور نغموں کے ذریعے ہوتی تھی لیکن اس زمانہ میں سماجی جذبات کے اظہار کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ لیکن جب پیشواؤں کے زمانے میں ادیب امراء کی محفلوں کی زینت بن گئے تو مرہٹی ادب کا بھی زوال ہو گیا۔ موجودہ دور میں بہت سے ترقی پسند ادیب اپنے آپ کو مزدور طبقہ اور اس کے ترقی پسند سوشلسٹ نعرہ کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ وہ مزدوروں اور ان کی جدوجہد کے متعلق ——— ناول اور افسانے بھی لکھتے ہیں تو وہ اصلیت سے مبرا ہوتے ہیں اور ان پر ایک غیر حقیقی رومانیت غالب رہتی ہے۔ لیکن اب مرہٹی ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ خود مزدور طبقہ سے شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک مرہٹی مزدور شاعر نے حال میں "اسٹالن گراڈ" کے متعلق ایک طویل نظم لکھی ہے۔ جو قدیم "پواڑے" کی طرز پر ہے۔ یہ پواڑے (چاربیت) کئی صدیوں پہلے مرہٹی عوام کے رزمیہ گیت ہوتے تھے۔ آج پھر نئی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔

ڈانگے نے جدید دور کے ادیبوں سے کہا کہ وہ ایسی صورت میں "سوہان روح" اور "ذہنی جمود" سے نجات پا سکتے ہیں اگر وہ قوم کی موجودہ ضروریات کے پیش نظر عوام کی اس عظیم جدوجہد سے منسلک ہو جائیں جو وہ اتحاد اور وطن کی حفاظت کے لیے کر رہے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ایسا کر کے سوویت اور چینی ادیبوں کی طرح وہ اپنی قوم کو روحانی اعتبار سے مالا مال کریں تاکہ ہماری آزادی کا دن نزدیک سے نزدیک تر آ جائے۔

جوش ملیح آبادی کا خطبہ صدارت نہایت مختصر اور خالصتاً ادبی تھا۔ انہوں نے ان لوگوں سے اختلاف کرتے ہوئے کہا جو شاعروں کو بعض مضامین کے لیے پابند کرتے ہیں وہ اسی قسم کی غلطی کرتے ہیں جس طرح کسی کو طرح مصرعہ دے کر "غزل" کہنے کو کہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مقصد سچا اور بلند ہو تو شاعر ضرور اس کی طرف کھنچے گا۔ ترقی پسند مصنفین کا نصب العین یقیناً ایسا ہے کہ تمام سچے ادیب اور شاعر لامحالہ اسے قبول کریں گے۔ کانفرنس کی سب سے اہم قرارداد وہ تھی جس میں ترقی پسند مصنفین کے مقاصد اور فرائض بیان کیے گئے تھے۔ یہ بیان مختلف مکتب خیال کے لوگوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ اس لیے اسے بالاتفاق رائے منظور کیا گیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ:۔

"ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین جن کو رابندر ناتھ ٹیگور اور اقبال کی انسانیت دوست اور آزادی پسند روایات ترکہ میں ملی ہیں آج خود اپنی قوم اور دنیا کی تمام دوسری قوموں کو سامراج اور فاشزم کے خطرے سے بچانے کا تہیہ کرتے ہیں' ہم روسی اور چینی مصنفین کے مداح ہیں جو آج فاشسٹ گروہ کے خلاف ایک سخت جنگ میں اپنی بہادر قوم کے شانہ بشانہ مصیبت اور پریشانی جھیل رہے ہیں اور فخر کے ساتھ سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور جو تاریکی کے زمانے میں بھی ادب و فن کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ ہم بھی ان سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ ہم اپنی قوم کو آزادی اور اتحاد کا پیغام پہنچانے کی ان تھک کوشش کریں گے اور اس میں یہ اعتماد پیدا کریں گے کہ وہ بہت بڑی قوت کی حامل ہے۔ آج ترقی پسندی کا اس کے سوا اور کوئی مفہوم نہیں۔ جب خود انسانی سماج کی بنیادیں اور ہمارے مستقبل کے مٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے جب رجعت پسند فاشزم زندگی کی ہر اچھی نفیس اور خوبصورت چیز کو مٹانے کی

پوری کوشش کر رہی ہے اور جب رجعت پسند سامراجی گروہ ہماری آزادی اور ہماری قوم کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں ترقی پسندوں کا فرض ہے کہ تمام لوگوں کو امید اور آزادی کا پیغام سنائیں اور اعلان کریں کہ ایک ایسی قوم جو آزادی کے لیے متحد ہو جاتی ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

اس اصولی تشریح کے بعد اس اعلان نامہ میں کہا گیا تھا کہ ان مقاصد کے پیش نظر انجمن ترقی پسند مصنفین کو مندرجہ ذیل خاص کام سرانجام دینے چاہئیں۔

1۔ ایسی کہانیاں، نظمیں اور گیت لکھے جائیں جن میں سامراجی جوئے سے نجات حاصل کرنے اور جاپانی حملے سے اپنے ملک کو بچانے کے لیے قومی اتحاد پر زور دیا جائے۔

2۔ غیر ملکی زبانوں کے ترقی پسند اور خاص کر روس اور چین کے حالیہ ادب کا ترجمہ اور اشاعت کی جائے۔

3۔ مقررہ وقت پر ہندوستان کی مختلف زبانوں کی نمایاں تصانیف کو انگریزی میں مجموعہ کی شکل میں شائع کیا جائے۔

4۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترقی پسند ادب کے رسالے اور مجموعے شائع کیئے جائیں۔

5۔ مزدوروں اور کسانوں میں ادبی اور تہذیبی حلقے قائم کیے جائیں (مشاعرے، گانے کی محفلیں) اور انجمن ترقی پسند مصنفین اور عوامی ادب و فنون لطیفہ میں ربط پیدا کیا جائے۔

6۔ ہندوستانی عوامی تھیٹر کی انجمن سے تعاون کیا جائے، فلمی دنیا میں بھی ترقی پسندی کو رواج دیا جائے گا۔

ایک قرارداد میں قومی رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کیا جبکہ ایک قرارداد میں ان ترقی پسند مصنفین کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا جو ڈیفنس اف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار تھے جیسا کہ سید مطلبی فرید آبادی شیومان سنگھ چوہان اور ٹیکارام سخن جنہوں نے اردو ہندی ادب میں ہمیشہ فاشزم کے خلاف لکھا۔

کانفرنس کے اختتام پر نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا تو انجمن ترقی پسند مصنفین

کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر اور جوائنٹ سکریٹری خواجہ احمد عباس منتخب ہوئے۔

کانفرنس کی طرف سے بمبئی کے ایک بہت بڑے تھیٹر میں مشاعرہ ہوا جس میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین امین حزیں، سردار جعفری کے علاوہ متعدد مقامی شعراء نے کلام سنایا جسے سُن کر عوام نے واہ واہ کے تعریفی ڈونگرے نہیں برسائے بلکہ انقلاب زندہ باد، فاشزم مردہ باد اور آزاد ہندوستان زندہ باد کے فلک شگاف نعرے گونجتے رہے جسے سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک عوام کی تحریک نہیں تھی۔

ادبی کانفرنس کے ساتھ "عوامی تھیٹر" نے بھی اپنی کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد ہندوستانی اسٹیج پر ایسے ناٹک کھیلے اور سوانگ تمثیل اور نوٹنکی (میوزیکل تھیٹر) کے وسائل سے عوام کی زندگی کی ایسی سچی تصویر ان کے سامنے پیش کرے کہ وہ زندگی کے مسائل کو سمجھ پاسکیں اور اس کے حل کے لیے عملی قدم اٹھانے کے لیے آمادہ ہوں۔

عوامی تھیٹر کی اس کانفرنس میں بمبئی کے علاوہ بنگال پنجاب اور مالا بار میں عوامی تھیٹر کی تحریک کا جائزہ لے کر ایک مرکزی عوامی تھیٹر کی بنیاد رکھی جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس تحریک کی رہنمائی کرے گی۔ اس طرح کامریڈ انیل ڈی سلوا ہندوستانی عوامی تھیٹر کی جنرل سیکریٹری چنی گئیں۔ اس کانفرنس میں ون ایکٹ پلے اسٹیج کیے گئے خاص طور پر خواجہ احمد عباس کا ڈرامہ "یامرت" اور چینی کمیونسٹ مصنفہ ٹنگ لنگ کا جاپانی دشمن بہت پسند کیے گئے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کی طرح عوامی تھیٹر کی تحریک بھی آزادی اور فاشسٹ دشمن جذبات سے لبریز تھی۔ اس طرح ہندوستان میں ادبی اور فنی زندگی میں ایک نئے عوامی دور کا آغاز ہوا۔ جولائی تک دوسری جنگ عظیم کے بادل ہندوستان کی سرحدوں پر بہت گہرے ہوگئے تھے اسی ماہ "قومی جنگ" اور "پیپلز وار" بمبئی نے اپنی اشاعت کا ایک سال مکمل کیا۔

اس ایک سال میں کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبارات نے محب وطن سیاسی جماعتوں کے نفاق کی جگہ اتفاق پر زور دیا گذشتہ سال کانگرس ایسی سیاسی جماعت کو غیر قانونی قرار دے کر کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاری سے فائدہ اٹھا کر پانچویں دستے (ففتھ

کالمسٹ) نے توڑ پھوڑ کی جو تحریک چلانی چاہی تو ہم نے کانگرس کے محبان وطن کو یہ بات یاد دلائی کہ کانگرسی رہنما ملک کی حفاظت کے حامی ہیں اور یہ توڑ پھوڑ کرنے والے پانچویں دستے (ففتھ کالمسٹ) کے لوگ ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ فارورڈ بلاک والے اور کانگرسی سوشلسٹ ہندوستانی عوام کی برطانیہ دشمنی سے فائدہ اٹھا کر جنگی محاذ میں خلل ڈالتے ابتری پھیلاتے اور اس طرح جاپانی حملہ آوروں کی مدد کرتے ہیں۔ جب غذا کی قلت ہوئی تو ہم نے صرف نوکر شاہی کو بُرا بھلا کہنے پر اکتفا نہیں کیا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے بلکہ ہم نے لوگوں کو سمجھایا کہ اگر وہ سچ مچ متحد ہو جائیں تو نوکر شاہی کچھ نہ کچھ تو کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ لیکن ففتھ کالمسٹوں کی باتوں میں آکر مشتعل محبان وطن نے مزدوروں کو ہڑتال کی ترغیب دی۔ ان کا خیال تھا برطانوی حکومت گھٹنے ٹیک دے گی لیکن ہم نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ اپنے کاموں میں لگے رہیں چنانچہ پیداوار پر ففتھ کالمسٹوں کا یہ حملہ بھی ناکام رہا اور پھر جب پیداواری بحران بڑھا تو ہم نے مزدوروں سے کہا کہ پیداوار بڑھانا ہی ان کا وطنی فریضہ ہے کیونکہ ہماری سرحدوں کی حفاظت کرنے والی فوجوں شہروں اور گاؤں میں بسنے والے کروڑوں انسانوں کو ہر ہر قسم کے سامان کی ضرورت ہے۔

ہم نے اپنے خیالات کی تبلیغ صرف "قومی جنگ" کے ذریعہ نہیں کی بلکہ ان نعروں کی بنیاد پر ایک عوامی تحریک منظم کی۔۔۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے اتحاد کے امکانات روشن ہوئے۔ کانگرسیوں کی ایک بڑی تعداد نے حق خود اختیاری کو تسلیم کیا۔ ہم قومی اتحاد کے بالکل قریب ہی نہیں پہنچ چکے تھے بلکہ یہ اتحاد ہماری آنکھوں کے سامنے عملی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ مزدور کسان عورتیں طلبا حتیٰ کہ بچے تک متحد ہو رہے تھے۔ ایک نیا ہندوستان جنم لے رہا تھا۔ جو ماضی کی چھوٹی چھوٹی فرقہ بندیوں سے آزاد ہو کر قومی اتحاد کے لیے راستہ صاف کر رہا تھا تاکہ ملت کی حفاظت ہو سکے اور ملک آزاد ہو جائے یہ کمیونسٹ پارٹی کی آواز تھی۔

اس لیے ہم نے 9 اگست 1943 کو امن قائم رکھنے کی عوام سے اپیل کی کیونکہ انڈین نیشنل کانگرس کی مرکزی رہنما جماعت (سنٹرل ڈائریکٹ کانگرس سوشلسٹ پارٹی کا روپوش مرکز) نے ایک پروگرام شائع کیا کہ ایک ہزار آدمیوں کا ایک ستیہ گرہی جتھا جو

تمام صوبوں کے جتھوں سے مل کر بنایا جائے گا۔ گاندھی جی کے قید خانے کی طرف مارچ کرے گا۔ اس طرح مقامی طور پر پوسٹروں اور جھنڈوں کو لے کر جتھے نکلیں گے جن کا رُخ پونا کی طرف ہو گا۔ وہ اس وقت تک مارچ کرتے رہیں گے جب تک وہ پونا پہنچ نہ پائیں۔ یا گرفتار نہ ہو جائیں نیز اس دن عام ہڑتال اور طلباء کے لیے تین دن کی ہڑتال کا پروگرام بنایا گیا۔ اس دن تمام عمارتوں پر قومی جھنڈے لگائے جائیں گے اور ہر جگہ سے جلوس نکالیں اور جلسے منعقد کریں ہندوستان کیمونسٹ پارٹی نے اس عیارانہ پروگرام کی تباہ کن اور شیطانی اصلیت کو بے نقاب کرتے ہوئے عوام سے اپیل کی وہ ان ففتھ کالمسٹوں کے سیاسی ہتھکنڈوں سے باز رہیں اور انہیں 9 اگست کو عوام کے خون سے ہولی نہ کھیلنے دیں۔

سبھاش چندر بوس بھی برلن سے سنگاپور پہنچ چکا تھا۔ 2 جولائی کو بوس نے خود ریڈیو پر اعلان کیا کہ اسے ہندوستان کی آزادی دلانے والی فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ جاپانی حملہ آوروں کی ہمراہی میں ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس طرح ان حالات میں 9 اگست کا دن منانا ہندوستانی قوم کی خودکشی کے مترادف ہو گا۔

بمبئی ایسے کٹر کانگرسی صوبے میں ففتھ کالمسٹ "ستیہ گرہ" اور توڑ پھوڑ کی باتیں کرتے تھے جبکہ پنجاب میں ان کی دہشت گردی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ 12 جولائی کے قریب سارے لاہور کی دیواروں پر دستی اشتہارات لگائے گئے۔ جن میں کہا گیا تھا "اگر تم خوددار اور غیرتمند ہو اور اپنے ملک سے محبت کرتے ہو تو 9 اگست سے پہلے ہر انگریز کو قتل کر دو۔" انگریزو ہندوستان سے نکل جاؤ' انگریز اپنے ہاتھوں سے اختیارات نہیں دینا نہیں چاہتے 8 اگست سے پہلے ہر انگریز کو مار ڈالو۔

9 اگست کے دن ففتھ کالمسٹوں کی اشتعال انگیزی اور متشدد احتجاج اور اجتماعوں کے پیش نظر مقامی کیمونسٹ پارٹی نے اس دن سے نمٹنے کے لیے ایک میٹنگ کی کال دی۔ یہ میٹنگ کیمونسٹ پارٹی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی بجائے دوسری عمارت میں ہوئی۔ یہ عمارت تین چار منزلہ مرکزی دفتر کے قریب ہی تھی۔

دراصل یہ عمارت ہندوستان کیمونسٹ پارٹی کے بمبئی میں گیسٹ ہاؤس اور اکیڈمی

کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

یہاں پر مقامی اور باہر سے آنے والے پارٹی کے کارکن اپنے تنظیمی امور پر میٹنگ کرتے اس کے علاوہ یہاں پر پارٹی کے کارکن اور رہنما پارٹی کی تعلیم و تربیت کے کورس مکمل کرتے تھے۔

اُس روز مقامی پارٹی یعنی بمبئی شہر کے تمام کل اور جز وقتی کارکن کامریڈ جس میں مزدور اور طالب علم کارکن بھی تھے۔ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس میٹنگ میں آئے۔ آخر متفقہ طور پر طے پایا کہ جہاں جہاں پارٹی کے مضبوط مرکز ہیں اور وہاں حملوں کا خدشہ ہے۔ وہاں پر مختلف ٹیمیں بنا کر حفاظت کی جائے۔ سب سے حساس جگہ پارٹی کا ہیڈ کوارٹر اور گیسٹ ہاؤس کی عمارت تھی۔ چنانچہ اس کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط' جاندار اور دلیر دستہ ترتیب دیا گیا اور اس کے ذمہ ہیڈ کوارٹر اور گیسٹ ہاؤس کے درمیان مسلح پہرہ داری تھا۔ اس دستے میں شامل کیے گئے کامریڈوں میں سب سے پہلے میرا نام پکارا گیا۔ نوجوان تو میں تھا ہی اور بھی بہت سے نوجوان تھے۔ لیکن میرا انتخاب اس لیے ہوا کہ میں پنجابی تھا اور ان سب کی ایک پنجابی کے متعلق یہی رائے تھی کہ پنجابی اور کچھ ہو نہ ہو لڑنے مرنے میں سب سے آگے ہوتا ہے۔ مجھے اس بات نے بھی بڑا حوصلہ دیا۔

اس طرح ہم دس پندرہ نوجوانوں نے جن کا تعلق مختلف صوبوں سے تھا۔ لٹھیں لے کر 8 اگست کی رات سے لے کر 9 اگست کی رات تک پہرہ دیا۔ ہم دو دو تین تین گشت کرتے ہوئے ایک عمارت سے دوسری عمارت تک پہنچتے۔ وہاں گپ شپ لگاتے چائے پیتے ایک دوسرے پر لٹھوں کا وار کرتے اور وار روکتے ہنستے کھیلتے پھر گشت کے لیے چل پڑتے۔ پُلسیئے ہونے کا ہم پر کسی کو شک نہ تھا۔ البتہ بعض لوگ ہمیں سکاؤٹ سمجھتے تھے اور ہماری خدمت خلق کے جذبے کی داد دیتے محسوس ہوتے تھے۔ 9 اگست کو بمبئی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔ ایک تو یہ علاقہ شہری آبادی کا کمرشل ایریا تھا۔ دوسرا پولیس کی بھاری نفری ہر طرف پھیلی ہوتی تھی البتہ فیکٹری ایریا جہاں مزدوروں کو ہڑتال کے لیے اکسایا گیا تھا۔ وہاں پر معمولی جھڑپیں اور معمولی قسم کے ناخوشگوار واقعے رونما ہوئے جبکہ زیادہ تر شہر میں امن وامان رہا۔ زبردست سیاسی

کشیدگی میں امن و امان قائم رکھنے اور اپنے نظریات کا پرچار کے لیے کیمونسٹ کارکنوں نے اپنا فعال کردار ادا کیا۔ یہ سب اُس تعلیم و تربیت کا حصہ تھا جو کیمونسٹ پارٹی کے کارکنوں کو باقاعدگی سے دی جاتی ہے کیونکہ کیمونسٹ پارٹی میں کارکنوں کی تربیت اور سیاسی تعلیم کا ایک وسیع انتظام ہوتا تھا۔ جس میں انسانی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار غلامی سے لے کر سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے سوشلزم تک کے ارتقاء کا تجزیاتی مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ جس میں غلامی دور میں سماجی ڈھانچے اور غلامی کے بعد جاگیردانہ دور میں سماجی تبدیلیوں پر بحث کی جاتی ہے تاکہ معلوم ہو کہ ان سماجی تبدیلیوں میں سوشلزم اور کیمونزم کس طرح پھلتا پھولتا ہے۔ ہمارے سامنے سوویت یونین کے مختلف اداروں کا کام مثالی اہمیت کا حامل تھا۔ جبکہ اقتصادیات کے بارے میں یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ کس طرح سرمایہ داری نظام میں بحران آتے ہیں اور کس طرح آخر میں مزدور کا تضاد اور طبقاتی جنگ رونما ہوتی ہے اور پھر سرمایہ داری نظام بڑھ کر کس طرح سامراج میں تبدیل ہوتا ہے۔

ففتھ کالمسٹ

9 اگست 1943 کو امن قائم رکھنے کے لیے ہم نے سب سے زیادہ کانگرسی محبان وطن کو پانچویں دستے یعنی ففتھ کالمسٹ کی سازشوں اور ان کے گھناؤنے منصوبوں سے آگاہ کیا تو عوام نے پانچویں دستے کے متعلق کئی سوالات اٹھائے چنانچہ قومی جنگ میں "ہم پانچواں دستہ کسے کہتے ہیں" کے نام سے ایک مضمون لکھا۔ پانچواں دستہ کیا ہے' 1936ء میں جب اسپین میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک رہے تھے اور فاشسٹ فوجیں جمہوری اسپین کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے میڈرڈ (اسپین کے دارالحکومت) کی طرف بڑھ رہی تھیں تو انہی دنوں جنرل فرانکو نے اپنی تقریر میں کہا تھا ہمارے چار دستے باہر سے حملہ آور ہوں گے اور پانچواں دستہ اندر سے ہماری مدد کرے گا۔

پانچواں دستہ سے مراد اُن غداروں سے ہے جو اپنے ملک کو حملہ آوروں کے ہاتھ فروخت کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ کیا ہندوستان میں بھی پانچواں دستہ موجود تھا جس وقت بعض کانگرسی محبان وطن کے سامنے اس پانچویں دستے کا ذکر کیا جاتا تھا تو وہ

ناک بھوں چڑھانے لگتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں یہ منحوس غدار موجود نہیں ہیں۔ یہ محبان وطن اس پانچویں دستے کے لفظ کو کمیونسٹوں کے دماغ کی اختراع سمجھتے تھے۔ وہ اس پانچویں دستے کی خطرناک پالیسی اور حب الوطنی کی پالیسی میں امتیاز نہیں کرتے تھے حالانکہ محبان وطن اور پانچویں دستے کی راہیں بالکل مختلف ہیں۔

کانگرسی محبان وطن کیا چاہتے تھے؟ وہ چاہتے تھے کہ اس جمود و تعطل کا دور ختم ہو کانگرسی رہنما رہا ہوں۔ غذائی بحران حل کیا جائے قومی حکومت اور قومی حفاظت کے لیے قومی اتحاد عمل میں آئے۔ محبان وطن نوکر شاہی کی پالیسی کو بھانپ گئے تھے وہ جاننے لگے تھے کہ تعطل کا مطلب ہے کہ تمام ہندوستان بنگال بن جائے۔

کانگرسی محبان وطن توڑ پھوڑ اور غذائی بلوؤں کو کانگرس کی راہ نہیں سمجھتے تھے گاندھی جی کے خطوط جن میں وائسرائے سے 9 اگست کے ریزولیوشن کو واپس لینے کا خیال ظاہر کیا تھا سے یہی سبق سیکھا تھا اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگرسی محبان وطن اس وقت پست ہمتی کا شکار تھے انہیں اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ان کی دلی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح یہ جمود ختم ہو رہنما رہا ہوں اور غذائی بحران حل ہو یہی کانگرس کا فاشسٹ دشمن رویہ ہے۔ اگرچہ برطانوی حکومت کانگرس کو فاشسٹ دوست جماعت کہہ کر بدنام کر رہی ہے۔ اس کے باوجود عام کانگرسی 9 اگست کے ریزولیوشن کا مدعا یہی سمجھتے تھے کہ جاپانی حملے سے پہلے ہی قومی حکومت قائم کرلی جائے ملک میں کچھ اور بھی سیاسی گروہ تھے جن کی پالیسی کانگرس کی پالیسی سے مختلف تھی سب سے پہلے فارورڈ بلاک ہی کو لیجئے جس کا نعرہ تھا کہ جاپانیوں کی مدد کرکے آزادی حاصل کی جائے۔ اس گروہ کا رہنما سبھاش چندر بوس جاپانی ایجنٹ ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ جاپان نے برما کو آزاد کر دیا ہے لہٰذا ہندوستان کو بھی جاپان ہی آزادی دلائے گا۔ اس کی پالیسی جاپان دوستی کی پالیسی تھی۔ دوسری پارٹی کانگرس سوشلسٹ پارٹی ہے اس پارٹی کے اس وقت کے تین اہم رہنما رام منوہر لوہیا جے پرکاش نرائن اور اچھوت پٹوردھن تھے۔ ان کے باقاعدہ خفیہ اخبار نکلتے تھے جن میں ان کے اپنے مضامین شائع ہوتے تھے۔ چنانچہ 25 اپریل 1943ء کو رام منوہر لوہیا نے ایک مضمون شائع کیا جس میں لکھا تھا اگست ستمبر اور اکتوبر 1943ء میں ہمارے ملک میں ایک

زبردست بغاوت ہوگی تاریخ اس بغاوت کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہوگی۔

رام منوہر لوہیا جاپان سے اس لیے ناراض تھے کہ گزشتہ اگست ستمبر کے توڑ پھوڑ کے زمانے میں جاپان نے بمباری کیوں نہیں کی اس بار 9 اگست کو جے پرکاش نرائن کے نام سے ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ہڑتالوں ریل پٹریوں ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کے تاروں کو کاٹنے کی اپیل کی گئی۔

اچھوت پٹوردھن نے اپنے خفیہ اخبار 9 اگست میں لکھا تھا' موجودہ جمود ہماری شکست نہیں بلکہ فتح کی نشانی ہے عام طور پر کانگرسی اچھوت پٹوردھن کو ایک قابل عزت کانگرسی رہنما سمجھتے ہیں لیکن جو شخص گاندھی کا نام لے کر توڑ پھوڑ' تشدد اور لوٹ مار کی تبلیغ کرتا ہے کیا وہ کانگرسی رہنما ہو سکتا ہے؟

فارورڈ بلاک ظاہرا طور پر جاپانیوں کی مدد سے آزادی حاصل کرنے کا اعلان کرتا تھا۔ رام منوہر لوہیا سمجھتا تھا کہ اگر جاپانیوں نے 9 اگست کے موقع پر بمباری کی ہوتی تو ہماری بغاوت کامیاب ہو جاتی جے پرکاش جمود و تعطل کو قائم رکھنا چاہتے تھے وہ قومی حکومت کے بھی مخالف تھے۔ ان تینوں گروہوں میں آخر کیا چیز مشترک تھی ظاہر ہے کہ جمود و تعطل قائم رہے قومی رہنما رہا نہ ہوں قومی حکومت قائم نہ ہو جاپان کے خلاف حفاظت وطن کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے یہ تینوں گروہ مختلف بولیاں بولتے تھے مگر اس کے باوجود ان کا مقصد ایک ہی تھا۔ کیا یہ پانچویں دستے کی پالیسی نہیں؟ کیا یہ پالیسی ہمیں جاپان کے حوالے نہیں کرتی تھی کیا اس پالیسی کا تمام دارومدار جاپانی حملے پہ نہیں تھا یہ تینوں جماعتیں فارورڈ بلاک کانگرس سوشلسٹ پارٹی اور ٹراٹسکی کے چیلے چانٹے لوگوں کو اکسا رہے تھے اُن کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے تھے اس لیے ہم انہیں "پانچواں دستہ" کہہ رہے تھے جو قومی رہنماؤں کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ہم ہر کانگرسی محب وطن کو جو ان پارٹیوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر کام کر رہے تھے غدار اور پانچویں دستے کا فرد نہیں کہتے تھے۔ دوسری طرف یہ جاپانی ایجنٹ کانگرسی محبان وطن کو یہ کہہ کر پھسلا رہے تھے کہ ہندوستان میں کوئی پانچویں دستے کا فرد نہیں ہے یہ صرف کمیونسٹ کانگرسیوں کو بدنام کر رہے ہیں۔

بعض کانگرسیوں نے کمیونسٹوں کو مسلم لیگ کا خوشامدی کہنا شروع کر دیا تھا خاص

طور پر کامریڈ پی سی جوشی کے اس بیان کے پیش نظر جو انہوں جناح صاحب کے اس بیان کے بعد دیا تھا جو گاندھی جی کے خط کے متعلق تھا۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ کمیونسٹ پارٹی بنگال کی مسلم لیگ وزارت کی حمایت کر رہی ہے اور فضل الحق کی مخالفت حالانکہ مسلم لیگ ایک فرقہ وارانہ جماعت اور فضل الحق قوم پرست ہے!

ستمبر میں پارٹی کے مرکزی دفتر میں پی سی جوشی نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی۔ دفتر میں باقاعدہ طور پر کانگرس اور مسلم لیگ اتحاد کے پیش نظر کانگرسی ترنگا اور مسلم لیگ کا سبز اور کمیونسٹ پارٹی کا سرخ جھنڈا لگایا گیا۔ اسٹیج پر گاندھی جی کی تصویر کے ساتھ محمد علی جناح کی تصویر رکھی گئی۔

ایک کانگرسی صحافی نے پی سی جوشی سے سوال کیا "کیا آپ جناح صاحب کو سامراج دشمن سمجھتے ہیں؟"

"جی ہاں" پی سی جوشی نے بڑے جوش سے جواب دیا کانگرسی جرنلسٹ نے اپنے اخبار میں لکھا کمیونسٹوں کو دفعتاً مسلم لیگ اور مسٹر جناح سے عشق ہو گیا ہے کل تک یہ لوگ ہر فرقہ وار ادارے کی مذمت کرتے تھے آج اس کے حمایتی بن گئے ہیں۔

کمیونسٹ پارٹی جنگ کے پیش نظر تمام محبان وطن کی طرح کانگرس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ ضروری سمجھتی تھی لیکن کمیونسٹ پارٹی کانگرس سے ایک قدم آگے جا کر کہتی تھی کہ پاکستان کے مطالبہ میں حقیقت کا ایک ٹھوس عنصر موجود ہے اور وہ یہ کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان بڑی اکثریت میں ہیں اور ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں اُن کا حق خود اختیاری تسلیم کرنا چاہیے اور اگر کانگرس ایسا کرے تو نہ صرف کانگرس اور لیگ میں اتحاد بلکہ مشترکہ قومی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔

اس پالیسی کی بنیاد پر کمیونسٹ کانگرسی اور مسلم لیگی محبان وطن کو برادرانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے کہہ رہے تھے تاکہ وہ مل کر غذا کا مسئلہ حل کریں اور وطن کی حفاظت کریں بنگال میں لیگی وزارت کی اندھی مخالفت کرنے کی بجائے ہم وزارت کی تمام ان کارروائیوں کی تائید کرتے تھے جو عوام کی بھلائی کے لیے اختیار کی جاتی تھیں۔ مثلاً ذخیرہ اندوزی کے خلاف جدوجہد' عوامی غذائی کمیٹیوں کا قیام ساتھ ہی ہم اس وزارت کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کرتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ بنگال میں ہندو

مسلم عوام کا اتحاد بڑھے ہم مسلم لیگ سے کہہ رہے تھے کہ وہ کانگرس رہنماؤں کی رہائی کے لیے تحریک شروع کرے کیونکہ خود اختیاری اور آزادی کانگرس سے متحد ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہماری یہ بھی کوشش تھی کہ کانگرسی غیر مشتبہ الفاظ میں قوموں کے حق خود ارادی کو تسلیم کریں۔ ہم کانگرس اور مسلم لیگ کی ان تمام پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے جن کی وجہ سے ان دونوں بڑی سیاسی جماعتوں میں باہمی کدورت پیدا ہو رہی تھی۔

جب گاندھی جی نے جیل سے جناح صاحب کو خط لکھا تو ہم نے گاندھی کے اس عمل کو ملک کے لیے ایک نیک شگون سمجھا۔ جب جناح نے اس موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھایا اور گاندھی جی سے ملنے کی کوشش نہ کی تو ہم نے جناح صاحب کے اس فیصلہ کو غلط اور افسوسناک سمجھا لیکن جب مسلم لیگ اور جناح کے خلاف جس انداز سے اخباری مخالفت شروع ہوئی ہم نے اس کی بھی مخالفت کی۔

کیمونسٹوں پر بعض مسلم لیگی یہ اعتراض کرتے تھے کہ ہم لوگ گاندھی جی اور کانگرس کی بہت طرفداری کرتے ہیں۔ دراصل ہمارے متعلق کانگرسی اور لیگی دوستوں کے تمام شبہات، ہماری پالیسی کے صحیح ہونے کا ثبوت تھے کیونکہ کیمونسٹ، مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے بیک وقت طرفدار تھے۔ اس لیے کہ ہندوستان کے چالیس کروڑ افراد کی نمائندگی یہی دو سیاسی جماعتیں کر رہی تھیں۔ صرف کیمونسٹ ہی نہیں ہر ہندو اور مسلم کی یہی خواہش تھی کہ دونوں میں اتحاد ہو اور ملک میں سیاسی اور اقتصادی بحران ختم ہو۔

کیمونسٹ پارٹی میں کانگرس کی طرح ہر مذہب اور قوم کے عوام شامل تھے جبکہ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ اس لیے اسے کیمونسٹ پارٹی فرقہ وارانہ جماعت کہتی تھی جہاں تک اس کے سیاسی عمل کا تعلق ہے کیمونسٹ پارٹی اس سے پورا اتفاق کرتی تھی۔

کیمونسٹ ایک ایسی سیاسی پارٹی تھی جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی اور پارسی شامل تھے جن کا یقین مذہبی رواداری پر تھا۔ مذہبی سیاست کرنے والے عناصر نے کیمونسٹوں کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ہر کیمونسٹ ہر مذہب کا مخالف ہے۔ ایک مسلمان

کمیونسٹ ہونے کے ناطے مجھے بھی کئی بار اس غلط پراپیگنڈہ کا جواب دینا پڑا۔

بمبئی میں دفتر کے بعد میرا زیادہ تر وقت سجاد ظہیر اور سعادت حسن منٹو کے ہاں گزرا۔ سعادت حسن منٹو کے ہاں صبح کے ناشتے کے علاوہ گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لیے آئے سعادت حسن منٹو کے بھانجے حامد جلال سے مل کر بمبئی میں خاصی سیرو تفریح کی۔ حامد جلال میرا ہم جماعت تھا۔ منٹو جو شراب نوشی کے حوالے سے خاصے مشہور تھے لیکن بمبئی میں پانچ ماہ قیام کے دوران ایک بار بھی میں نے انہیں شراب نوشی کرتے نہیں دیکھا۔

بمبئی میں سٹوڈنٹ سرگرمیاں بھی اپنے عروج پر تھیں جنہیں مختلف سیاسی پارٹیاں منظم کرتی تھیں کمیونسٹ پارٹی سے متاثر سٹوڈنٹ تنظیمیں ان دنوں روس اور چین دوستی کا بڑا دم بھرنے لگی تھیں۔ ان سٹوڈنٹ تنظیموں میں سب سے سرگرم رکن نرگس باٹلی والا ایک نوجوان شادی شدہ پارسی لڑکی تھی۔ جو مشہور پارسی سوشلسٹ رہنما "باٹلی والا" کی بیوی تھی۔ دونوں میاں بیوی پارٹی کے رکن تھے اور اکثر ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں آتے جاتے تھے۔ یکدم ایک نئے معاشقہ نے پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں تہلکہ مچا دیا۔ نئے معاشقے کا انکشاف خود نرگس باٹلی ولا کے اپنے اس اعلان پر ہوا جس میں اُس نے کہا کہ وہ باٹلی والا سے طلاق لے کر ارون بوس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

ارون بوس بنگالی نوجوان تھا جو آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن بنگال کا جنرل سکریٹری تھا۔ وہ اکثر کلکتہ سے ٹیگور کانفرنس کے سلسلے میں بمبئی آتا جاتا تھا۔ نرگس باٹلی والا کے اس اعلان پر یکدم دو تہذیبی رویئے متصادم ہوتے نظر آنے لگے۔ ایک گروہ تو ایسا تھا جو یہ سمجھ رہا تھا کہ نرگس باٹلی والا اپنے کامریڈ دوست ساتھی اور ذات برادری کے میاں سے بے وفائی کر رہی ہے جبکہ دوسرا گروہ نرگس باٹلی والا کے اس جرات مندانہ فیصلے کی تعریف کر رہا تھا اور وہ آزادی نسواں کا علمبردار بنتے ہوئے اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا بہرحال نرگس نے باٹلی والا سے علیحدہ ہو کر ارون بوس سے شادی کر لی۔

بمبئی میں میری ملاقات ایک دن اچانک میرداد سے ہو گئی وہ دفتر میں آتے اور

استقبالیہ میں بیٹھتے تھے۔ میں انہیں دو تین سال کے بعد مل رہا تھا۔ اگرچہ ان کی جوانی اور حسن اُسی طرح برقرار تھا لیکن طبیعت میں بے سکونی اور بے چینی بہت بڑھ گئی تھی وہ بمبئی میں گودی کے مزدوروں میں کام کر رہے تھے جہاں بالخصوص پٹھان اور پوٹھوہار کے علاقے سے تعلق رکھنے والے مزدور خاصی تعداد میں تھے۔ پنجاب پارٹی نے بہت کوشش کی کہ حکومت پنجاب ان کی گرفتاری کے وارنٹ واپس لے لے کیونکہ وہ ریل میں سے پولیس کی حفاظت میں فرار ہوئے تھے۔ اس لیے حکومت پنجاب کا موقف تھا کہ میرداد اپنی گرفتاری پیش کرے اس کے بعد وہ فیصلہ کرے گی۔ لیکن یہ شرط انہیں قبول نہیں تھی۔ میرداد خان اپنی پرانی یادیں دہرانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کرلیا کہ اب پہلے والی بات نہیں ہے اب اس کی طبیعت میں اشتعال بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ایک دو اور ملاقاتیں بھی ہوئیں لیکن ان کے اندر بڑھتی ہوئی سرد مہری کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی کسی گرم جوشی کا زیادہ اظہار نہیں کیا کیونکہ اب میں بھی ایک اندھی عقیدت پسندی سے نکل چکا تھا۔

قحط بنگال

ستمبر تک جنگ کی وجہ سے قحط سالی نے اپنے خوفناک جبڑے پوری طرح کھول دیئے تھے۔ بنگال خصوصاً کلکتہ کی سڑکوں پر بھوک پیاس سے بلکتے بچے بوڑھے جوان دم توڑنے لگے۔ بنگال کی مدد کے لیے تمام صوبوں میں کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے مصیبت زدگان کی امداد کے لیے اپیل کی اس دوہری آفت کے پیش نظر میں نے "مسلم لیگ اور بنگال" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو "قومی جنگ" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں میں نے لکھا کہ بنگال میں بھوک اور موت کا بازار گرم ہے موت روزمرہ کا کھیل بن چکی ہے' ہندو اور مسلمانوں کی لاشیں پہلو بہ پہلو پڑی ہیں اگرچہ زندگی میں وہ اس طرح پہلو بہ پہلو کھڑے نہ ہو سکے دیکھو یہ لاشیں زندہ لوگوں کو متحد ہونے کے لیے کہہ رہی ہیں۔

اس بھوک نے ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب کردیا ہے وہ آج بنگال کے لیے متحد ہو رہے ہیں اور یہی ثبوت ہے کہ وہ حفاظت وطن کے لیے متحد ہوں گے۔ وہ

غذائی بحران کو حل کرنے کے لیے ضرور متحد ہوں گے وہ کانگرسی رہنماؤں کی رہائی اور مسلمانوں کے حق خوداختیاری کے لیے اکٹھے ہوں گے اور کندھے سے کندھا ملا کر قومی حکومت قائم کریں گے۔

بنگال کے فاقہ کشوں نے ہمیں سبق سکھایا ہے۔ انہوں نے اپنی جانیں دے کر ہماری آنکھیں کھولی ہیں اور ہمیں سبق پڑھایا ہے۔

یہ سبق کیا ہے؟ یہی کہ اگر ہم اتحاد کے بغیر بنگال کو بھوک سے نہیں بچاسکتے تو ہم کانگرس اور مسلم لیگ کے اتحاد کے بغیر ہندوستان کی حفاظت کیسے کرسکتے ہیں؟ آزادی کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔ مسلم لیگ کو محسوس کرنا چاہیے کہ کانگرس سے اتحاد کا سوال اب ٹالا نہیں جاسکتا۔ مسلم لیگ حق خوداختیاری کی خاطر ہندوستان کی آزادی کی خاطر کانگرسی لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کرکے قومی اتحاد کی جانب اہم عملی قدم اُٹھائے!

بنگال کے قحط کی وجہ سے ہندوستان کے تمام صوبوں میں غذائی کمیٹیاں تشکیل دی جاچکی تھیں۔ پنجاب جو اناج کا گھر کہلاتا تھا اس مد میں باقی تمام صوبوں سے آگے تھا۔ یہ جذبہ کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور محنت کشوں میں دیکھنے کے قابل تھا۔ میں اس جذبے سے کام کرنے والوں کی خبروں کو نمایاں جگہ دیتا۔ اس خبر نے تو بمبئی کی فلمی دنیا کو بھی بڑا متاثر کیا۔ خبر کے مطابق راولپنڈی کے ایک ادبی حلقہ "مری لٹریری کونسل" نے بنگال کی امداد کے لیے ایک محفل منعقد کی جس میں مشہور فلم ایکٹر پرتھوی راج فلم ڈائریکٹر خورشید انور اور ریڈیو آرٹسٹ دیاناتھ سیٹھ کی اپیل پر تیس ہزار روپے اکٹھا کرکے لٹریری سرکل کے سکریٹری نسیم انور بیگ نے بنگال کمیونسٹ پارٹی کے سکرٹری کو بھیجے جبکہ کمیونسٹ پارٹی کے پانچ لاکھ روپے جمع کرنے والی فنڈ کمیٹی کے لیے مشہور گلوکار کے ایل سہگل نے بھی اپنی گلوکاری کا مظاہرہ کرکے جھولی فنڈ جمع کیا۔

ایک طرف کمیونسٹ پارٹی کا یہ کردار تھا جبکہ دوسری طرف بنگال کی بڑی بڑی سیاسی جماعتیں اس المناک موقع پر بھی متحد ہوکر اپنی قوم کی اعانت اور امداد سے انکار کررہی تھیں۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی رہنمائی میں ہندو سبھا، لیگی وزارت کو ختم کرنے کی پوری کوشش کررہی تھیں جبکہ کانگرس بھی مسلم لیگ سے اتحاد کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا رہی تھی بلکہ اسمبلی میں کانگرسی نمائندے فضل حق اور شیاما پرشاد سے مل کر عدم

تعاون کی تجویز پر وزارت کے خلاف ووٹ دیتے ہیں۔

بنگال کی مسلم لیگ وزارت بھی اتحاد کے لیے کچھ نہیں کر رہی تھی وہ دوسری جماعتوں سے تنگ نظری اور جانب داری کا رونا روتی ہے لیکن خود بھی تعصبات کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ مسلم لیگ کا فضل حق سے ناراض ہونا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن ہزاروں مسلمان اور ہندو عوام اپنے رہنماؤں سے صرف ایک ہی مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسے کھانے کے لیے دیا جائے ایسے میں مسلم لیگ فضل حق کی وجہ سے کانگرس اور دوسری ہندو جماعتوں کو لے کر متحدہ وزارت کیوں نہیں بناتی؟ موجودہ نفاق کا صرف ایک ہی نتیجہ تھا۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان یونہی بھوک سے مرتے رہیں اور نوکر شاہی دفعہ 93 کو عمل میں لاتے ہوئے بنگال کی وزارت کو ختم کر کے بنگال میں اپنی من مانی کر سکے۔

بمبئی میں رہائش کے دوران میری خط کتابت لاہور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ دوستوں کے ساتھ بھی جاری رہی۔ بمبئی میں جب مجھے میرے سسرال والوں نے عائشہ کے میٹرک کے امتحان میں کامیابی کی اطلاع دی تو میں نے اپنے سسرال والوں کو لکھا۔ "کہ وہ عائشہ کو کالج میں داخلہ لے دیں تاکہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے۔ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ہماری خاندانی روایت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم بیٹیوں کو انگریزی تعلیم دلوائیں' مجھے ان کی اس بات سے بہت دکھ ہوا میں نے سجاد ظہیر اور ان کی بیوی رضیہ کو بتایا کہ اس نئے دور میں بھی ایسے قدامت پسند لوگ ہیں کہ جو بیٹیوں کے متعلق ایسا سوچتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے کہا "چلو شادی کے بعد جب وہ تمہاری بیوی بن جائے گی تو تم اسے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنے میں مدد دینا۔"

سجاد ظہیر کو میری نومبر میں طے پانے والی شادی کا پتہ تھا۔ اُس نے مجھے ستمبر کے وسط میں ہی کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگر شادی کے معاملات نمٹانے میں کوئی دشواری ہو تو ہم اس مسئلے کے حل کے لیے پنجاب جانے کو تیار ہیں۔ آخر تم ہمارے نوجوان کامریڈ ہو سجاد ظہیر کو نوجوانوں کو اپنے خیالات اور نظریات کے پرچار کا ہراول دستہ سمجھتے تھے اور ہر وقت اس جوہر نایاب کی تلاش میں رہتے تھے۔ گذشتہ دنوں جب وہ دہلی اور یوپی کے دورے سے لوٹے تو ان کے ہونٹوں پر میرٹھ کے ایک نوجوان شاعر کا بڑا چرچا تھا۔ سجاد

ظہیراس نوجوان کے جوش جذبے اور نظریئے سے بڑے متاثر ہوئے وہ انہیں بمبئی میں لانا چاہتے تھے۔

میں نے سجاد ظہیر سے پوچھا آپ نے اُسے بمبئی آنے کی دعوت دی۔

"نہیں، کیونکہ ابھی وہ اپنی شاعری کے ذریعے ترقی پسند خیالات کو مقامی طور پر پُراعتماد لہجے میں پھیلا رہا ہے۔"

یکدم مجھے معلوم ہوا کہ سردار جعفری بنگال کے قحط زدگان کی مدد کے لیے منعقد مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ جا رہے ہیں۔

لکھنؤ اپنے تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے میرے لیے ہی نہیں سرزمین پنجاب کے ہر ادیب اور شاعر کے نزدیک خوابوں کا دیس تھا۔ دبستان لکھنؤ کے قصے واجد علی شاہ کی رقص و سرود کی رنگیں دلفریب کہانیاں اور پھر مرزا رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" پڑھ کر میں تو اس شہر کا دیوانہ ہو گیا تھا۔ لکھنؤ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا پہلا مرکز تھا جہاں سے "نیا ادب" اور اس سے پہلے جوش ملیح آبادی کا رسالہ کلیم شائع ہوتا تھا۔ ابتداء میں چند پرچے کلیم اور نیا ادب کے مشترکہ ناموں سے شائع ہونا شروع ہوئے تھے لیکن بعد میں "نیا ادب" کے نام سے یہ ماہنامہ شروع ہوا تو یہی وہ زمانہ تھا جب سبط حسن نے علامہ اقبال کی شاعری میں شاہین کی علامت کے حوالے سے ایک مضمون لکھا جس میں انہوں نے "شاہین" کو علامہ اقبال کی شاعری میں فسطائی افکار سے دلچسپی کا مظہر ٹھہرایا۔ اس مضمون پر زبردست بحث و مباحثہ شروع ہوا۔

لکھنؤ کی سرزمین

لکھنؤ میں ان دنوں کئی اہل علم و دانش جو کمیونسٹ پارٹی کے فعال ہی نہیں کل وقتی کارکن تھے مقیم تھے اور ان کا تعلق بھی سرزمین لکھنؤ سے تھا۔ محمود الظفر ایم اے او کالج امرتسر کی وائس پرنسپلی چھوڑ کر اب لکھنؤ کی ضلع کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری بن گئے تھے اور اُن کی بیوی رشیدہ جہاں ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ خواتین کے تنظیمی کاموں سے منسلک تھیں اور ہاجرہ بیگم جن کی شادی ڈاکٹر زین العابدین سے ہوئی وہ دونوں میاں بیوی کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن تھے۔ میں ڈاکٹر زین العابدین سے

اس وقت متاثر ہوا تھا جب وہ لندن سے ڈاکٹریٹ کی سند لے کر لوٹے تھے اور جامعہ دہلی کے ماہ نامہ جامعہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب ایم اے او کالج کے پروفیسر محب الحسن جو وہاں تاریخ اور سیاست پڑھاتے تھے اور ان کے مضامین بھی جامعہ میں شائع ہوتے تھے جن کا موضوع فاشزم دشمنی تھا۔ لیکن دوستی اور نیاز مندی کا سلسلہ اس وقت بڑھا جب وہ کمیونسٹ پارٹی میں فعال ہوئے۔ ڈاکٹر زین العابدین جو پارٹی حلقوں میں ڈاکٹر زیڈ احمد یا پھر صرف ڈاکٹر احمد یا ڈاکٹر زین العابدین کے نام سے مشہور تھے وہ مولانا صلاح الدین کے بھتیجے اور سندھ کے اعلیٰ پولیس آفیسر مولوی ضیاء الدین احمد کے بیٹے تھے ان کے بھائی ڈبلیو زیڈ احمد نے بحیثیت فلم ڈائریکٹر کے بڑا نام پایا۔ ڈاکٹر زین کی بیگم ہاجرہ کی دو چھوٹی بہنیں عذرا ممتاز اور زہرہ سہگل (کلاسیک رقاص) تھیں۔

سجاد ظہیر نے سردار جعفری کے ساتھ لکھنؤ جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے پہلی بار سردار جعفری کے ساتھ بمبئی سے لکھنؤ تک کا سفر ریل گاڑی کے ذریعے کیا یہ ایک یادگار سفر تھا۔

گنگا پرشاد ورما میموریل ہال میں شاعروں ادیبوں فنکاروں کے علاوہ لکھنؤ کے شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر طبقہ فکر کے لوگ کثیر تعداد میں جمع تھے۔ چونکہ میں ڈاکٹر محمود الظفر اور ان کی بیگم رشیدہ جہاں کے ہاں ٹھہرا تھا اُنہی کے ساتھ "مشاعرہ گاہ" میں پہنچا جہاں میری ملاقات آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے ریجنل ڈائریکٹر حفیظ جاوید سے ہوئی۔

حفیظ جاوید سے میری پہلی ملاقات لاہور میں مولانا چراغ حسن حسرت کے اخبار "شیرازہ" کے دفتر میں 1938 میں ہوئی تھی۔ لکھنؤ میں مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے رات شاعری کے بعد ان کے ہاں ایک محفل جمی جو تمام رات جاری رہی۔

مشاعرے کی صدارت لکھنؤ کے غزل گو شاعر سید آل رضا صاحب رمنا نے کی۔ لکھنؤ کے غزل گو شاعروں کی غزلوں کے علاوہ نظموں کے شاعروں میں سردار جعفری تو تھے ہی لیکن شمیم کرہانی سلام مچھلی شہری کے علاوہ ایک وہی نوجوان شاعر میرے دل ودماغ میں اُتر گیا۔ جو پہلے سجاد ظہیر کے دل ودماغ میں میرٹھ میں اُترا تھا۔ اس کا نام تھا

کیفی اعظمی اور اس کا کلام تھا۔

کھیتوں پر برس رہی ہے وحشت
شہروں میں کسان آ رہے ہیں
کچھ بیچ رہے ہیں اپنی جانیں
کچھ ضعف سے لڑکھڑا رہے ہیں
تاریک گودام میں ہے غلہ
مسرور ہیں غلہ کھانے والے
ٹکڑے کے لیے ترس رہے ہیں
تہذیب کا بوجھ اٹھانے والے
کٹتا نہیں حلقہ تجارت
بنگال تباہ ہو رہا ہے
کاندھوں پر لیے نڈھال بچے
دوڑیں یہ غریب مائیں کب تک
اک بوند بھی دودھ کی نہیں ہے
سینے کا لہو چوسائیں کب تک
عزت کا گراں بہا خزانہ
روٹی کے لیے لٹا رہی ہیں
گلیوں میں بلک رہے ہیں بچے
منہ پھیر کے مائیں جا رہی ہیں
مٹ جائے نہ قوم کی امانت
بنگال تباہ ہو رہا ہے

لاہور واپسی

بمبئی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے جب میں بذریعہ ٹرین لاہور پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر میرے دوست اور سیاسی حلقوں سے تعلق رکھنے والے کارکن اور رہنما میرے استقبال

کے لیے موجود تھے جبکہ میرے گھر اور خاندان والوں میں سے کسی فرد نے اسٹیشن پر آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس عمل نے میرے اندر جہاں سیاسی وابستگی کو مضبوط اور مستحکم کیا وہاں میرے اندر رشتہ داروں سے میری لاتعلقی کے جذبات کو مزید ابھارا۔

عزیز واقارب کی مجھ سے ناراضی کی اصل وجہ میرے سیاسی نظریات تھے جن کو میں ہمیشہ مذہبی معاملات اور عقائد سے الگ رکھ کر دیکھتا تھا لیکن ان کے نزدیک ایک کٹر اہل حدیث مسلک کے آدمی کا کمیونسٹ بن جانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی مسلمان یکدم بے دین ہو گیا ہو۔

کمیونسٹوں کے خلاف ان جذبات واحساسات کو عام طور پر سیاسی اور خاص طور پر مذہبی جماعتوں نے ابھارا تھا کہ کمیونسٹ خدا اور اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے دادا جان لاہور میں اہل حدیث کی سب سے بڑی مسجد چینیاں والی جو ہمارے محلہ کوچہ چابکسواراں میں واقع تھی کے ٹرسٹی تھے۔ میری تمام ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت دادا جان کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد یہ ٹرسٹی کا عہدہ مجھے سونپا گیا۔ لیکن میں جو گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے دوران ہی کمیونسٹ پارٹی اور کمیونزم سے اس حد تک متاثر تھا کہ میں اس کا ایک ادنی کارکن بن گیا۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد تھی اس لیے اس کی تمام سیاسی سرگرمیوں کو انڈر گراؤنڈ رکھا جاتا تھا جب کمیونسٹ پارٹی نے ہندوستان کی دوسری سیاسی و مذہبی جماعتوں کے برعکس دوسری جنگ عظیم کو قومی جنگ کہنا شروع کیا۔ اور عوام سے اس جنگ میں حصہ لینے کو کہا تو ہندوستان کی برطانوی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی سے یہ پابندی اٹھالی۔

پابندی اُٹھ جانے اور داداجی کی وفات کے دو ماہ بعد میں نے کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بننے کا فیصلہ کیا اور پارٹی کے لاہور دفتر میں بیٹھنا شروع کیا جہاں سے اُردو اور پنجابی کے دو ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" اور "جنگ آزادی" شائع ہوتے تھے جنگ آزادی کے ایڈیٹر فیروز دین منصور تھے مجھے ان کی معاونت کی ذمہ داری سونپی گئی اس طرح میں نے دیکھتے دیکھتے سیاست کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی بال و پر نکالنے شروع کردیئے پابندی کے اُٹھنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی دیکھتے دیکھتے بہت جلد عوامی سطح پر

ہندوستان کی سب سے زیادہ منظم جماعت کے طور پر ابھرنے لگی اس جماعت میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی سبھی شامل تھے اور ہر ایک کے دل میں ایک دوسرے کے لیے بے پناہ عقیدت و احترام کا جذبہ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی ہی اس وقت ملک کو سیاسی اور معاشی بحرانوں سے نکالنے کی جدوجہد کر رہی تھی اس کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کانگرس اور مسلم لیگ کے اتحاد سے مشروط تھی۔

کمیونسٹ پارٹی کے اس سیاسی موقف کی عوامی سطح پر مقبولیت دیکھ کر نہ صرف برطانوی حکومت بلکہ تمام سیاسی اور مذہبی جو درپردہ سیاسی جماعتیں تھیں کمیونسٹوں کے خلاف مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے میں مصروف تھیں۔ انقلاب روس چونکہ روس کے وسیع و عریض علاقہ میں مزدوروں کسانوں اور فوجیوں نے مل کر کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں بپا کر کے ایک سوشلسٹ معاشرہ کو جنم دیا تھا۔ اس لیے یہ بات عالمی سامراج کے مفاد کو گوارا نہ تھی اس لیے انہوں نے اور محاذوں کے علاوہ سب سے بڑا محاذ مشرق میں کمیونسٹوں اور انقلاب روس کو مذہب دشمن کے طور پر پیش کرنے کے لیے کھولا۔ لیکن ہندوستان جو برطانیہ کی سب سے اہم ترین نوآبادی تھی اس میں اقتصادی مساوات کے نعرے نے غریبوں کو بہت متاثر کیا جو استحصالی طبقوں کو کسی صورت گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پورے عمل کا ایک اور پہلو بھی تھا، وہ یہ کہ کمیونزم ایک معاشی نظریہ کے ساتھ ہندوستان کی کثیرالتعداد قومیتوں کو مذہب کے حوالے سے نہیں اپنے زمینی کلچر کے حوالے سے حق خوداختیاری دینے کا بھی علمبردار تھا اور وہ قومیتوں کو مذہب کے ساتھ ساتھ انہیں دیہی عوامل پر مبنی کلچر کے حوالے سے بھی تسلیم کرتا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن بننے سے سب کو میرے مستقبل کی نشاندہی ہو گئی تھی اور وہ مجھ سے کھچے کھچے رہنے لگے۔ اس طرح سے میری سسرال والوں کو بھی میرے خلاف کچھ کہنے سننے کا موقعہ ملا جس نے بہت سی غلط فہمیوں کو پیدا کیا۔ میری منگنی نہایت ہی قریبی رشتہ داروں میں ہوئی تھی اور یہ رشتہ میری دادی نے طے کیا تھا۔ انہوں نے اپنے خاوند یعنی میرے دادا جان کی بہن کی بیٹی کو بڑے فخر سے میرے لیے ڈھونڈا تھا اس منگنی میں پوری ذات برادری کے تمام روایتی رسوم و رواج کی پابندی کی گئی تھی جو کہ ککے زئیوں کا خاصہ تھیں۔

میری شادی

ان دنوں بمبئی میں تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ میری منگیتر عائشہ نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا ہے اس اطلاع کے بعد میں نے سسرال والوں کو لکھا کہ وہ عائشہ کی مزید پڑھائی کا بندوبست کریں جس سے سسرال والوں نے اس بات کے بھی الٹ معنی لیے ان کا خیال تھا کہ عبداللہ شادی سے جان بوجھ کر گریز کر رہا تھا چنانچہ اس مسئلے کو انہوں نے میری غیر موجودگی میں خاندان میں خوب اچھالا چنانچہ مجھے والدہ کی طرف سے خط موصول ہونے لگے کہ اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے میں جلد لاہور پہنچوں۔ لیکن میں نے اس معاملے کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ میں ہر لمحے پارٹی کے کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھتا۔ معلوم نہیں کس طرح سید سجاد ظہیر تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے مجھے دوبارہ لاہور دفتر میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہی بات تھی کہ جب میں بمبئی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے لاہور پہنچا تو ریلوے اسٹیشن پر کوئی رشتے دار مجھے لینے نہیں آیا۔ میں نے دیکھا یہاں گھر ہی نہیں پورے خاندان کا رنگ ڈھنگ ہی بدلا ہوا ہے۔ میری والدہ مجھ سے سخت نالاں تھیں کہ میں جس غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہا ہوں اس سے ہمارا صرف تین افراد ماں اور دو بیٹے پر مشتمل مختصر کنبہ یا خاندان اپنی ذات برادری سے کٹ کر رہ جائے گا میں نے انہیں یہ یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔

تو پھر یہ سب کیا ہے میری والدہ سوالیہ نشان بن گئیں۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا میں سراپا جواب بن کر رہ گیا۔

"اچھا سب تمہاری سمجھ میں آ جائے گا جب تم شادی کے لیے رضامند ہو جاؤ گے۔"

اگر اس مسئلے کا یہی حل ہے تو میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ میں نے سر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ اس کے بعد میری ماں نے حافظ محمد شفیع اور شیخ ظفر کو میرے سسرال امرتسر روانہ کیا تاکہ وہ انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کریں۔

دوسرے روز حافظ محمد شفیع اور شیخ ظفر کامیاب اور کامران لاہور پہنچے اور انہوں نے 19 نومبر 1943 کو شادی کی مقررہ تاریخ کی خوشخبری سنادی۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی نہ صرف والدہ بلکہ میں بھی پریشان ہوگیا۔ پریشانی کی وجہ ذات برادری کے فضول روایتی رسم و رواج تھے جن کی پابندی کیے بغیر یہ شادی ہونا ناممکن تھی۔ اس وقت ہمارا کنبہ سخت معاشی بحران کا شکار تھا میرا اپنا کوئی مستقل اور پائیدار ذریعہ معاش نہ تھا۔ گھر کی کفالت کا انحصار صرف کرایہ داروں سے ملنے والے کرایہ کی اقساط پر تھا۔ یکدم میری نظر گوالمنڈی کے اُن رہائشی کوارٹروں پر گئی جہاں محنت کش کرایہ دار رہ رہے تھے۔ یہ رہائشی کوارٹر ایک کنال اور چھ مرلے کے زمینی قطعہ پر تھے میں نے والدہ کو انہیں فروخت کر دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ فوراً ان کوارٹروں کو چھتیس ہزار میں فروخت کر دیا گیا۔

میری شادی میں شرکت کرنے والوں میں خاندان' رشتہ داروں کے علاوہ کثیر تعداد دوست احباب کے علاوہ سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کی تھی۔ شورش کاشمیری رہائی کے بعد "پیسہ اخبار" کی حدود میں نظربند تھا تب تک اُس سے سیاسی اختلافات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ اس کے باوجود اُس کا شادی میں شریک ہونا ضروری تھا چنانچہ لاہور سے امرتسر اُس کو ساتھ لے جانے کے لیے حکومت پنجاب سے باقاعدہ اجازت لی گئی۔

شورش کاشمیری نے فی البدیہ سہرا پڑھا اس بارات میں سوہن سنگھ جوش بھی شامل ہوئے انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھایا کیونکہ سکھ ہونے کے ناتے مذہب انہیں اجازت نہیں دیتا تھا کیمونسٹ پارٹی میں جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو اس میں ہر مذہب اور ہر عقیدے کے لوگ شامل تھے اور وہ اُن پر سختی سے کاربند تھے۔ جس طرح اہل حدیث ہونے کے ناتے میں ایک کٹر مسلمان تھا اور سامراج دشمنی مجھے کیمونسٹ پارٹی میں لے آئی تھی اس طرح سب سکھ رہنما بھی اکالی پارٹی اور گورودوارہ تحریک سے ہو کر کیمونسٹ پارٹی میں آئے تھے اور سکھ پنتھ کے سچے خالصے تھے۔

بارات کی نسبت ولیمہ میں زیادہ دوست احباب تھے کیمونسٹوں کے علاوہ احراری رہنماؤں میں مولانا مظہر علی اظہر اس ولیمے کی باتوں کو اپنے دوستوں سید امجد حسین اور ڈاکٹر آفتاب احمد سے مل کر یاد کر کے خوب ہنستے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی اور مولانا صلاح الدین کی خوش خوری بہت مشہور تھی۔ ولیمہ کی دعوت کا اہتمام فرشی نشست پر کیا گیا تھا۔ دستر خوان پر آمنے سامنے بیٹھتے تھے اور

ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے تھے۔ مولانا صلاح الدین اور عبدالرحمٰن چغتائی تمام مہمانوں کے کھانا کھانے اور اٹھ جانے کے بعد بھی بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف رہے۔

عائشہ سے جس وقت میری شادی ہوئی اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی اور میری عمر تیئس سال۔ شادی کے بعد گھریلو اخراجات کا بڑھنا لازم تھا۔ گھر کی مستقل کفالت صرف دو سو روپے کرایہ کی وصولی پر منحصر تھی۔ آمدنی بڑھانے کی کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔ تھوڑے بہت سرمایہ سے کاروبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کاروبار میں شراکت کا تجربہ بھی نہ تھا صحافت اور سیاست کا جو تجربہ تھا وہ مزید عبادت اور ریاضت کا تقاضا کر رہا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن ہونے کے ناتے سرکاری ملازمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مختلف اندیشوں اور تفکرات کی پرچھائیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں لیکن میں گھر والوں کو باتوں باتوں سے بہلانے اور پھسلانے کی کوشش کرتا رہا۔

کراچی روانگی

شادی کے ایک ماہ بعد مجھے پارٹی ہیڈ کوارٹرز بمبئی سے حکم موصول ہوا آپ کو پارٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے 23 دسمبر 1943 کو کراچی میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اکتیسویں سالانہ اجلاس کی رپورٹنگ کرنا ہے اس لیے آپ فوری طور پر ضلع لاہور کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری دانیال لطیفی سے رابطہ کریں۔

دانیال لطیفی سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خود بھی کراچی جا رہے ہیں۔ کراچی جانے کے لیے جب میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تو دیکھا پنجاب مسلم لیگ کے اعلیٰ عہدہ دار اور کارکن جن میں محمود علی قصوری' حمید نظامی اور یحییٰ بختیار بھی شامل ہیں اجلاس میں شرکت کر رہے تھے۔

کراچی جو سندھ کا صوبائی دارالحکومت تھا۔ ان دنوں سیاسی سرگرمیوں میں سب سے متحرک صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کے تمام اعلیٰ عہدیدار' مسلم لیگ' پاکستان اور حق خودارادیت کے لیے پنجاب سے بھی زیادہ متحد اور فعال تھے۔ اُن کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی نے بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس میں بھرپور ساتھ دیا' کمیونسٹ

پارٹی کے مقامی دفتر جو بندر روڈ پر واقع تھا۔ اس پر پارٹی کے سُرخ جھنڈوں کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ اور کانگرس کے جھنڈے لہرائے گئے اس دفتر کی دیواروں پر بنگال کے قحط زدہ علاقے اور لوگوں کی تصویریں آویزاں کی گئی تھیں۔ سالانہ اجلاس سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کا جلوس جس کی قیادت قائداعظم محمد علی جناح" نے کی کراچی کی سیاسی تاریخ میں سب سے بڑا جلوس تھا۔ جس کی تنظیم بڑی معنی خیزی کے ساتھ کی گئی۔ جس بگھی پر قائداعظم محمد علی جناح" سوار تھے۔ اُس بگھی کو پورے اکتیس اونٹ کھینچ رہے تھے اور اونٹوں پر سواروں نے عربی لباس پہن رکھا تھا۔ قائداعظم کے ساتھ مسٹر جی ایم سید بڑی سج دھج کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے تین چار دیو قامت گارڈز کھڑے تھے۔

جلوس کے راستے کو بڑے خوبصورت انداز میں سجایا گیا اور اکتیس بڑے محرابی دروازے بنائے گئے تھے۔ جن پر مختلف نعرے لکھے ہوئے تھے ایک دروازہ پر "پاکستان یا موت" لکھا دیکھ کر میں نے سوچا واقعی پاکستان، مسلم لیگ کے لیے دن بدن چیلنج بنتا جا رہا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے جلوس کے سب سے آگے "مسلم لیگی کارکن" سبز ہلالی جھنڈے لہلہاتے آگے بڑھ رہے تھے اُن کے پیچھے کوئی ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ نیشنل گارڈز بھورے خاکی رنگ کی یونیفارم پہنے چاق وچوبند صف بستہ مارچ کرتے جا رہے تھے نیشنل گارڈز میں سب سے زیادہ نوجوان تھے جن کی عمر دس بارہ سے تیس پینتیس سال تک تھی اس نیشنل گارڈ کا تعلق صرف صوبہ سندھ سے نہ تھا بلکہ ہندوستان کے سب صوبوں سے ان کے پیچھے پچاس سندھی لوگ اپنے روایتی لباس میں اونٹوں پر سوار قطار در قطار چل رہے تھے اور ان کے پیچھے کوئی سو کے قریب گاڑیاں تھیں جن میں سندھ صوبے کے وزراء اور صوبائی مسلم لیگ کے اعلیٰ عہدیدار بھی تھے۔ یہ مرکزی جلوس جب کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے سامنے پہنچا تو کثیر تعداد میں کمیونسٹ عہدیداروں اور کارکنوں نے مل کر بار بار یہ نعرے لگائے "کانگرس لیگ ایک ہو جاؤ"

آزادی کے لیے ہندو مسلم ایک ہو جاؤ۔

تیسرا نعرہ خاص طور پر پورے جوش وجذبے کے ساتھ تھا نفع خوروں اور ذخیرہ

اندزوں کے خلاف متحد ہو جاؤ۔ 24 دسمبر 1943ء کی شام جب پنڈال میں تقریباً ستر ہزار کا مجمع تھا۔ قائداعظم بڑے دروازے جس کو "باب الاسلام" کا نام دیا تھا اور اس پر سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا بڑی شان سے داخل ہوئے۔ قائداعظم سے پہلے اسٹیج پر مسلم لیگی رہنماؤں کی تقریریں سن کر میں نے بخوبی اندازہ کرلیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کا اتحاد دن بدن نہ صرف مشکل بلکہ پیچیدہ ہوتا چلا جا رہا ہے کیونکہ مسلم لیگ بھی کانگرس کے نقش قدم پر چلتی محسوس ہو رہی ہے کیونکہ وہ بھی اتحاد سے منہ موڑ کر برطانوی حکومت پر زبردست دباؤ ڈالنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

صدارتی تقریر میں قائداعظم نے عوام کو صرف یہ ہی بتایا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں طاقت دینا نہیں چاہتی لیکن مسلم لیگ مسلمانوں کے پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کی خواہاں ہے۔ ہم ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتے ہیں۔ البتہ انہوں نے مسلم لیگ پر لگائے گئے اس الزام کی تردید کی کہ ہم آزادی نہیں بلکہ برطانوی راج کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے میں ناکامی کو بھی کانگرس کی ذمہ داری ٹھہرایا۔ مسلم لیگ کا اعلانیہ قدرے بہتر تھا یعنی مسلم لیگ ہندوستان کی مکمل آزادی اور پاکستان کی خواہاں ہے۔

پنڈال کے اندر ایک چھوٹا سا باغ آراستہ کیا گیا تھا جس میں فوارہ پانی چھلکا رہا تھا اور اس کے اردگرد ہندوستان کا نقشہ بنا ہوا تھا اور جس میں پاکستان بنگال آسام پنجاب سرحد' سندھ' بلوچستان اور کشمیر کو سبز رنگ میں دکھایا گیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگی اعلیٰ عہدیداروں کی تقریروں اور قائداعظم کے خطبے کے بعد میں نے عام کارکنوں کے علاوہ کئی ایک معزز عہدیداروں سے ملاقاتوں کے علاوہ کئی ایک کمیونسٹ پارٹی سندھ کے کارکنوں اور عہدے داروں سے تبادلہ خیال کیا اور یہی نتیجہ اخذ کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اکتیس واں اجلاس سندھ ایسے صوبے میں اس وقت منعقد ہو رہا ہے۔ جب بنگال کی صورتحال سب سے تشویشناک ہے قحط بدستور جاری ہے لاکھوں انسانوں کی خوراک کا مسئلہ ہے۔ اوپر سے جاپانی فوجیں چٹاگانگ' کلکتہ اور آسام پر بموں کی بارش کر رہی ہیں۔ پنجاب جو اناج کا گھر ہے وہاں کساد بازاری انتہا کی۔ اس اجلاس میں ہندوستان کی معاشی صورتحال کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا جاتا تو

یہ اجلاس اس سے بھی زیادہ کامیاب رہتا۔

کراچی میں سردار جعفری اور ڈاکٹر محمد اشرف سے بھی ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی صورتحال پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر محمد اشرف چونکہ پنجاب میں پارٹی کے لیے کام کر رہے تھے اور انہوں نے کراچی میں آنے سے پہلے پنجاب اور سرحد کا تفصیلی دورہ کیا تھا تاکہ وہ محبان مسلم لیگ کو بتا سکیں کہ مسلم لیگ میں ترقی پسند رجحانات بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ارکان مسلم لیگ بڑی سنجیدگی سے ملک کو درپیش جنگ اور قحط ایسے بڑے مسائل کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں چھوٹی چھوٹی الجھنوں کے حل کے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اشرف نے ہمیں بتایا کہ پنجاب اور سرحد کے دورہ میں میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مسلم لیگ میں اس وقت سب سے بڑا سوال اسے عوامی تنظیم بنانے کا ہے کیونکہ پنجاب اور سرحد بلکہ سندھ کے لیگی وزراء صوبہ اور مرکز میں لیگ کو خاطر میں لانے کے بجائے نوکر شاہی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ سرحد میں تو بااثر لیگی حلقوں میں یہ اثر پایا جاتا ہے کہ وہ کانگرسی لیڈروں اور ممبران اسمبلی کے جیلوں میں بند رہنے پر بھی شرمسار ہیں ایک محترم دوست نے تو یہاں تک کہا کہ اب سوشلسٹ اور کمیونسٹ خیالات کے مسلمانوں کو لیگ میں شریک ہو کر ہمارا ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن وہ اس بات پر زیادہ خائف ہیں کہ برطانوی سامراج ہندوؤں' مسلمانوں اور کانگرس لیگ کی باہمی بے اعتمادی کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا "ہمیں اگر آج یقین ہو جائے کہ گاندھی جی حق خود ارادیت کو تسلیم کر لیں گے تو ہم کل ہی گاندھی سے ملاقات کرنے کا مطالبہ پیش کر سکتے ہیں۔"

کراچی سے واپسی کے بعد میں نے پارٹی کے ہیڈ آفس میں اپنی پوری رپورٹ لکھ کر بھیجی۔

دوسری جنگ عظیم نے معاشیات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان اس جنگ میں پوری طرح ملوث تھا۔ جاپانی فوجیں ہندوستان کے مشرق میں آسام اور بنگال میں جس طرح بمباری کر رہی تھی اس سے یہ علاقہ زبردست قحط کا شکار تھا پنجاب جو اناج کا گھر تھا وہ بھی اس کساد بازاری سے نہ بچ سکا۔

فروری 1944ء میں حکومت پنجاب نے سب سے پہلے پنجاب کے تین شہروں لاہور' امرتسر اور راولپنڈی میں راشن بندی کے نفاذ کا جب اعلان کیا تو کیمونسٹ پارٹی نے اس راشن بندی میں درپیش عوامی مسائل کے حل کے لیے پارٹی کارکنوں کو ہدایات دیں کہ اپنے اپنے علاقے میں دوسری تمام سیاسی جماعتوں اور سماجی تنظیموں کے کارکنوں کے ساتھ مل کر محلہ وار خوراک کمیٹیاں تشکیل دے کر راشن بندی کے اہل کاروں کی صحیح رہنمائی کریں اور ایسے گھروں کی نشاندہی کریں جو راشن کارڈ میں غلط افراد کا اندراج کروا رہے تھے۔

میں کیمونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن ہونے کی حیثیت سے سب سے زیادہ فعال تھا۔ میں نے ان خوراک کمیٹیوں کے ذریعے کئی ایک نئے نوجوانوں کو جو اپنی اپنی سیاسی جماعتوں اور سماجی تنظیموں کے سرگرم رکن تھے کیمونسٹ پارٹی کے سیاسی نظریات کا ہمدرد بنایا۔ اس سلسلے میں مصری شاہ کے دو نوجوان صوفی عبدالغفار اور شیر محمد بھٹی کا میں یہاں ذکر ضرور کروں گا۔ اس کے علاوہ میرا ذاتی دوست محمد اقبال جو گورنمنٹ کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا' وہ محمد باقر جو اس وقت اسلامیہ کالج میں فارسی کے استاد تھے' کا چھوٹا بھائی تھا۔

بہار کہ خزاں

سرما گزرا بہار کی آمد آمد تھی درختوں پر کہرے کی بجائے نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

عائشہ نے مجھے ماں بننے کی خوش خبری سناتے ہوئے کہا۔ اب تمہیں زیادہ وقت گھر میں دینا ہوگا' ہمارے گھر کے راشن کارڈ میں نئے فرد کا اضافہ ہونے والا ہے۔ اس خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ لیکن میں نے عائشہ پر کسی قسم کی پریشانی کو ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ جس وقت میری شادی ہوئی اس وقت میری عمر تیئس سال تھی جبکہ عائشہ کی عمر سترہ سال تھی۔ یہ دلہن ماں بننے کے حسین خواب کو حقیقت بنتے دیکھنا چاہتی ہے اس لیے میں نے گھر پر عائشہ کی پوری دلجوئی کرنا شروع کر دی۔

لیکن میری بھی اپنی ایک خواب اور حقیقت کی دنیا تھی۔ میرے اپنے خواب تھے

جن کی تعبیر میں جلد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے عائشہ کے اور میرے خواب متصادم ہونے سے پہلے میں نے ایک نئی راہ نکالی۔ میں نے خاموشی سے عائشہ کے لیے ایسی دوادارو کا بندوبست کرنا شروع کیا کہ خاموشی سے عائشہ کا حمل ضائع ہو جائے۔ لیکن ان ادویات کے کھانے کے باوجود عائشہ نے حمل کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ ظاہر نہیں کیا تو مجھے فکر لاحق ہوگئی چنانچہ میں فیض احمد فیض کے چھوٹے بھائی عنایت کے پاس پہنچا اور انہیں اپنی پریشانی کے متعلق بتایا۔ پہلے تو انہوں نے میری مدد کرنے سے انکار کیا لیکن جب میں نے انہیں گھریلو مسائل کے متعلق بتایا اور کہا کہ میری گھریلو ذمہ داریاں میرے سیاسی اور نظریاتی معاملات کو برباد کر دیں گی تو انہوں نے ہامی بھر لی۔

دوسرے روز میں عائشہ کو "کلینک" پر لے گیا اور اسے حمل گرانے کا مشورہ دیا۔ عائشہ نے کسی قسم کی مداخلت نہ کی تو میں نے اس سے پوچھا 'کیا تم خوش ہو۔"

"آپ کی خوشی ہی میری خوشی ہے۔" عائشہ نے جواب دیا۔

"لیکن تم بھی تو مجھے مشورہ دے سکتی ہو۔"

"آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔"

معاشی حالات کے پیش نظر حمل گرانے کے واقعہ نے ہمارے خاندان میں ہی نہیں پوری ذات برادری اور عزیز واقارب میں تہلکہ مچا دیا۔ جس نے سنا اپنی انگلیوں کو نہ صرف دانتوں میں دبایا بلکہ کانوں کو بھی لگایا۔ اور توبہ توبہ کا ورد کیا۔ ان کے نزدیک اولاد تو اللہ میاں کی دین ہے اور ان کی رازق بھی وہی ذات ہے جو پیدا کرتی ہے۔ ملاؤں اور مولویوں کے غلط پروپیگنڈہ کے پیش نظر سب کو ایک کمیونسٹ کو بے دین کہنے کا جواز مل گیا تھا۔ اس طرح سب نے مجھ پر "کمیونسٹ" کا لیبل لگا کر میرا ایک طرح سے سوشل بائیکاٹ کر دیا۔" اس رویئے نے مجھے بڑی ذہنی اذیت پہنچائی اور میں دن بدن ایک نفسیاتی مریض بنتا جا رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری ملاقات آئرک سپیرین سے ہوگئی اور وہ مجھے اپنے ایک ہندو دوست پروفیسر پرس رام کے ہاں لے گئے۔

پروفیسر پرس رام ایف سی کالج میں نفسیات پڑھاتے تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ نفسیاتی بیماریوں کا علاج بھی کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اولاد سے گریز دراصل اپنی ذمہ داریوں سے گریز ہے تم اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے اس لیے تم

نے ایسا کیا۔ دیکھو دنیا اور حالات سے مقابلہ کرنا سیکھو اپنی ذمہ داریوں سے آنکھیں مت چراؤ۔ پروفیسر پرس رام کی باتوں نے میری کایا پلٹ دی' چنانچہ اس دن کے بعد میں نے اپنی سیاسی اور گھریلو زندگی میں ہمیشہ توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔

23 مارچ 1944ء کو مسلم لیگ نے "یوم پاکستان" ہندوستان کے گوشے گوشے میں منانے کا فیصلہ کیا تو سجاد ظہیر نے "قومی جنگ" میں "پاکستان کیوں بنے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اس میں انہوں نے ہر محب وطن کو واضح طور پر بتاتے ہوئے کہا۔ کچھ مدت سے احراری لیڈر صوبوں میں کانفرنسیں اور جگہ جگہ جلسے اور "حکومت الہیہ" کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ اپریل کو سہارنپور کے سالانہ اجلاس میں "حکومت الہیہ" کی جو تجویز پیش کی تھی شاید کوئی مسلمان ہو جسے اس سے اختلاف ہو لیکن احرار ایسی مذہبی جماعت کی سیاسی سرگرمیوں کو دیکھ کر ہر محب وطن کے دل میں رہ رہ کر سوال اٹھتا ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر آخر مجلس احرار کیا کہنا اور کیا کرنا چاہتی ہے۔ ہمارے نزدیک صرف کانگرس اور مسلم لیگ کے اتحاد اور مسلمان قوموں کے حق خود ارادیت پر ہی ایک صحیح اور پائیدار "قومی اتحاد" کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

سجاد ظہیر کے "پاکستان" اور ڈاکٹر محمد اشرف کے قائداعظم کے حق میں "قومی جنگ" کا مضمون "ہر محب وطن کو قائداعظم کی حمایت کرنی چاہیے" نے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں کمیونسٹ پارٹی کے مسلمان رہنماؤں کے متعلق ایک عجیب سی سیاسی ہلچل مچادی۔

سجاد ظہیر تو پارٹی کے ہیڈ کوارٹر بمبئی میں بیٹھے تھے جبکہ ڈاکٹر محمد اشرف پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ "قومی جنگ" میں مضامین لکھ رہے تھے۔ "ہر محب وطن کو قائداعظم کی حمایت کرنی چاہیے" میں انہوں نے کہا "جمہوری آزادی اور رجعت پسندی کی طاقتیں آج پنجاب میں برسرپیکار ہیں اس لیے اس کا ہندوستان کی سیاست پر گہرا اثر پڑے گا۔ اس وقت اصل لڑائی جناح اور خضر حیات کے درمیان نہیں بلکہ مسٹر جناح اور سامراج کے مابین ہے۔" قوم پرست حلقے اس بات کو صاف طور پر نہیں سمجھتے کہ یونینسٹ پارٹی کی بظاہر غیر فرقہ وارانہ وزارت کے پیچھے کون سی طاقت کام کر رہی ہے۔

یونینسٹ پارٹی پنجاب کے لگ بھگ تین ہزار بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کے مفاد سے عبارت ہے جو چالیس فیصد زمین کے مالک ہیں اور جن کے بل بوتے پر سامراج پنجاب ہی پر نہیں بلکہ سارے شمال مغربی ہندوستان میں جمہوری تحریک کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتا۔

سیاسی جمہوری پارٹیوں کے آپس میں جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ صوبے کے گزشتہ انتخابات میں کامیاب ہوگئے اور آج سفید پوش ذیلداروں اور ڈپٹی کمشنروں اور برادری کے بل پر جمے ہوئے ہیں۔ ان جاگیرداروں اور سامراج پرستوں میں مختلف ملتوں کے آدمی ہیں۔ گزشتہ انتخابات کے بعد جب سر سکندر حیات اور اس کے ساتھی لکھنؤ اجلاس کے بعد واپس آئے ہیں تو ان سب کے سب ساتھیوں نے ایک ہاتھ سے مسلم لیگ کا فارم بھرا اور دوسرے ہاتھ سے "زمیندارہ لیگ" قائم کی لیکن آج صورتحال بالکل تبدیل ہوگئی۔

ہندو سبھا کو چھوڑ کر باقی وطن پرست حلقے بالعموم اس حقیقت کو مانتے جارہے ہیں کہ حق خودارادیت کا مطالبہ ہماری گزشتہ آزادی کی جدوجہد کی پیداوار اور ہمارے عوام کے بڑھتے ہوئے سامراج دشمن اور کامل آزادی کے جذبہ کی نشانی یعنی خود سوراج کی تعبیر ہے۔ چنانچہ حق جداگانہ کے مان لینے سے علیحدگی اور تقسیم کے بجائے ملک میں ایک وسیع اور مستحکم اتحاد کی بنیاد پیدا ہوگی بہرحال یہ مطالبہ ہر اعتبار سے جمہوریت کی تکمیل ہے۔

کمیونسٹ اور مسلم لیگ

پنجاب میں کمیونسٹوں نے خضر حیات ٹوانہ کی چالوں کا ایسا بھانڈا پھوڑا کہ پنجاب میں کانگرس اور مسلم لیگ کے اتحاد کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوگئیں۔ انہوں نے نئی عوام کی تحریک کو یونینسٹوں سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھنے کو کہا کیونکہ یہ نوکر شاہی کے آلہ کار تھے۔ پنجاب میں یہ تبدیلی دیکھتے ہوئے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں ایک یونینسٹ ممبر نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ہم نے مرکزی حکومت سے دوبارہ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے جواب دیا کہ صرف چند

کمیونسٹ گڑبڑ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پنجاب میں کمیونسٹوں نے خاص طور پر مسلمان کمیونسٹوں نے خود مسلم لیگ تنظیم کو مضبوط کرنے اور انہیں عوام دوست بننے اور عوام سے رابطہ بڑھانے پر زور دیا۔

1944ء یوم مئی کے موقع پر آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی نے جس بھرپور انداز میں اپنے ہم وطنوں میں مجاہدین آزادی کی خدمت میں زبردست ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہوئے تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے درخواست کی کہ اس نازک وقت میں ملک اور قوم کو بچانے کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ گزشتہ دو سال سے ملک کو فاشسٹوں کے شدید حملے کا خطرہ ہے۔ کیونکہ ہمارے وطن کی سرزمین پر جنگ کے بادل گھرے سے گھرے ہوتے جا رہے ہیں۔ جاپانی ہماری سرحدیں عبور کر کے وطن میں گھسنے کی بے کار کوشش کر رہے ہیں۔ آسام اور مشرقی بنگال جنگ کی وجہ سے قحط کا شکار بنے۔ عالمی جنگ کی وجہ سے ملکی معیشت کی حالت ڈانواڈول ہے۔ عوام کو پیداواری عمل سے بالکل پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے حوصلے اور ارادے بلند ہیں۔ ملک کے عوامی لیڈر جیلوں میں بند ہیں ان کی وہاں اور سارے ملک میں بنگال کی امداد کے لیے تحریک کا نئے سرے سے آغاز کرنا اب ہمارا قومی فرض ہے۔

پنجاب میں اس تحریک کو متحرک کرنے میں ڈاکٹر محمد اشرف بڑے فعال ثابت ہو رہے تھے انہوں نے پنجاب کے کانگرسی اور محبان وطن کارکنوں اور رہنماؤں کو آپس میں ملانے کی کوششوں کو اور تیز کر دیا۔ وہ جگہ جگہ پنجاب کی خضر حیات حکومت کو "ٹوڈی حکومت" سے تعبیر کر رہے تھے۔ یونینسٹ وزارت کی بوکھلاہٹ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مئی کے آخر میں پنجاب کی یونینسٹ حکومت نے ڈاکٹر محمد اشرف کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پنجاب سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

پنجاب میں کمیونسٹوں کی "کانگرس اور لیگ اتحاد" کی تحریک اس قدر مقبول ہو رہی تھی کہ پنجاب کے یونینسٹ جاگیردار طبقہ کے نمائندہ اخبارات نے، جن میں ہندو مسلمان سبھی شامل تھے اور جن کی سرپرستی حکومت پنجاب کر رہی تھی کمیونسٹوں کے خلاف اپنا پراپیگنڈہ تیز کر دیا۔

مہا سبھائی اخبارات، کانگرس اور مسلم لیگ کے اتحاد کی تحریک کے قائدین، جن کا

تعلق کمیونسٹوں سے تھا انہیں خوب جلی کٹی سنا رہے تھے۔ جبکہ حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے مسلمانوں کے نمائندہ اخبارات مسلم لیگ اور یونینسٹ حکومت کے باہمی اختلافات کو نظرانداز کر کے ان کے شیر و شکر ہونے کی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا تھا کہ مسلم لیگ کی مجلس عمل کے اجلاس کا دن قریب آ رہا تھا۔

مسلمانوں میں یونینسٹوں سے بیزاری کا اظہار 25'26 مئی تک بننے والی "محلہ وار لیگی کارکنوں" تک ہونے لگا انہوں نے محلہ کی سطح پر اپنے اپنے جلسوں میں قائداعظم اور مسلم لیگ پر اعتماد کا یقین دلاتے ہوئے خضر حیات کے رویے کی شدید مذمت بھی کرنا شروع کر دی۔

27 مئی رات کے گیارہ بجے جب مسلم لیگ کی "مجلس عمل" نے پنجاب کے وزیراعظم ملک خضر حیات ٹوانہ کو مسلم لیگ سے غیر معینہ عرصہ کے لیے نکال دیا۔ تو یہ خبر شہر بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شہر لاہور میں چونکہ دفعہ 144 نافذ تھی اس کے باوجود چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹ کر لوگوں نے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا۔

ساری رات میں تمام علاقوں کے محلوں میں گھومتا رہا۔ وہاں ہر چہرے پر خوشی اور مسرت کی جھلک دیکھی اور کئی جگہ پر تو لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ اب "لیگ پاک" ہوئی ہے۔

نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملاقات

28 مئی کی صبح کو صوبائی مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں پنجاب کے تمام اضلاعی مسلم نمائندے موجود تھے۔ انہوں نے پنجاب صوبہ کو پانچ ڈویژن میں تقسیم کر کے ہر ڈویژن میں ایک آرگنائزنگ سیکریٹری مقرر کیا۔

اس طرح پنجاب میں مسلم لیگ کو جمہوری تنظیم بنانے کا عمل شروع ہوا۔

شام کے اجلاس میں نوابزادہ لیاقت علی خان جنرل سیکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور کنوینر "مجلس عمل" نے کہا پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ ہے اگر کوئی جماعت یہاں سامراجی چالوں کو ناکام بنا سکتی ہے تو وہ صرف "مسلم لیگ" ہے۔

میں 29 مئی کو نوابزادہ لیاقت علی خان سے ملا اور ان سے پوچھا۔ "مرکزی اسمبلی میں کانگرس لیگ میں سمجھوتے کی طرف جس شخص نے زبردست قدم بڑھایا تھا کیا وہ آج بھی اس سمجھوتے پر کاربند ہے۔

لیاقت علی خان کا جواب تھا "ہمارا سب سے پہلا اور بنیادی کام" مسلم لیگ کو جمہوری بنیادوں پر استوار کرنا ہے دوسری جماعتوں کی طرف ہمارا رویہ اسمبلی میں اور اسمبلی کے باہر وہی ہوگا جو ہم نے مرکزی اسمبلی میں اختیار کیا تھا۔ ہم عوام کے مفاد کے لیے ہر قدم کی حمایت کریں گے اور نیک کاموں میں ہر ایک سے اشتراک ہمارا اصول ہوگا۔

یونینسٹ لیگ کے تنازعہ کے بارے میں نوابزادہ نے کہا۔ "یہ لیگ اور خضر کے درمیان جھگڑا نہیں ہے بلکہ یہ پنجاب کے عوام اور نوکر شاہی اور اس کے ایجنٹوں کا تصادم ہے۔ ہم پنجاب میں صرف مسلمانوں کے اقتدار کے لیے نہیں لڑ رہے بلکہ ہم تو یہاں پر تمام فرقوں اور جماعتوں کی مشترکہ وزارت کے لیے کوشاں ہیں جو عوام کی نمائندہ وزارت ہوگی اور ان کے مفاد کی نگران ہوگی۔

میں نے نوابزادہ سے پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے اس بیان کے بارے میں رائے طلب کی تو جواب ملا میں نے آپ کے بیان کو پورے غور سے پڑھا اور جو لائحہ عمل آپ نے اختیار کیا ہے وہ ہر محب وطن پنجابی کو اختیار کرنا چاہیے۔

مسلم لیگ کے رہنماؤں کے علاوہ مختلف ضلعوں سے آئے ہوئے مقامی لیگیوں سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ وہ سب شہری آبادی' غذا کے متعلق راشننگ اور کنٹرول کے علاوہ زرعی پیداوار کی مناسب مقررہ قیمت کانگرسیوں کی رہائی شہری مزدوروں کو مناسب مہنگائی بھتہ ایسے سماجی مطالبات کو صاف اور واضح طور پر اپنے عملی پروگرام کا حصہ نہیں بنا سکے۔ لیکن وہ ان سب مسائل سے آگاہ ضرور ہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کی سطح پر لیگ کی پشت پر مسلم عوام کی کوئی منظم طاقت نہیں تھی۔ شہروں اور قصبوں کے مسلمان جو سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو چکے تھے لیگ کے ساتھ تھے اور یونینسٹ پارٹی کے سخت مخالف تھے لیکن یونینسٹ راج میں بڑے بڑے زمینداروں کے ظلم اور نوکر شاہی کی سختیوں نے عوام کو بالکل کچل دیا تھا۔

ان کی بے بسی اتنی بڑھ چکی تھی کہ انہیں اپنے جائز حقوق کا بھی احساس نہیں تھا اور وہ اپنے زمیندار آقاؤں کے ظلم کے سامنے گردن جھکا دینے کے عادی تھے۔ بعض اوقات زمینداروں کے پیر (مذہبی پیشوا) اور سرکاری حاکم ہوتے تھے۔ اس لیے "یونینسٹ لیگ" کے پردے میں لیگ کو نقصان پہنچاتے رہے وہ اپنے آپ کو "لیگی" کہتے تھے لیکن ان کے اپنے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ لیگ کا اثر عوام میں نہ بڑھنے پائے۔

مسلم لیگ سے خضر حیات ٹوانہ کے اخراج کے بعد لیگ کے دروازے عوام کے لیے کھل گئے۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے تین دستوں نے مغربی پنجاب کا دورہ کیا اور طالب علموں کے لیے جلسے کیے۔

اس صورتحال کے پیش نظر یونینسٹوں نے لیگ کے خلاف اپنی سرکاری قوت کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ لاہور' امرتسر' جالندھر اور گوڑگاؤں میں لیگ کے جلسوں پر پابندی عائد کرنے کے لیے دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا۔

لاہور کی مسلم اردو صحافت

لاہور سے اردو کے چار بڑے مسلم روزنامے "انقلاب' احسان' شہباز اور زمیندار" جو مسٹر جناح اور ملک خضر حیات کے اختلافات سے پہلے مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے یکدم اپنا لائحہ عمل تبدیل کر کے مسٹر جناح مسلم لیگ اور مجلس عمل سے نالاں و بیزار ہو گئے تاہم ایک روزنامے "زمیندار" نے اپنے رویئے کو برقرار رکھا۔

زمیندار جو مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ قومی جماعت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کا اب بھی یہی موقف تھا لیکن دوسری طرف دو ماہ پہلے "شہباز" کے ایڈیٹر مرتضیٰ احمد خان میکش اور اڈیٹوریل اسٹاف کے تمام اراکین چاہتے تھے کہ جس دن شوکت حیات خان کو وزارت سے برطرف کیا تھا' وہ گورنر پنجاب کے اس فعل کی مذمت اور مسلم لیگ کی حمایت میں اڈیٹوریل شائع کریں لیکن اخبار کے یونینسٹ مالک سید امجد علی شاہ ایم ایل اے نے اس کی اجازت نہیں دی۔ چونکہ میکش اور ان کے ساتھی ضمیر فروشی کے لیے تیار نہیں ہوئے اس لیے انہیں "شہباز" سے علیحدہ ہو جانا پڑا۔ اس کے

بعد ملک خضر حیات خان نے "شہباز" کو تیس ہزار روپیہ پر خرید کر اپنی پسند کا دوسرا ایڈیٹر مقرر کیا تو دو دن کے بعد جب "شہباز" شائع ہوا تو لاہور کی گلیوں میں اس اخبار کو خوب جلایا گیا۔

"احسان" کے متعلق بھی ایسا ہی تھا اخبار کے مالک تو مسلم لیگ سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن ان کا تجارتی جذبہ ان کے وطنی و ملی جذبے سے زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔ اس لیے انہوں نے بھی مسلمانوں میں پھوٹ کا نعرہ بلند کر کے ٹسوے بہانا اور اس طرح مسلم لیگ اور اس کی پالیسی کی مخالفت کر کے یونینسٹوں کی حمایت کرنا ضروری سمجھا۔

جبکہ انقلاب کھلے بندوں مسلم لیگ کی مخالفت اور یونینسٹوں کی حمایت کر رہا تھا۔ درحقیقت پنجاب کے ان مسلم اخبارات "شہباز" "احسان" اور "انقلاب" کو سرکار کی طرف سے مالی امداد ملتی تھی بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب کبھی یونینسٹ وزارت پر چوٹ پڑتی تھی تو اس امداد کی مقدار بڑھادی جاتی۔ لاہور میں یہ خبر گرم تھی کہ جب سے مسلم لیگ اور یونینسٹ کا جھگڑا ہوا ہے حکومت پنجاب نے ہر اخبار کا پندرہ ہزار سالانہ سے بڑھا کر بیس اور بعض روایتوں کے مطابق پچیس ہزار سالانہ فی اخبار کر دیا۔ اس امداد کے لیے بہانہ یہ بنایا کہ سب اخبار ایک ہفتہ وار ایڈیشن شائع کرتے ہیں جن کی ایک مقررہ تعداد حکومت فوج میں تقسیم کرنے کے لیے خریدتی ہے۔ مزید برآں ان اخبارات کو نیشنل وار فرنٹ کے اشتہار بھی دیئے جاتے ہیں۔

صرف روزنامہ "زمیندار" کو کوئی مالی امداد نہیں دی جاتی، مسلم لیگ کے موقف کی صحیح نمائندگی کرنے پر اس روزنامے کی اشاعت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

"پرتاپ" "ویربھارت" "پربھات" اور "میلاپ" ایسے اُردُو روزنامے جن کے مالک ہندو تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ اخبارات کانگرسی پالیسی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ روزنامے کانگرسی روپ اختیار کر کے عوام میں کانگرس کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ان میں تنگ نظر فرقہ پرستی کا عنصر غالب رہتا ہے۔

کانگرس کی غیر فرقہ وارانہ قومی پالیسی کو مسخ کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے، چنانچہ "لیگ اور یونینسٹ جھگڑے کے متعلق جو رویہ ان اخبارات نے اختیار کیا وہ

کانگرسی نہیں بلکہ مہا سبھائی تھا۔

4 جون 1944ء کو مہا سبھائی لیڈر بخشی تلک چند کے گھر پر تمام ہندو اخباروں کے نمائندوں کی خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں مسلم لیگ کی مخالفت اور خضر حیات خاں ٹوانہ اور یونینسٹ وزارت کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا گیا چنانچہ اس کے بعد تمام اخبارات براہ راست مہا سبھائی ہدایت کے مطابق عمل کرنے لگے۔ ظاہر ہے اس وقت کی مجنونانہ فرقہ پرستی سے کانگرس کا دور سے بھی واسطہ نہیں۔ کانگرس نے اپنے دہلی کے ریزولیشن میں صوبوں کی مکمل خود اختیاری کے حق کو تسلیم کیا تھا۔ کانگرس اور لیگ کی پوزیشن میں کوئی بنیادی فرق نہیں لیکن یہ اخبارات صاف صاف کانگرس کی مخالفت کی ہمت نہیں کر سکتے اس لیے وہ کانگرس کے بھیس میں دراصل مہا سبھائی فرقہ پرستی کا پرچار کرتے رہے۔ ایسی صورت میں ان کا نوکر شاہی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر یونینسٹ کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت کرنا کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں کہ پنجاب کی وزارت نے سینکڑوں ایسے کانگرسیوں کو جیل میں بند کر رکھا ہے جو فاشزم کے جانی دشمن اور ملک کو بیرونی حملہ سے بچانا چاہتے۔

انگریزی روزنامہ "ٹریبون" کو بھی عام طور پر یہ لوگ کانگرسی اخبار سمجھتے اور یہ اخبار خود بھی یہی تاثر قائم کرنا چاہتا۔ لیکن درحقیقت اس پہ کئی سال سے یونینسٹ قابض ہیں اور وہی اس کی پالیسی کو کنٹرول کرتے ہیں۔

یونینسٹ وزیر مال منوہر لال اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبر ہیں اور اخبار پر اُن کی ملکیت کا پورا پورا اثر ہے وہ خود لکھ پتی سرمایہ دار اور کانگرس کے سخت مخالفین میں سے ہیں اس لیے یہ اخبار موجودہ وزارت اور نوکر شاہی کے جمود کو قائم رکھنے کی پالیسی پر کاربند ہے اس لیے مسلم لیگ کی مخالفت اس کی پالیسی کا ایک حصہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب پنجاب میں صحافتی آزادی کو ان مختلف طریقوں سے ختم کر دیا گیا ہو تو وہاں کے واقعات کی صحیح اہمیت کو پنجاب کے باہر کے لوگ مشکل سے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے قوم پرور اخبارات ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مسلم لیگ کی تحریک پنجاب میں جمہوریت کو مضبوط کر کے کانگرس اور لیگ سمجھوتے کے امکانات اور نوکر شاہی کی شکست کے اسباب پیدا کرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ لاہور سے اپنا روزنامہ شائع کرنا چاہتی ہے جو مُستند ہو' پنجاب اسمبلی کے معزز کانگرسی ممبران نے دوران گفتگو مجھ پر انکشاف کیا کہ آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ پنجاب میں کوئی کانگرسی اخبار بھی ہے یہاں ایسا کوئی اخبار نہیں جو ہماری ترجمانی کرتا ہو۔

23 مارچ 1944ء کے "یوم پاکستان" کے موقع کے بعد کانگرس اور لیگ اتحاد کے لیے کی گئی کوششوں کی کامیابی کے امکانات اس وقت صاف دکھائی دینے لگے جب گاندھی نے اس سیاسی بحران کے حل کے لیے جناح سے ملاقات کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

سجاد ظہیر نے جو سی پی آئی کیمونسٹ پارٹی انڈیا کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے لاہور کا دورہ کیا اور پنجاب کیمونسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین کو ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اسے عوامی تنظیم میں بدل دیں تاکہ مسلم لیگ کا کنٹرول عوام کے ہاتھوں میں آجائے تاکہ کانگرس اور مسلم لیگ میں اتحاد کی صورت نکل آئے۔ اپریل میں جب سوہن سنگھ جوش اور دانیال لطیفی محمد علی جناح سے ملے تو انہوں نے کیمونسٹوں کی اس کوشش کو بہت پسند کیا۔ لیکن لیاقت علی خان نے دانیال اور جوش پر واضح کر دیا کہ کوئی بھی کیمونسٹ اگر وہ مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہتا ہے تو اسے پہلے کیمونسٹ پارٹی سے مستعفی ہونا پڑے گا۔

جولائی تک پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ وزارت نے مسلم لیگ اور کیمونسٹ پارٹی کے سیاسی عمل کو روکنے کی یہاں تک کوشش کی کہ صوبائی مسلم لیگ کو اپنے اجلاس کے لیے اسلامیہ کالج کا ہال اور ہوسٹل تک نہ دیا تو انہوں نے اپنا یہ اجلاس برکت علی محمڈن ہال میں منعقد کیا۔

24 جولائی 1944ء ہی سے لاہور میں روزنامہ "نوائے وقت" کی اشاعت کا آغاز ہوا' مسلم عوام نے جس محبت سے اس اخبار کا خیر مقدم کیا اس سے ملک میں سیاسی عمل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "نوائے وقت" کی اشاعت کو بعض اخبار اپنی طنز کا نشانہ بنانے سے بھی نہیں چوکے۔

پنجاب میں مسلم لیگ کے مقابل "زمیندارہ لیگ" پر یکدم خضر حیات ٹوانہ نے

یونینسٹ پارٹی کی طرف سے عنایات کا نیا دور شروع کیا۔ جولائی میں "ٹریبون" کے نامہ نگار جو یونینسٹ پارٹی کے معتبر صحافی تھے انہوں نے معتبر ذرائع سے لکھا۔ "ملک خضر حیات ٹوانہ' نواب عاشق حسین اور سر جمال خان لغاری" "زمیندار لیگ" کے لیے پچیس پچیس ہزار چندہ دے رہے ہیں حالانکہ یہ تینوں بزرگ سات برس سے مسلم لیگ کے سرکردہ ارکان چلے آرہے تھے صرف دو ماہ قبل تک لیگ کے برسراقتدار پارلیمنٹری لیڈروں میں سے تھے کیا ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ انہوں نے سات برس میں "مسلم لیگ" کو مجموعی طور پر کس قدر چندہ دیا؟ جہاں تک ہمیں یاد ہے ان تینوں وزراء کا سات سال کا چندہ مل کر بھی پچیس ہزار نہیں بنتا ہوگا۔



باب 10

مسلم لیگ میں شمولیت

جولائی ہی میں کیمونسٹ پارٹی کی اعلیٰ قیادت نے پنجاب میں تین مسلمان کیمونسٹوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کے لیے اجازت دیتے ہوئے کہا ہمیں امید ہے کہ کیمونسٹ پارٹی کی طرح مسلم لیگ کو بھی عوامی جماعت بنانے کی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کریں گے۔

اس طرح میں دانیال لطیفی اور عطاءاللہ جہانیاں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

پنجاب مسلم لیگ نے ہمیں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری ممتاز دولتانہ نے دانیال لطیفی کو پنجاب مسلم لیگ کے مرکزی دفتر میں آفس سیکریٹری کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔

لاہور کے سیاسی حلقوں میں میاں افتخار الدین کے بعد ممتاز دولتانہ ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب ثروت سیاستدان تھے۔ ممتاز دولتانہ 1940ء میں لندن سے بیرسٹر بن کر لوٹے تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دوران تعلیم وہ انڈین مجلس کے صدر رہے۔ فلسفہ اقتصادیات اور اسلامیات کے مضامین بڑے اعزازات کے ساتھ پاس کئے وطن لوٹنے کے بعد وہ اپنی آبائی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے اپنے آبائی گاؤں "لڈن" چلے گئے۔ 1942ء میں مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کر کے قائداعظم کی رہنمائی میں سیاست کرنے لگے۔

لاہور میں "ممتاز ہاؤس" ہی مسلم لیگ کی سیاست کا مرکزی گڑھ تھا پنجاب کے بڑے سیاسی رہنما اور کارکن یہاں جمع ہونے لگے۔

پنجاب چونکہ مسلم اکثریت کا صوبہ تھا اس لیے آزادی کی تحریک میں مسلمان جمہور کی بیداری ضروری تھی اس ضمن میں کانگرس کسی حد تک ناکام رہی تھی۔ کیونکہ اس کی رسائی پنجاب کے شہروں اور منڈیوں تک محدود تھی دوسرا کانگرس کے پاس مسلمانوں کی حقیقی آزادی کے لیے کوئی صاف اور واضح پیغام نہیں تھا۔ مجلس احرار نے کسی حد تک مسلمان عوام کو متحد کیا تھا مگر "پاکستان" کے متعلق ان کی گومگو کی پالیسی نے عوام میں آہستہ آہستہ اپنا اثر زائل کر دیا اس لیے کہ مسلم لیگ کا مسلمانوں کے لیے "پاکستان" کا تصور خاصی کشش رکھتا تھا۔

پنجاب کا سیاسی دورہ

سب سے پہلے مجھے پنجاب کے منٹگمری ضلع میں بھیجا گیا۔

منٹگمری کا رقبہ نو آبادیاتی علاقہ ہے، حکومت نے لوگوں کو قسطوں پر زمین دے رکھی تھی لوگ ابھی تک مالک بھی نہیں کہے جا سکتے تھے۔ اس لیے نوکر شاہی ہر وقت لوگوں کو دھمکا سکتی تھی لوگوں کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق تھا کہ ان کے مالکانہ حق ملکیت کو کہیں ضبط نہ کر لیا جائے۔ منٹگمری کے مقابلے میں لائلپور میں کسان تحریک کافی مضبوط تھی جہاں کے مسلمان کسانوں کو بھی اس تحریک نے متاثر کیا اور آج تقریباً پندرہ بیس ہزار کسان مسلم لیگ میں حصہ لے رہے ہیں۔ زعما کا وفد جب لائلپور کا دورہ کر رہا تھا تو انہی کارکنوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی مسلم لیگ کی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ واقعی یہ ایک کامیاب ترین کانفرنس تھی۔

منٹگمری میں میرے قیام کا بندوبست میاں عبدالحق کے ہاں تھا۔

میاں عبدالحق ارائیں فیملی کے متمول زمیندار تھے۔ وہ چوہدری رحمت علی کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ چوہدری رحمت علی نے ہندوستان میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے علاقوں کو ملا کر علیحدہ مسلمان ریاست کو "پاکستان" کا نام دیا تھا۔ مین چونکہ کمیونسٹ پارٹی سے مسلم لیگ میں شامل ہوا تھا اس لیے میرے نظریات ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے جن کے متعلق مسلم لیگیوں کی اپنی ایک رائے تھی اس لیے پہلے تو ان کے ساتھ خوب بحث و مباحثہ ہوا ہمارے خیالات ہی نہیں عمروں میں بھی فرق تھا میں

تیئس چوبیس سال کا نوجوان تھا بڑی کوششوں کے باوجود میں انہیں متاثر نہیں کر سکا اس کے باوجود انہوں نے مسلم لیگ کی تنظیم سازی کے لیے میرے فیلڈ میں عملی کام کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس وقت مسلم لیگ بڑے شہروں اور قصبوں میں صرف پڑھے لکھے طبقے میں مقبول تھی اس لیے منٹگمری شہر میں مسلم لیگ صرف وکلاء کے قبضے میں تھی شیخ نثار احمد اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ حفیظ آغا' عبدالحمید عاصی اور غلام جیلانی نامور وکیل تھے۔

غلام جیلانی کا تعلق ککے زئی برادری سے تھا اس لیے انہوں نے میرا بڑا خیال رکھا منٹگمری میں چوہدری نذیر احمد سے بھی ملاقاتیں رہیں وہ وکالت کے ساتھ ساتھ صحافت بھی کرتے تھے وہ اس وقت "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار بھی تھے اگرچہ وہ اس وقت مسلم لیگ میں شامل تھے لیکن مسلم لیگیوں کو اُن پر زیادہ اعتماد نہیں تھا۔ چوہدری نذیر احمد کا اپنا ایک گروپ تھا۔ اس گروپ کے سب سے معتمد شخص نسیم حسن تھے یہ سب نیشنل وار فرنٹ میں کام کر رہے تھے۔ سر سکندر حیات کے بعد خضر حیات سے بھی ان کے میل جول کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا اس لیے کٹر مسلم لیگ کا گروپ انہیں آگے نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ لیکن چوہدری نذیر احمد تحریر و تقریر میں سب سے جاندار تھے ان کے پاس اپنے تمام دیہاتوں کی نقلیں اور ریکارڈ محفوظ تھا۔ صحافت کے علاوہ شعبہ ادب سے بھی ان کا بڑا گہرا لگاؤ تھا اکبرالٰہ آبادی کا کلام تو انہیں ازبریاد تھا محفل کے آدمی تھے محفل بنانا اور سجانا انہیں خوب آتا تھا۔ اس لیے شعروادب صحافت اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے اُن کی محفلوں میں شریک ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ یارانِ محفل کے لیے انہوں نے جس طریقے اور سلیقے سے اپنے گھر کی آرائش و زیبائش کر رکھی تھی وہ بھی قابل دید تھی۔

منٹگمری ضلع کے قیام کے دوران شہری اور دیہی علاقے میں مسلم لیگ کے علاوہ سکھ کسان سبھا اور کمیونسٹ کارکنوں نے مسلم لیگ کے پاکستان کے موقف اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے لیے جدوجہد کو تیز تر کر دیا۔ گاؤں گاؤں مسلم لیگ کو عوامی سطح پر منظم ہوتا دیکھ کر یونینسٹ حکومت نے بھی پنجاب کا کوئی ایسا گاؤں نہیں چھوڑا جہاں سے پٹواری سے لے کر نمبردار اور مال آفیسر سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک کو مجبور کر

کے بے بس زمینداروں سے "زمیندار لیگ" کے لیے چندہ وصول نہ کیا ہو۔
مسلم لیگ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہی تھی کہ اُس نے زمیندار لیگ کے ان جبری چندوں کے خلاف تحریک چلا کر عوام کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ جہاں جہاں مسلم لیگ کے جلسوں کا اعلان ہوتا وہاں پولیس بڑی شد ومد سے مداخلت کرتی۔
ہم منٹگمری ضلع پاک پتن میں پورا ایک ہفتہ رہے بابا فرید گنج شکرؒ کے عرس مبارک کا موقع تھا پورا ہفتہ ہم نے عوام کے سمندری ریلے میں گزارا ہر روز کئی کئی جگہوں پر عوامی اجتماعوں کے درمیان مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا ہمارے ساتھ رانا نصراللہ اور ان کے ایک عزیز رانا الہ دادیا خداداد نے سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
ہم شیرگڑھ اور دیپالپور بھی گئے دلچسپ بات یہ کہ شیرگڑھ جو ایک مشہور رُوحانی گدی ہے اور گدی نشین سید محمد حسن تو یونینسٹ پارٹی کے زبردست حامی تھے جبکہ اُن کے بھتیجے عباس علی شاہ مسلم لیگ کے زبردست ہمنوا تھے اس لیے شیرگڑھ میں ایک جلسہ رکھا گیا جس میں کسانوں مزارعوں اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی کثیر تعداد کے علاوہ مدرسوں اور مسجدوں کے طالب علموں نے بھی بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ شرکت کی۔
منٹگمری ضلع کے دورہ کے خاتمہ پر جب میں واپس لاہور آنے لگا تو میاں عبدالحق نے اپنی کمال شفقت سے مجھے نوازا انہوں نے میرے لیے کھادی کی منقش جائے نماز ایک ترکی ٹوپی اور بیس گز کی بہت ہی نفیس قسم کی کھادی (نفیس کھدر) دی۔ اس طرح ہم پہلے مسلم لیگی تھے جنہوں نے کھادی کا استعمال شروع کیا۔
مسلم لیگ میں شامل تیسرے کمیونسٹ عطاءاللہ جہانیاں کا تعلق جہانیاں سے تھا جو ملتان کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ضلع ملتان میں پنجاب کے بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار تھے جو ہمیشہ برسراقتدار کے ساتھ رہے زمینداری اور جاگیرداری کے ساتھ خانقاہوں کے گدی نشینوں میں گیلانی قریشی گردیزی اور خاکوانی صدیوں سے ایک دوسرے کے مخالف چلے آرہے تھے لیکن انگریز نوآبادیاتی دور میں یہ سب یکجا ہو گئے۔
عطاءاللہ جہانیاں نے اس ضلع میں سب سے پہلے جہانیاں میں جہاں علاقے کے تحصیلدار نے زبردستی قرضہ جنگ وصول کرنا شروع کر دیا تھا مسلم لیگ تحریک کا یہ اثر

ہوا کہ اس کو کہنا پڑا جس کی مرضی ہو وہ قرضہ جنگ دے ہم کسی سے زبردستی نہیں کریں گے اس کے ساتھ ذیلداروں اور پٹواریوں نے زمینوں کے انتقال کے ساتھ پانچ روپے وصول کرنے شروع کیے تھے دوسرے ہی دن ذیلدار کو خود گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کے دروازوں پر دستک دے کر روپے واپس کرنے پڑے۔ پنجاب میں خلافت کے بعد پہلی بار پھر سے مسلمانوں میں اس قدر وسیع اتحاد ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی تمام سیاسی تحریکوں کے متعدد کارکن مسلم لیگ کے ذریعے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے تھے۔

دسمبر 1944 کو عطااللہ جہانیاں نے اپنے گاؤں جہانیاں میں مسلم لیگ کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس سے پہلے علاقے کے لیگی کارکنوں کے چار دستوں نے آس پاس کے دیہاتوں میں جاکر عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچایا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر گاؤں میں لیگ کے کارکن پیدا ہونے لگے۔ اس کانفرنس میں تقریباً آٹھ ہزار کسانوں نے شرکت کی جو مختلف ٹولیوں میں پندرہ پندرہ میل سے پیدل چل کر آئے تھے ان میں چوتھائی تعداد اُن فوجی پنشنروں کی تھی جن کو اس علاقے میں زمین عطیہ ملی تھی جب کہ باقی لوگ ملتان کے قدیمی باشندے تھے اور وسطی پنجاب کے آبادکار تھے۔ اس کانفرنس میں ممتاز خان دولتانہ جنرل سکریٹری صوبائی مسلم لیگ اور صدر نواب افتخار حسین ممدوٹ' چوہدری ظفراللہ خاں' شوکت حیات' مولانا ظفر علی خان نے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت شوکت حیات نے کی چوہدری ظفراللہ خان نے وائسرائے کی حالیہ تقریر یونینسٹ پارٹی اور زمیندارہ لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ہمارا علاقہ پنشنروں اور عطیہ داروں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے کا ملکی دفاع میں بڑا حصہ ہے۔ یہاں پر افسران نے زمیندارہ لیگ کے لیے چندوں کی جبری وصولی کرکے عوام میں ملکی دفاع کے خلاف بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لوگ پہلے ہی فصل ربیع کی اوسط پیداوار میں کمی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ کیونکہ انہیں ایک ہزار زرمالکانہ کے ساتھ پانچ سو روپے رشوت اور جبری چندہ کی مد میں بھی دینا پڑتا ہے۔

شوکت حیات نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا گاندھی اور قائداعظم کی ناکام ملاقات پر ہمیں افسوس ہوا ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ ہم سکھوں کو بھی کہتے ہیں کہ وہ

"پاکستان کے جائز مطالبے کی مخالفت نہ کریں پاکستان میں ان کے تہذیبی مذہبی اور سیاسی حقوق بالکل محفوظ رہیں گے۔ آخر میں عطاللہ جہانیاں نے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا کہ "پاکستان ہی ہندو مسلم اتحاد" کا واحد ذریعہ ہوگا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس قرارداد کی زبردست تائید کرتے ہوئے کہا کانگرس لیگ اتحاد کے بغیر پاکستان ملے گا اور نہ ہندوستان آزاد ہوگا۔

کانفرنس میں شرکت کے بعد میں نے مکمل رپورٹ کیمونسٹ پارٹی کے ترجمان ہفت روزہ قومی جنگ (اردو) اور پیپلز وار (انگریزی) کو شائع ہونے کے لیے بھیج دی۔

دسمبر تک پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کے علاوہ کانگرس نے بھی یونینسٹ پارٹی کی مخالفت شروع کردی۔ جس سے نہ صرف یونینسٹ حکومت بلکہ گورنر پنجاب بھی بڑے خائف ہوئے انہوں نے پنجاب میں کیمونسٹ پارٹی پر دوبارہ پابندی عائد کرنے کی مرکزی حکومت سے اجازت مانگی تو اُس نے کہا پارٹی میں صرف چند کیمونسٹ گڑبڑ کر رہے ہیں۔

پوٹھوہار کی سترہ روزہ سیاسی مہم

مسلم لیگ میں شامل بڑا زمیندار اور جاگیردار طبقہ بھی مسلم لیگ کے عوامی تنظیم بننے سے نالاں تھا۔ کانگرس کی طرح مسلم لیگ میں بھی ترقی پسند خیالات رکھنے والے کو کیمونسٹ کہہ کر ملعون قرار دینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بنگال مسلم لیگ کے صوبائی وزارتی گروہ نے مولوی ابوالہاشم اور اُن کے ساتھیوں کو کیمونسٹوں کا باقاعدہ ایجنٹ جبکہ پنجاب میں یونینسٹ اخبارات نے نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کو کیمونسٹوں کے پٹھو کے نام سے بدنام کرنا شروع کردیا تھا۔

30 دسمبر 1944 سے جنوری 1945 تک پورے سترہ دن میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب ممدوٹ جنرل سکریٹری ممتاز دولتانہ اور راجہ غضنفر علی کے ساتھ سات اضلاع کا دورہ کیا۔ میدانی اضلاع کی بہ نسبت پہاڑی اضلاع کی صورتحال بالکل مختلف تھی۔

پوٹھوہار میں جہلم راولپنڈی اور کیمبل پور انتہائی غریب ترین علاقہ ہے جہاں کے لوگوں کی زندگی کا دارومدار فوج کی نوکری پر ہے۔ انہی علاقوں نے ہندوستانی فوج کے

لیے بہترین سپوت پیدا کیے۔ ان علاقوں میں آپ کو کوئی جوان آدمی نظر نہیں آئے گا سوائے عورتوں بوڑھوں اور بچوں کے یہی دیہاتوں کی کل کائنات ہے۔ بوڑھوں کی اکثریت فوجی پنشنروں کی ہے جنہیں نوکر شاہی اور فوج کی ہمدرد یونینسٹ پارٹی ڈرا دھمکا رہی ہے کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ میں کسی طرح بھی حصہ لیا تو اُن کی پنشن ضبط کرلی جائے گی۔ یہ تصویر کا ایک گھناؤنا رُخ ہے مگر آج حب الوطنی اور آزادی کا جو جذبہ ترقی کر رہا تھا وہ اتنا خام نہیں تھا کہ وہ ان دھمکیوں سے دب جاتے بلکہ انہوں نے ہر جگہ مسلم لیگ کے رہنماؤں کا شاندار استقبال کیا۔

جہلم چونکہ راجہ غضنفر علی خاں کا اپنا ضلع تھا اس ضلع کے دورے پر راجہ غضنفر علی خاں ہر جگہ پیش پیش رہے۔ اُنہیں ان دیہاتوں کی زندگی کا پورا تجربہ تھا انہوں نے ہر گاؤں میں کہا میں جانتا ہوں یہاں کیسے کیسے جوہری لوگ اور زمین ہے جسے غلامی کا زنگ کھا رہا ہے۔ ہمارے ساتھ آزادی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔

کیمبل پور کلب میں رات خوب محفل رہی۔ صبح مجھے راجہ غضنفر علی نے مخاطب ہو کر کہا "یار تم نے تو رات ہمیں حیران کردیا۔"

"کیوں ایسا کیا ہوا؟"

"یار اس انداز اور شان سے پینا اور جینا تم نے کہاں سے سیکھا۔"

"کمیونسٹ پارٹی" سے میرے پیچھے کھڑے کسی نے کہا تو میں نے کہا پارٹی سے ہم نے ایسے انداز سے مرنا بھی سیکھا ہے۔"

میری گرفتاری

پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب ممدوٹ کے علاقے کی دو تحصیلیں فاضلکا اور ابوہر میں منعقدہ جلسوں میں کی گئی تقریروں کی بنیاد پر حکومت پنجاب نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت میرے وارنٹ گرفتاری جاری کردیئے۔ چنانچہ پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری ممتاز دولتانہ ضلع فیروز پور سے سیدھا لاہور آنے کی بجائے مجھے اپنے ساتھ گاؤں "لڈن" لے گئے۔

چند دن کے بعد جب میں لاہور پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری گرفتاری کے لیے

خفیہ پولیس دن رات میرا پیچھا کر رہی ہے۔ میں نے بڑے محتاط طریقہ سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھا لیکن آخر کب تک؟ آخر میں نے کسی بڑے عوامی اجتماع میں اپنی گرفتاری پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں موقعہ کی تلاش میں تھا کہ یکدم ذہن میں لاہور کا سب سے بڑا ثقافتی میلہ آگیا' جسے میلہ چراغاں یا شالیمار باغ کا میلہ کہا جاتا ہے ایک بڑا موسمی تہوار تھا جسے پنجاب کے خاص طور پر ماجھے کے کسان جاٹ ہندو مسلمان اور سکھ سب مل کر مناتے تھے۔ اسی میلہ کی مناسبت سے مسلم لیگ نے باغبانپورہ میں دو روزہ مسلم کانفرنس منعقد کی۔ میلہ چراغاں یا شالیمار باغ کا میلہ مارچ کے آخری ہفتہ اور اتوار کو منایا جاتا ہے اس لیے دو روزہ کانفرنس کا اہتمام کیا۔ کانفرنس کا افتتاح ہفتہ کی رات کو کیا گیا تھا چنانچہ میں نے بھی اس روز کانفرنس کے جلسہ میں اپنی گرفتاری کو لازم بنا دیا۔ چنانچہ میں نے ہفتہ کے روز اپنے گھر پر کمیونسٹوں دوستوں کو ایک طرح کی الوداعی دعوت دی اس دعوت پر کرم سنگھ مان' فیروز دین منصور' تیجا سنگھ سوتنتر اور پیرن بھروچا بھی آئے تھے۔ ان سب دوستوں کو چونا منڈی سے خلیفہ کبابوں والے سے کباب لا کر کھلائے گئے تھے اس طرح میں گھر سے کمیونسٹوں سے الوادع ہو کر اپنے مسلمان لیگی دوستوں کے ساتھ رات نو بجے مغل پورہ پہنچا۔ جلسہ گاہ میں عوام کا بہت بڑا اجتماع تھا مسلم لیگ کے مدار المہام اقبال احمد خان تقریر کر رہے تھے۔ میں نے عوام کا بغور جائزہ لیا تو میں نے دیکھا کہ پولیس کے سپاہی بھی خاصے متحرک تھے۔ مجھے پولیس سب انسپکٹر چوہدری فضل الٰہی کو پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی کیونکہ وہ موچی دروازہ کا رہنے والا تھا مختصر نویسی کا خاصہ ماہر تھا اس لیے وہ جلسے اور جلوسوں کی مکمل رپورٹ خفیہ پولیس کو بھی بھیجتا تھا۔

ایک لحہ میں نے اسے بغور دیکھا دوسرے لمحے وہ میرے قریب آ کھڑا ہوا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی کے انداز میں مجھے بتایا میرے پاس تمہارے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ تمہارے کیا ارادے ہیں میرے ساتھ چلتے ہو یا اپنی مدد کے لیے سپاہیوں کو بلاؤں۔ چوہدری فضل الٰہی مجھے اور میرے خاندان اور برادری کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے میں نے بڑے مہذب طریقے سے جواب دیا چچا جان آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہو گا لیکن میری خواہش ہے کہ مجھے عوامی لیڈر کے طور پر پکڑا جائے۔

چوہدری فضل الٰہی نے مسکرا کر کہا ٹھیک ہے میں تمہیں جلسہ میں تقریر کے بعد گرفتار کروں گا۔ یہ سن کر میرا حوصلہ بڑھا اور میں پورے جوش وجذبہ کے ساتھ پنڈال میں جمع لوگوں کو ایک طرف کرتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا یکدم دانیال لطیفی جو کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کر رہے تھے انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اسٹیج پر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اسٹیج پر پہنچا تو اسٹیج سکریٹری نے میرے لیے ڈائس خالی کردیا۔ چنانچہ میں نے پرجوش لہجے اور گرجدار آواز میں یونینسٹ وزارت پر بے رحمانہ تنقید کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اپنی بھرپور طاقت سے پاکستان کی تحریک کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز کریں۔ اس مختصر تقریر کے بعد جونہی میں نے تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے نیچے قدم رکھے تو مسلم لیگی کارکنوں سے پہلے پولیس کے سپاہیوں نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ پولیس کے اس عمل کے خلاف جلسہ گاہ میں موجود لوگوں نے بڑے نعرے لگائے۔ اس لیے جلسہ کے الٹ جانے کے پیش نظر دانیال لطیفی نے فوراً اسٹیج پر آکر اعلان کیا کہ ہم حکومت پنجاب کے خلاف جہاں سخت احتجاج کرتے ہیں وہاں ہم عبداللہ کو اُن کی گرفتاری پر مبارک باد دیتے ہوئے عزم کرتے ہیں کہ ہم پاکستان حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ عبداللہ کی گرفتاری کوئی نیا سانحہ نہیں ہے جب سے پنجاب میں مسلم لیگ نے سرکار پرست یونینسٹوں کے خلاف جدوجہد شروع کی ہے لیگی کارکنوں پر آئے دن سختیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ مجھے ایک جلوس کی شکل میں مغل پورہ تھانہ میں لایا گیا۔

مغل پورہ لاہور کا واحد تھانہ تھا جہاں یورپین (انگریز) مجرموں کے لیے جدید سہولیات کی حوالات تھی۔ اس حوالات میں رات گزارنے کا لطف آگیا۔ دوسرے دن ہتھکڑی لگا کر کچہری میں لایا گیا۔ جہاں مسلم لیگ کے اعلیٰ کارکنوں نے میری ضمانت کی درخواست دی لیکن مجسٹریٹ نے ضمانت لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا اسے جلد سے جلد تحصیل فانسلا بھیجا جائے۔ جج کے حکم پر مجھے مغل پورہ تھانہ کی بجائے کوتوالی پہنچایا گیا۔ "کوتوالی" میں گزاری رات میرے لیے قیامت کی رات تھی۔ مختصر کمرے میں بیس پچیس آدمی بھیڑوں کی طرح بند تھے۔ ستم یہ کہ اجابت کے لیے بھی کسی کو کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میں نے تمام

رات یہ ہی سوچتے گزار دی تھی اگر جیل اور قید اس کا نام ہے تو کتنے دن اور کتنی راتیں زندہ رہ سکوں گا۔

فاضلکا حوالات---

دن کو مجھے ہتھکڑی پہنا کر کوتوالی پولیس کے حفاظت میں فیروز پور ضلع لے جانے کے لیے لاہور ریلوے اسٹیشن پر لایا گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر میرے خاصے کمیونسٹ دوستوں اور مسلم لیگی کارکنوں نے خفیہ پولیس سے بچ کر دور ہی سے میں مجھے الوداع کہا میں ان کی محبت اور بے بسی کو اپنے بہت قریب پا رہا تھا۔

پولیس مجھے دو تین دن فیروز پور جیل میں رکھنے کے بعد مجھ پر مقدمہ چلانے کے لیے فاضلکا لے آئی۔ فاضلکا تحصیل میں جیل نہیں اس لیے مجھے حوالات میں رکھا گیا۔ یہاں پر مجھے اتفاق سے عام قیدیوں کی بجائے الگ رکھا گیا کیونکہ حوالات میں ایک سیکشن عورتوں کے لیے مخصوص تھا لیکن اس وقت ایک بھی خاتون مجرم حوالات میں نہیں تھی اس لیے مجھے یہاں ڈھائی تین مہینے الگ ایک سیاسی قیدی کے طور پر ٹرائل میں رکھا بعد میں میری مستقل ضمانت لے کر مجھے ہر مقدمہ کی پیشی کا پابند کر دیا گیا۔

فاضلکا حوالات میں مجھے کئی تجربات سے گزرنا پڑا۔ جس نے میرے مطالعاتی علم کے ساتھ میرے مشاہدے میں وسعت پیدا کی۔ فاضلکا حوالات میں مجھے چند ایسے کرداروں سے ملنے کا موقع ملا جنہوں نے مجھے عام سماجی اور معاشرتی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آشنا کیا۔ فاضلکا حولات میں خواتین کی مخصوص بارک میں میں واحد قیدی تھا جو اکیلا رہتا تھا اکیلا مجھے اس لیے رکھا گیا تھا کہ میں نے کوئی قانونی اور اخلاقی جرم نہیں کیا تھا اس لیے حوالات کے تمام قیدی حسب معمول مشقت کا کام بھی کرتے وہ مجھے بڑی حسرت سے دیکھتے میں بارک سے نکل کر چہل قدمی کے لیے حوالات کے ہر حصے میں آ جا سکتا تھا۔

ایک دن ایک لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا بیکانیری نوجوان جس کا نام "رام جی داس" تھا مجھ سے پوچھنے لگا "بابو تم کس طرح ادھر پہنچا"

میں نے جواب دیا مجھے حکومت پنجاب نے اس لیے گرفتار کیا ہے کہ میں نے مسلم لیگ کی حمایت میں تقریر کی ہے۔

لاہور کے ہو؟ اس کا اگلا سوال تھا میں نے چونک کر کہا' "ہاں لیکن تم کو کیسے معلوم ہوا؟"

یہ سیاست ویاست والے سب قیدی وہاں سے ہی آتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں بڑے بڑے وکیل پڑے ہیں جو ایسا دھندہ کرتے ہیں۔

"دھندہ کرتے ہیں کیا مطلب تمہارا؟"

"ہم نے بھی جب کسی علاقے میں قتل یا چوری ڈاکے کی واردات کرنا ہوتی ہے تو لاہور ہی کے وکیل سے پہلے صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ لیکن سنا ہے آج کل سب وکیل سیاسی مقدمات ہی میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔" رام جی داس کی ساری گفتگو میں اُس کا اپنا تجربہ بول رہا تھا۔ چنانچہ میں ہر روز اس کی دلچسپ باتیں سننے کے لیے اس کے پاس پہنچ جاتا۔ اس طرح چند روز میں مجھ پر واضح ہو گیا کہ وہ قتل کے جرم میں یہاں پہنچا ہے اور یہ قتل اُس نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر اس کے شوہر کا کیا تھا اس نے بتایا کہ اُس نے بے شمار قتل کیے لیکن یہ پہلا قتل تھا جو اس نے اپنے پیار کی خاطر کیا تھا۔ اس بار وہ گرفتار بھی اس لیے ہوا تھا کہ اُس نے قتل سے پہلے اپنے وکیل سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا تم نے اس سے پہلے جو قتل کیے اس میں تم کس وکیل سے مشورہ لیتے تھے۔ اس نے بتایا لاہور کا تصدق حسین خالد ہمارا وکیل ہے وہ ہر قتل کے لیے چار سو روپے فیس لیتا ہے اور پھر وہ ہمیں جو طریقہ بتاتا ہے ہم اُس کے مطابق قتل کی واردات کرتے ہیں۔

ایک دن رام جی داس بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور کہا' "آج میری ملاقات آئی میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں۔"

میں جب اُس کے ساتھ ملاقات کے کمرے میں پہنچا تو ایک سانولی سلونی تیکھے نین نقش والی صحت مند عورت کو دیکھا جس نے راجستھانی پہناوا پہن رکھا تھا' یہی اُس کی محبوبہ تھی جس نے اسے بتایا کہ وہ لاہور میں اس کے وکیل سے مل کر آئی ہے اور وکیل اُس کے مقدمہ کی ڈبل فیس مانگ رہا ہے اور یہ یقین دلا رہا ہے کہ یہ رقم رہائی حاصل کرنے بعد دی جائے گی۔

فاملکا حوالات میں لاہور سے میرے رشتے کے چچا شیخ محمد اشرف جو انگریزی میں

اسلامی کتب کے بہت بڑے تاجر اور پبلشر تھے ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا میں نے عبدالمجید سالک سے تمہارے مقدمہ کی بات کی تو وہ پنجاب کے وزیر اعظم خضر حیات ٹوانہ سے تمہاری رہائی کے لیے ملے تو خضر حیات نے کہا اگر عبداللہ یہ یقین دہانی کرا دے کہ آئندہ وہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے گا تو اُس کی رہائی ہو سکتی ہے لیکن میں نے بغیر سوچے سمجھے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔"

فیروز پور جیل---

12 جولائی 1945 کو جج نے میرے مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے مجھے چھ ماہ قید کی سزا سنائی۔ چونکہ میں تین ماہ فانلکا حوالات میں ایک قیدی کی حیثیت سے گزارے تھے اس لیے یہ عرصہ میری سزا سے کاٹ کر مجھے تین ماہ کے لیے فیروز پور جیل بھیج دیا گیا۔

فانلکا سے میں گاڑی کے ذریعے فیروز پور جا رہا تھا کہ راستے ہی میں مجھے امرتسر سے بھیجا ہوا ٹیلی گراف موصول ہوا جس میں 7 جولائی 1945 کو میرے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تھی۔

جولائی سے اکتوبر تین ماہ فیروز پور جیل کے دوران بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں جنہوں نے ہندوستان کی سیاست کو بدل کر رکھ دیا۔

جہاں تک دوسری عالمی جنگ کا تعلق ہے مئی تک یہ یورپی ممالک میں ختم ہو گئی تھی۔ لیکن ایشیا میں خاص طور پر شمال اور جنوب میں جاپان روس چین اور ہندوستان ابھی اس کی زد میں تھا۔

14 جولائی کو شملہ کانفرنس کے خاتمہ پر مولانا ابوالکلام آزادؒ نے پریس کانفرنس میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کانگرس جاپان کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرنے کو تیار تھی لیکن انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ ایشیا کے کسی ملک کو غلام بنانے میں دامے درمے برطانوی حکومت کی ہرگز مدد نہ کرے گی۔ انہوں نے سارا الزام مسلم لیگ کے سر تھوپ دیا اور برطانوی حکومت سے اپیل کی کہ کسی تذبذب کے بغیر مذہبی جماعتوں کو نظرانداز کر دیا جائے جبکہ مسٹر جناح نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ کانگرس ایک ہندو جماعت ہے اور اس کا مقصد ہندوؤں کی قومی آزادی ہے انہوں نے

ویول پلان کو مسلمانوں کے لیے ایک جال سے تعبیر کیا جس میں پھنس جانا "پاکستان" کو کھٹائی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد 3 اگست کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ نے میجر شوکت حیات کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ جس میں میاں ممتاز دولتانہ جنرل سکریٹری صوبائی مسلم لیگ نے فوری الیکشن کا مطالبہ کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان کس کے ساتھ ہیں اور آیا لیگ کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس سے کانگرس کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ متحد ہو کر ہی آزادی کی جنگ جیت سکے گی۔ لیکن برطانوی حکومت کانگرس مسلم لیگ اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے تضادات سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اگست میں جاپان پر اتحادیوں کے حملے شدت اختیار کر گئے یہاں تک کہ امریکہ نے 6 اگست 1945 کو جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا اور پھر ٹھیک تین دن بعد 9 اگست کو دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرا کر شہر کو تباہ کر دیا۔

16 اگست کو جنگ کا مکمل خاتمہ ہوگیا نئی صورتحال کے پیش نظر وائسرائے ہند لارڈ ویول صلاح مشورہ کے لیے لندن روانہ ہو گئے اس وقت لندن میں انتخابات کے نتیجے میں کنزرویٹو پارٹی کو شکست ہو چکی تھی۔

سر ونسٹن چرچل جو دوسری عالمی جنگ کے دوران برطانیہ کے نجات دہندہ تصور کیے جاتے تھے اپنی وزارت کھو چکے تھے اور لیبر پارٹی کے قائد مسٹر اٹیلی نئے وزیراعظم منتخب کر لیے گئے تھے۔ لندن میں وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی انتخابات کے لیے آئندہ موسم سرما کی تجویز دی۔ ستمبر میں وائسرائے ہند لارڈ ویول ہندستان لوٹے اور انہوں نے حکومت برطانیہ کے آئندہ مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کے مستقبل کا دارومدار انتخابات کے نتائج پر ہے۔ اس پر مسلم لیگ کے قائداعظم محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ ہم یہ انتخابات پاکستان کے سوال پر لڑیں گے۔

اکتوبر میں جب میں فیروز پور سے رہا ہو کر لاہور پہنچا۔ لاہور ہمیشہ سے تہذیبی ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں کا گہوارہ رہا ہے' ان دنوں سیاسی افق پر بے شمار تبدیلیاں آ رہی تھیں۔

اکتوبر ہی میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل پی سی جوشی نے اعلان کیا کہ تمام کمیونسٹ جو کانگرس میں ہیں مستعفی ہو جائیں۔ اکتوبر ہی میں میاں افتخار الدین نے کانگرس سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔

مسلم لیگ میں میاں افتخار الدین کی شمولیت کا پس منظر بڑا ڈرامائی تھا کیونکہ انہوں نے اگست میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بمبئی اجلاس میں جو ایک اہم مسئلہ "پاکستان اور مسلمانوں کا حق خود ارادیت" اٹھایا تو اس وقت انڈین نیشنل کانگرس کمیٹی میں نو کمیونسٹ ممبر اور ان کے علاوہ ایک دو جو آزاد خیال تھے سب کے سب میاں افتخار الدین کے ممد و معاون تھے۔ اس لیے کانگرس ورکنگ کمیٹی نے سرکاری طور پر سیاسی صورتحال کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی جس میں کمیونسٹ اراکین کے کہنے پر ایک ترمیم بھی کی گئی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کو مختلف قومیتوں کا ملک تسلیم کرتے ہوئے ہر قوم کے حق خود ارادیت اور حق علیحدگی کو تسلیم کرتے ہیں۔ کمیٹی میں میاں افتخار الدین نے کمیونسٹوں کے اس موقف کی پر زور تائید کرتے ہوئے ایک دھواں دھار تقریر بھی کر ڈالی۔ جس کے جواب میں ولبھ بھائی پٹیل نے کہا "ایسا جوش و جذبہ رکھنے والے کو کانگرس میں نہیں مسلم لیگ میں ہونا چاہیے۔"

اس طرح میاں افتخار الدین کانگرس سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اکتوبر میں میری رہائی اور میاں افتخار الدین کی مسلم لیگ میں شمولیت کی خوشی میں پنجاب مسلم لیگ نے موچی دروازہ کے باغ میں ایک استقبالی جلسہ منعقد کیا جس میں نواب ممدوٹ میاں ممتاز دولتانہ راجہ غضنفر علی اور نواب زادہ رشید علی خان نے تقریریں کرتے ہوئے ہمیں خراج عقیدت پیش کیا۔

نومبر میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر بمبئی سے شائع ہونے والے پارٹی کے ہفتہ وار ترجمان "قومی جنگ" (اُردو) اور "پیپلزوار" انگریزی کی جگہ "نیا زمانہ" کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا تو ایڈیٹر سید سجاد ظہیر نے واضح طور پر لکھا "قومی جنگ" جولائی 1942 میں جاری ہوا۔ قومی جنگ نے قومی اتحاد قائم کرنے میں ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعتوں کانگرس اور لیگ کو متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ دونوں مل کر تمام جماعتوں کی متحدہ قومی حکومت قائم کر سکیں اور ہندوستان کو بیرونی

اور اندرونی خطروں سے بچالیں۔ "قومی جنگ" نے ان بدگمانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو کانگرسی بھائیوں کے دل میں لیگ کے خلاف اور لیگی بھائیوں کے دل میں کانگرس کے خلاف تھیں۔ "قومی جنگ" نے کانگرسی بھائیوں کے سامنے "مطالبہ پاکستان" کے جمہوری پہلوؤں کو اجاگر کیا اور لیگی بھائیوں سے کانگرسی رہنماؤں کی رہائی کے مطالبہ کی حمایت کی۔ جنگ کے ختم ہونے پر دنیا میں ایک "نئے زمانے" کا آغاز ہو رہا ہے۔ ہر جگہ آزادی کی نئی نئی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ یورپ کے ہر ملک میں عوام کی جمہوری قوتیں رجعت پسندوں کو پسپا کر رہی ہیں ہندوستان میں بھی ہمیں آزادی کے لیے تمام محب وطن جماعتوں کا متحدہ محاذ بنانا ہے تاکہ ملک کی آزادی پسند طاقتوں سے برطانیہ اور امریکہ کے جمہوریت پسند عوام سے سوویت یونین اور چین سے مل کر ہم سامراجی نظام کی گرتی ہوئی عمارت کو مسمار کر سکیں یہی ہندوستان کی آزادی کا راستہ ہے۔

"نیا زمانہ" اس آزادی سچائی اور انصاف کی آواز بن کر عوام کی جدوجہد کی حمایت کرے گا تاکہ نئے عہد میں ہندوستان کے لوگ سچی آزادی اور خوشحال زندگی بسر کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ "نیا زمانہ" کے ہمدرد اور مددگاروں کی تعداد "قومی جنگ" سے بڑھ جائے گی۔

نئے انتخابات

نئے انتخابات کے لیے پنجاب مسلم لیگ کے اُمیدواروں کی حتمی فہرست کے لیے پنجاب مسلم لیگ کے صدر ممدوٹ اور جنرل سکریٹری دولتانہ نے پنجاب کا دورہ کیا مجھے اسسٹنٹ کے طور پر ممتاز دولتانہ نے اپنے ساتھ رکھا تاکہ میں مکمل ریکارڈ رکھ سکوں۔ پنجاب کے اس دورے سے مجھے پنجاب کی روایتی جاگیردار خاندانوں کی سیاست کا بغور جائزہ لینے کا موقع ملا جیسا کہ ملتان ڈویژن میں جہاں گیلانی' قریشی گردیزی اور گرمانی خاندان تھے سب سیاسی گروہ بندیوں اور دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ کیسے پہلے یونینیسٹ پارٹی اور پھر بعد میں مسلم لیگ پر اثرانداز ہوئے۔ ملتان میں گیلانی خانوادہ مسلم لیگ کا طرفدار تھا۔ جبکہ قریشی خاندان یونینیسٹ پارٹی کا خیر خواہ تھا۔

پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری ممتاز دولتانہ کی قریشی خاندان سے زیادہ قرابت تھی اس لیے مظفر گڑھ کے مشتاق احمد گرمانی جو اس وقت سرکاری ملازم تھے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک نشست میں شامل ہوئے۔ اس طرح سرگودھا میں قریشیوں اور ٹوانوں کی سیاسی محاذ آرائی میں سرگودھا کے نواب محمد حیات قریشی جو ممتاز دولتانہ کے خاندان کے سمبندھی تھے۔ خضر حیات ٹوانہ کے خلاف محاذ آرائی میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ ممتاز دولتانہ سے پنجاب کی جاگیردارانہ خاندانی سیاست پر اکثر گفتگو ہوتی رہتی تھی اور ہم اکثر ہنسا کرتے تھے۔ لاہور میں اس کی سب سے بڑی مثال آرائیں برادری میں اس وقت میاں افتخار الدین کی تھی جو کانگرس سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں آئے تھے۔ میاں افتخار الدین ایک منجھے ہوئے لیفٹسٹ اور مارکسٹ مانے جاتے تھے۔ اس کے باوجود باغبانپورہ کی آرائیں برادری کی اندرونی سیاست میں خاندانی وجاہت کے حسد اور جلن نے کبھی کسی کا پیچھا نہیں چھوڑا کیونکہ میاں افتخار الدین کے سیاست میں ابھرنے سے پہلے باغبانپورہ کے سیاسی افق پر سر محمد شفیع کی قیادت مسلمہ تھی اور سرکار و دربار میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنی بیٹی جہاں آرا (بیگم شاہنواز) کو رموز سیاست کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ اسی بنا پر جہاں آرا نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی تھی لیکن 1936 میں جب میاں افتخار الدین سیاست میں ایک لیفٹسٹ اور کانگرسی قوم پرست بن کر متحرک ہوئے تو باغبانپورہ آرائیں برادری میں ایک نئی سیاسی چپقلش کا آغاز ہوا۔ ایک خاندان سرکار پرستی میں حد سے آگے گزر گیا اور دوسرے خاندان نے سرکاری مخالفت کا چولا پہن لیا۔

نئے انتخابات کے لیے لاہور کے شہری اور زنانہ حلقے سے دو نشستیں تھی ان دو نشستوں کے لیے میاں بشیر احمد اور بیگم شاہنواز دو امیدوار تھے۔ اس وقت لاہور میں زنانہ نشست کے لیے مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لیے بیگم میاں افتخار الدین نے درخواست بھی دے رکھی تھی۔

بیگم شاہنواز اور میاں بشیر احمد نے باقاعدہ مسلم لیگ کے دو اخبارات "احسان" اور "زمیندار" میں نہ صرف کیمونسٹوں کے خلاف بے بنیاد خبریں بلکہ مضامین تک شائع

کروانے شروع کر دیئے یہاں تک کہ بیگم شاہنواز اور میاں بشیر احمد کے چند حمائتیوں نے قائداعظم کے نام ایک تار بھیجا کہ خدارا پنجاب مسلم لیگ کو کیمونزم سے بچایا جائے۔

پنجاب مسلم لیگ کے مرکزی دفتر لاہور سے رجوع کرنے سے زیادہ میاں بشیر احمد نے پارلیمنٹری بورڈ کے ہر ممبر کے پاس ہر قسم کی سفارشیں پہنچائیں بلکہ خود جا جا کر خوشامدیں بھی کیں بلکہ بعض پارلیمنٹری بورڈ کے ممبران پر مختلف قسم کا دباؤ ڈلوایا گیا تب جا کر بیگم شاہنواز کو ٹکٹ دیا گیا لیکن لاہور کے شہری حلقہ کے لیے میاں بشیر احمد کی بجائے میاں عبدالعزیز مالواڈہ کو ٹکٹ دیا گیا۔ یونینسٹ حکومت نے میاں عبدالعزیز کے کاغذات مسترد کر دیئے تو آزاد اُمیدوار میاں محمد رفیق کو مسلم لیگ کا اُمیدوار نامزد کیا گیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔

لاہور کے شہری حلقہ سے ٹکٹ کی ناکامی کے بعد میاں بشیر احمد نے ملتان کے ایک ایسے دیہی علاقہ کے حلقہ سے ٹکٹ کی درخواست کی جس حلقہ سے عطاءاللہ جہانیاں پہلے ہی اپنی درخواست پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کو دے چکے تھے اور بورڈ کے اکثر ممبران بھی عطاءاللہ جہانیاں کو ٹکٹ دینے کی حمایت کر چکے تھے۔ لیکن میاں بشیر احمد نے عطاءاللہ جہانیاں سے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے پارلیمنٹری بورڈ کے سامنے پنجاب کے ایک انگریزی اخبار "ایسٹرن ٹائمز" کا اداریہ پیش کیا جس میں لکھا تھا عطاءاللہ جہانیاں مالا بار ہل (قائد اعظم کی رہائش گاہ) کی بجائے سانڈھرسٹ روڈ یعنی کیمونسٹ پارٹی کے دفتر کی ہدایات پر کام کرتا ہے اور وہ کیمونسٹ پارٹی کا ایجنٹ ہے۔ "ایسٹرن ٹائمز" کے اس اداریئے کے خلاف پنجاب کے اُردو اخبار "نوائے وقت" نے بھی اداریہ لکھا۔ جس میں اخبار نے اس خبر کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے کہا اگر کیمونسٹ مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہیں تو انہیں کام کرنے اور عہدیدار بننے کی اجازت دی جائے لیکن مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انہیں اسمبلی کا ممبر ہرگز نہ بننے دیا جائے۔

پنجاب مسلم لیگ کا مینی فیسٹو

عطاءاللہ جہانیاں پر کیمونسٹ پارٹی کی ہدایات پر کام کرنے اور پارٹی کا ایجنٹ والا

الزام بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ مسلم لیگ مینی فسٹو کے متعلق مسلم لیگ کے رجعت پسند رہنماؤں نے ہمیشہ لگایا ہے۔ جیسا کہ پنجاب مسلم لیگ مینی فسٹو کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ جنرل سکریٹری ممتاز دولتانہ نے نہیں بلکہ کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری پی سی جوشی نے مرتب کیا ہے۔

پنجاب مسلم لیگ کا مینی فسٹو 1944ء کی گرمیوں میں ہی بننا شروع ہوا تھا۔ کیونکہ سخت گرمیوں کی وجہ سے ممتاز دولتانہ اپنے آفس سیکریٹری دانیال لطیفی اور مجھے اپنے ساتھ سری نگر لے گئے تاکہ وہاں دلجمعی سے مینی فسٹو کے مسودہ پر کام کیا جاسکے۔ سری نگر میں ہمارا قیام دو منزلہ عمارت میں تھا اوپر کی منزل صرف رہائش کے لیے اور نچلی منزل کام کے لیے وقف تھی۔ ایک دن نچلی منزل میں پہنچا تو ایک کمرے میں ممتاز دولتانہ اور میر نور احمد جو یونینسٹ پارٹی کے محکمہ اطلاعات میں پبلک ریلیشن آفیسر تھے بیٹھے مینی فسٹو کے مسودہ پر بات چیت کر رہے تھے۔ اس طرح چند روز کے بحث و مباحثہ کے بعد ممتاز دولتانہ اور دانیال لطیفی مینی فسٹو کے مسودہ پر تفصیلی کام نمٹا کر لاہور واپس آ گئے۔ مسودہ ورکنگ کمیٹی میں پیش کر کے منظور کرایا گیا۔ مینی فسٹو کی انگریزی عبارت ممتاز دولتانہ کی انگریزی دانی کی عمدہ مثال تھی۔ انگریزی زبان میں لکھے اس مینی فسٹو کو جب اُردُو میں ترجمہ کے ساتھ شائع کرنا طے پایا تو راجہ غضنفر علی خان نے اردو ترجمہ کے لیے امتیاز علی تاج کا نام تجویز کیا۔ سب جانتے تھے امتیاز علی تاج اور راجہ غضنفر علی خان کلاس فیلو اور پکے دوست تھے۔ اس لیے فوراً اس تجویز کو مان لیا گیا۔ اور میں نے انگریزی ٹائپ شدہ مینی فیسٹو کی کاپی امتیاز علی تاج تک پہنچائی۔

میاں بشیر احمد ملتان کے اس حلقہ سے بھی ٹکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے اور آخرکار فیروزپور کی تحصیل زیرہ سے اُنہیں ٹکٹ دیا گیا اور وہ کامیاب بھی ہو گئے جبکہ یونینسٹ پارٹی کے امیدوار معروف زمیندار اللہ دتہ آف کیسر گڑھ کو شکست ہوئی۔ اسی نشست سے کانگرس کے امیدوار مولانا عبدالجبار غزنوی کو یہ ٹکٹ مولانا داؤد غزنوی نے دیا جو میاں افتخار الدین کے کانگرس سے مستعفی ہونے کے بعد پنجاب کانگرس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی نے کانگرس کے ٹکٹ پر امرتسر سے انتخاب لڑا۔

میاں دولتانہ نے خود اپنے لیے ضلع سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے حلقے کو پسند کیا 1937ء کے انتخابات میں اس حلقے سے چوہدری سر شہاب الدین یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ انتخابات کے دوران لاہور میں پنجاب مسلم لیگ کے مرکزی دفتر جو رائل پارک سرور ہوٹل کے عقب میں تھا کی بجائے دولتانہ ہاؤس مسلم لیگ کی ساری سیاست کا مرکز تھا۔ پنجاب کے تمام سیاسی رہنما اور کارکن ادھر کا ہی رُخ کرتے تھے۔ میزبانی کے فرائض الماس دولتانہ ادا کرتی تھیں۔ وہ براہ راست سیاست میں دخل نہیں دیتی تھیں لیکن بالواسطہ طور پر وہ سیاست میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ میری اکثر شامیں بلکہ راتیں اُدھر ہی گزرنے لگیں میں نے ممتاز دولتانہ کے ساتھ ان کے انتخابی حلقے میں چند روز انتخابی مہم میں حصہ بھی لیا۔

انہی دنوں لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کی طرف سے ایک نوٹس موصول ہوا جو میری والدہ چھوٹے بھائی عبدالرؤف اور میرے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ امپرومنٹ ٹرسٹ آپ کی اراضی واقع موضع گوال منڈی کو لینڈ ریکوزیشن کے تحت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو وہ ایک ماہ کے اندر دفتر کو بھیجیں' اس نوٹس نے ہمارے چھوٹے سے کنبہ کو خاصا پریشان کر دیا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے پارٹی کے ایک ہمدرد وکیل باوا... سے اس نوٹس کے جواب کے لیے مشورہ کیا تو انہوں نے ہمارے کنبہ کی طرف سے تفصیلی اعتراضات اٹھا کر دفتر کو جواب بھیج دیا۔

اس نوٹس نے مجھے خوابوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت کے سامنے لا کھڑا کیا۔ سیاسی سرگرمیوں نے مجھے یکدم جو گھریلو ذمہ داریوں سے بالکل کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ دوبارہ اس سے جوڑ دیا۔ اب میں نے عملی طور پر سیاست سے الگ ہو کر فکری سطح پر اپنی سرگرمیوں کو تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے باری علیگ سے جب مالی طور پر کچھ پریشانیوں کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے میرے مزاج کے مطابق کسی اخبار میں نوکری کرنے کو کہا۔ اور میں نے پوری سوچ بچار کے بعد جب اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو وہ مجھے حمید نظامی کے پاس لے گئے اور ان سے میرے متعلق بات چیت کی تو حمید نظامی نے کہا ہمارے روزنامے "نوائے وقت" میں کسی رپورٹر یا ایڈیٹر کی تو گنجائش نہیں البتہ کچھ کام "لیٹر ٹو ایڈیٹر" کو ایڈٹ کرنے کا نکل سکتا ہے۔ حالات کے پیش نظر میں نے اس کام

کے لیے بھی ہامی بھرلی۔ مجھے صبح کی شفٹ میں رکھا گیا۔ ظہور عالم شہید اور گوپال متل شفٹ انچارج تھے۔ اسی نوکری کے دوران انتخابات مکمل ہوئے۔ پنجاب مسلم لیگ کو اپنے صوبے میں سب سے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

انتخابات کے نتائج کے بعد پنجاب پارلیمنٹری لیڈر کے لیے افتخار حسین ممدوٹ اور فیروز خان نون دو امیدوار سامنے آئے۔ افتخار حسین نواب آف ممدوٹ تو پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے جبکہ فیروز خان نے سرگودھا سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات جیتے تھے۔ وہ 15 ستمبر 1945ء کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کرنے کے بعد لاہور پہنچے تو مسلمانوں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ اس بار فیروز خان نون کی پشت پناہی حمید نظامی اور ان کا اخبار "نوائے وقت" کر رہا تھا۔ جبکہ افتخار حسین ممدوٹ کی حمایت میں ممتاز دولتانہ سب سے آگے تھے۔ ان دنوں میں "نوائے وقت" میں ملازمت کر رہا تھا اور میری ڈیوٹی صبح دس بجے سے پانچ بجے شام تک تھی۔ ان دنوں ممتاز دولتانہ اور بیگم الماس دولتانہ کا معمول تھا کہ وہ پانچ بجے گاڑی لے کر میرے دفتر کے سامنے آ کھڑے ہوتے اور پھر ہم ممدوٹ کی حمایت کے لیے مسلم لیگیوں سے ملتے تھے۔

لاہور میں نواب ممدوٹ کا محل نما "ممدوٹ ولا" ڈیوس روڈ پر واقع تھا اور ان دنوں وہاں خاصی گہما گہمی تھی جبکہ فیروز خان نون نے فلیٹیز ہوٹل میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایک روز "ممتاز ہاؤس" میں بہت سے مسلم لیگی جمع تھے کہ آخر انہوں نے پارلیمنٹری لیڈر کے لیے قائداعظم کی رائے پر اتفاق کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ قائداعظم سے ٹیلیفون سے رابطہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس وقت شیلانگ میں ہیں۔ چنانچہ وہاں کا ٹیلی فون نمبر لیا گیا۔ ممتاز دولتانہ نے مجھے ٹیلی فون آپریٹر کے پاس بٹھا دیا کہ جوں ہی قائداعظم آن لائن ہوں ہمیں بلاؤ۔ ممتاز دولتانہ لیگی رہنماؤں کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

رات کے دو ڈھائی بجے شیلانگ سے قائداعظم آن لائن کا جب پیغام موصول ہوا تو فوری طور پر ممتاز دولتانہ بھاگتے ہوئے آئے اور ریسیور کان سے لگا کر ہیلو' ہیلو' ہیلو چلانے لگے اور پھر یکدم ان کے لہجے میں تعظیم اور احترام چھلکنے لگا تو سب نے سمجھا واقعی

"قائداعظم آن لائن" ہیں۔ سب نے اپنی اپنی سانس روک لی' ممتاز دولتانہ نے پارلیمنٹری لیڈر کے لیے صرف دو جملے کہے اور پھریس یس'یس سر کے الفاظ کے ساتھ تھینک یو کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اور پرجوش آواز میں اعلان کیا کہ قائداعظم نے ممدوٹ کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ جسے سب نے خوشی سے قبول کر کے انہیں مبارک باد دی' اس خبر کو سنتے ہی فیروز خان نون' ممدوٹ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

انتخابات میں مسلم لیگ کی زبردست کامیابی

انتخابات 1946ء میں مسلم لیگ نے 74 کانگرس نے 51 یونینسٹ پارٹی نے 21 اور اکالی دل نے 21 نشستیں جیتی تھیں۔

پنجاب کے گورنر نے مسلم لیگ کی بجائے خضر حیات ٹوانہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ تو پنجاب مسلم لیگ کے صدر اور پارلیمنٹری لیڈر افتخار حسین نواب ممدوٹ نے گورنر کے اس عمل کو غیر آئینی قرار دیا۔ اس کے باوجود 11 مارچ 1946ء کو خضر حیات ٹوانہ نے یونینسٹ کانگرس اور اکالی دل کے تعاون سے ایک سانجھی وزارت تشکیل دی۔ 24 مارچ کو کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا۔

اپریل میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور صوبائی و مرکزی اسمبلیوں کے نو منتخب شدہ اراکین کا مشترکہ اجلاس دہلی کے امپیریل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ اس میں لاہور ریزولیشن (قرارداد لاہور) میں ترمیم کا فیصلہ ہوا کیونکہ قرارداد لاہور میں جو مسلم آزاد ریاستوں کا ذکر تھا اس کی جگہ اب ایک مسلم ریاست کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہم جب دہلی پہنچے تو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے ترقی پسند مسلم لیگیوں نے اس ترمیم کو مختلف مسلم خطوں کی جمہوری آزادی پر قدغن تصور کرتے ہوئے اس کی مخالفت کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں بنگال کے ترقی پسند مسلم لیگی مولانا ابوالہاشم کی قیادت میں پیش پیش تھے۔ ہم نے تمام ترقی پسند کونسلروں اور نو منتخب اسمبلی کے اراکین کا ایک مختصر سا خفیہ اجلاس دہلی کے مشہور تاجر اور سماجی شخصیت حاجی رشید احمد کے بیٹے شبیر احمد کے کشمیری گیٹ والے فلیٹ میں بلایا جس میں تقریباً پچاس کے قریب ممبران نے شرکت کی جنھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی سرکاری قرارداد کی مخالفت کا ذمہ لیا لیکن

بدقسمتی سے چند اراکین نے اس کی اطلاع شہید حسین سہروردی اور نوابزادہ لیاقت علی خان کو پہنچا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قرارداد پیش نہ ہو سکی اور سرکاری قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوگئی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہی کہ بہت سے ترقی پسند بنگالی مسلم لیگیوں نے بالخصوص اس نئی قرارداد کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔

دہلی میں جامع مسجد کے میدان میں ایک جلسہ میں جو "یوم فلسطین" کے سلسلے میں ہو رہا تھا میں نے پاکستان کو ایک سیکولر پس منظر میں پیش کیا۔ جبکہ راجہ صاحب محمود آباد نے پاکستان کو خالص ایک دینی، اسلامی ریاست کے طور پر پیش کرتے ہوئے مجھ پر کیمونسٹ نظریات کے مبلغ ہونے کی پھبتی کسی۔ لیکن بیس سال بعد جب میری ملاقات راجہ صاحب سے لنڈن میں ہوئی تو اس وقت ان کے نظریات میں زبردست تبدیلی رونما ہو چکی تھی اور وہ ایک سیکولر پاکستان کے حامی ہو چکے تھے حالانکہ وہ اس وقت لنڈن میں واقع انٹرنیشنل اسلامک سنٹر کے ڈائریکٹر تھے۔

ہندوستان میں اس دور میں مسلمانوں کے اندر جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور ان میں سیاست کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلیوں کی جو لگن اور جستجو دیکھنے میں آئی اُس کے پیچھے ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی اور اس کے کارکنوں کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس لیے ملک گیر سطح پر ترقی پسند اور رجعت پرستوں کے درمیان جو محاذ آرائی شروع ہوئی اُسے رجعت پرستوں نے سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے مل کر اسلام اور کفر کی لڑائی بنا دیا۔ خاص طور پر مسلم لیگ کی سیاست میں پوری شدت کے ساتھ ایسے محسوس کیا جانے لگا۔

مئی 1946ء میں کیبنٹ مشن اور وائسرائے ہند لارڈ ویول نے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے شملہ میں طویل بات چیت کی جسے دوسری شملہ کانفرنس کا نام دیا گیا۔ جون میں آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم کی صدارت میں منعقدہ ایک اجلاس میں وزارتی مشن کی بنی عارضی حکومت میں شرکت کے حق میں سو سے زیادہ ووٹ حاصل کیے جبکہ تیرہ نے اس کی مخالفت کی جس کی قیادت بنگال مسلم لیگ کے سکریٹری مولوی ابوالہاشیم کر رہے تھے۔ جولائی میں مسلم لیگ نے راست اقدام Direct action کا فیصلہ کرلیا۔ اگست ہی میں عبوری حکومت کا اعلان ہوا۔ 2 ستمبر 1946ء کو پنڈت جواہرلال نہرو نے عبوری حکومت کا حلف اٹھایا۔

باب 11

سنگھم پبلشنگ ہاؤس

اپریل میں دہلی کے اجلاس سے واپسی کے بعد راج ہنس کرشن جو گورنمنٹ کالج میں میرے ساتھی اور کمیونسٹ پارٹی کے خیرخواہ تھے انہوں نے مجھے سنگھم پبلشنگ ادارہ میں سرمایہ کاری کا مشورہ دیا۔

سنگھم پبلشنگ ہاؤس لاہور میں ایک ایسا ادبی اشاعتی ادارہ تھا جو دوسری جنگ عظیم کے بعد راج ہنس کرشن، سریندر سہگل اور راجندر سنگھ بیدی نے قائم کیا، لیکن کرتا دھرتا سریندر سہگل تھے۔ اس ادارے میں راجندر سنگھ بیدی کا سالا بھی شامل تھا۔ وہ برما کی جنگ کے دوران پیسہ کما کر لاہور لوٹا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی کے کہنے پر اس نے بھی اس ادارے میں سرمایہ لگا رکھا تھا۔

سنگھم پبلشنگ ہاؤس میں شامل ہونے کے لیے سب سے پہلے میں نے اپنے چچا رفیق جن کے ساتھ میں نے ساجھے داری کے لیے "ادبستان" ایسے اشاعتی ادارے کے لیے اپنی جمع پونجی دے رکھی تھی اس کی واپسی کا تقاضا کیا تو انہوں نے اپنے مالی بحران کا اس قدر دردناک نقشہ کھینچا کہ مجھے خود اس کی حالت پر رونا آگیا۔" چنانچہ کئی روز کی تو تو میں میں اور بک بک کے بعد میں اپنی والدہ سے پانچ ہزار روپے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پانچ ہزار روپے کی میں نے سنگھم پبلشنگ ہاؤس میں سرمایہ کاری کی۔ اس طرح سنگھم کے دفتر میں جانا روز کا معمول بن گیا۔

سنگھم پبلشنگ ہاؤس کا دفتر نسبت روڈ پر دیال سنگھ لائبریری کے ساتھ ساگر ہوٹل کے سامنے تھا۔ یہاں پر بڑا ادبی ماحول تھا روز کسی نہ کسی بڑے ترقی پسند شاعر اور

ادیب سے ملاقات اور گپ شپ ہونے لگی دیوندر ستھیارتھی گوپال متل، کنہیالال کپور، مطلبی فرید آبادی تو یہاں باقاعدگی سے آتے تھے۔ دفتر میں شیر محمد اختر مستقل ملازم تھے ان کا کام خط کتابت، پروف ریڈنگ اور مسودات کی کانٹ چھانٹ تھا۔ راجندر سنگھ بیدی اور میں سارا دن دفتر میں گپ شپ کے علاوہ شیر محمد اختر کا ہاتھ بھی بٹاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم "ساگر ہوٹل میں کھاتے تھے۔"

جون یا جولائی کی ایک سخت گرم دوپہر کو راجندر سنگھ بیدی اس کے سالے اور میں نے "ساگر ہوٹل" میں کھانے سے پہلے بیئر پینے کا پروگرام بنایا بیئر پیتے پیتے ہم نے وہیں شام کر دی اور پھر اس ترنگ میں میں نے سیدھی گھر کی راہ لی۔

جب میں گھر پہنچا تو پہلے تو میری بیوی نے مجھے دیکھ کر انتہائی خوشی کا اظہار کیا لیکن جب مجھے لڑکھڑاتا دیکھا تو اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر تمام گھر والوں کو اکٹھا کرتی میں نے اُسے خاموش رہنے اور اوپر چھت پر کھانا لانے کا اشارہ کیا اور خود بڑی مشکل سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چھت پر کھلے آسمان تلے میں نے چارپائی پر اپنے آپ کو ڈھیر کر دیا۔ معلوم نہیں کب سے میری بیوی بڑی طشتری میں چاول آلو گوشت سے بھرا شوربے کا کٹورا پانی کا جگ اور گلاس لا کر چارپائی کے قریب رکھ کر مجھے جگانے کی کوشش کرتی رہی اور میں بے سدھ پڑا رہا آخر اس نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "اُٹھو نا' اور دیکھو میں تمہارے لیے کھانا لے آئی ہوں۔"

یہ سن کر میں فوراً چارپائی سے اٹھا اور جوتا پہننے کے لیے اپنے پاؤں زمین پر رکھے تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں کسی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا بیوی نے کہا "یہ سب کیا ہے تم نے طشتری میں پاؤں ڈال دیئے میرا تمام نشہ ہرن ہو گیا اور میں نے بیوی سے معذرت کرتے ہوئے کہا آج دوستوں نے شرارت سے مجھے بھنگ پلا دی تھی۔" میری بیوی نے میرے ایسے دوستوں کو جی بھر کر بُرا بھلا کہا اور آئندہ ان سے دور رہنے کو کہا اور پھر مجھ سے زیادہ میری معصومیت سے پیار کرنے لگی اس طرح وہ حسین رات ہم دونوں نے ایک ہی چارپائی پر کھلے آسمان تلے گزار دی۔

دوپہر کو میرا چھوٹا بھائی عبدالروف جب کالج سے گھر پہنچا تو اُس نے بڑا ہنگامہ کھڑا

کر دیا- یہ پہلی بار تھا کہ اس نے بھابھی پر یہ الزام لگایا کہ بھیا کو بگاڑنے میں یہ برابر کی شریک ہے- گھر میں ساس بہو اور دیور بھابھی میں پیار' حسد اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے لبریز روایتی رشتے زندگی کو رواں دواں رکھنے کا ایک بہانا ہوتے ہیں اس طرح دیکھا جائے تو ہمارے گھر میں بھی زندگی اپنے روایتی عمل میں رواں دواں تھی- عبدالروف نے ماں کو بتایا کہ بھیا نے جو پیسہ پبلشنگ ہاؤس میں لگایا ہے اُسے دوستوں کے ساتھ شراب اور کباب کے ساتھ اُڑا رہا ہے- اب اس میں اس قدر دیدہ دلیری آ گئی ہے کہ نشے کی حالت میں سیدھا گھر آنے لگا ہے- یہ سن کر عائشہ کو یقین آگیا کہ میں رات شراب پی کر آیا تھا لیکن والدہ نے جب اُس سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ رات عبداللہ شراب پی کر گھر آیا تھا-؟

عائشہ نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے شراب پی تھی البتہ اُس کی حالت غیر تھی جب میں نے اُن سے پوچھا تو انہوں نے کہا میرے دوستوں نے شرارت سے مجھے بھنگ پلادی تھی-

"لیکن تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟" والدہ عائشہ پر برس پڑیں کہ وہ جھوٹ بولتی ہے- بہو جھوٹ نہیں بول رہی تھی اس لیے اُسے ساس پر غصہ آگیا اور پھر اس کے بعد ساس بہو میں تو تو میں میں شروع ہو گئی-

رات گئے جب میں گھر لوٹا تو میری بیوی سو رہی تھی اور والدہ جاگ رہی تھیں گھر میں قدم رکھتے ہی والدہ نے پوچھا "کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں' مجھے بھوک نہیں میں نے بہانا بنایا-"

"کھا کر آئے ہو؟"

"نہیں' عائشہ کیوں سو رہی ہے؟"

"یہ تم اس سے پوچھو البتہ میں بتلا دیتی ہوں کہ میں کیوں جاگ رہی ہوں میرا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے جی بتلائیں آپ کیوں جاگ رہی ہیں؟"

اس لیے کہ مجھے نیند نہیں آ رہی والدہ نے ہنس کر کہا تو میری جان میں جان آئی- میں نے عائشہ کو جگا کر اُسے کھانا لانے کو کہا کھانے کے دوران عائشہ نے کہا کہ میں آپ سے ناراض ہوں-

کیوں ایسا کیوں ہوا؟ میرے سوال پر اُس نے کہا" آپ مجھ سے بھی جھوٹ بولنے لگے ہیں رات آپ نے کیا ڈرامہ کیا؟"

میں سمجھ گیا میں نے عائشہ سے قسم کھائی کہ میں آئندہ کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ سن کر عائشہ نے خوش ہو کر کہا واقعی آئندہ آپ کبھی شراب نہیں پئیں گے؟"

" شراب تو میں پیوں گا۔"

آپ نے ابھی قسم کھائی ہے۔

"ہاں قسم کھائی ہے جھوٹ نہ بولنے کی لہٰذا میں جب بھی پیوں گا تمہیں بتا دوں گا۔" یہ سن کر عائشہ اپنا سر پکڑ کر رہ گئی۔

سنگھم پبلشرز لمیٹڈ لاہور نے دیوندر ستیار تھی کی مرتب کی گئی ہندوستان کے لوک گیتوں پر لکھے مضامین کی کتاب انگریزی میں "Meet My People" کے نام سے شائع کی، جس کا پیش لفظ ملک راج آنند نے لکھا۔ یہ کتاب Bearl.s.Buck کے نام کی گئی جبکہ ہندوستان کے لوگ گیتوں پر لکھے اردو کے مضامین "گائے جا ہندوستان" جس کا ابتدائیہ راجندر سنگھ بیدی نے 14 اگست کو لکھا۔ ستمبر میں "گائے جا ہندوستان" شائع ہوگئی۔ یہ کتاب "پطرس بخاری" کے نام منسوب کی گئی تھی۔ ہندوستان کے لوک ادب و ثقافت کے ورثے پر لکھی یہ کتابیں اس وقت شائع ہوئیں جب ہندوستان زبردست سیاسی بحران کا شکار تھا۔ مذہبی جذبات کو مشتعل کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان بڑی تیزی سے ہندو، سکھ اور مسلمانوں میں تقسیم در تقسیم ہو رہا تھا۔

سیلف ڈیفنس لیگ برائے خواتین

1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی زبردست کامیابی اور پھر کیبنٹ مشن کی آمد، کانگرس لیگ کا اس سے اتفاق اور پھر مسلم لیگ کا کیبنٹ مشن کی حمایت سے دستبردار ہو کر اپنے حقوق کے لیے "راست اقدام" کو منظم کرنے کا عمل ہندوستان کی سیاست میں ایک نیا انقلاب تھا۔ اس تحریک میں خواتین نے جس طرح کا عملی مظاہرہ کیا اس کے پیچھے بھی کمیونسٹ پارٹی کا بھرپور کردار تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی

نے جنوری 1943ء میں "سیلف ڈیفنس لیگ برائے خواتین" قائم کی جس کی جنرل سیکریٹری کمیونسٹ خاتون کارکن 'پران مہتا تھی۔ اس تنظیم کی پہلی صدر بی بی رگھبیر کور منتخب ہوئیں۔ تنظیم نے بنگال کے قحط زدگان کی مدد کے لیے "ریلیف فنڈ" جمع کیا۔ پنجاب میں غذائی قلت سے نمٹنے کے لیے جب حکومت پنجاب نے بڑے شہروں میں "راشن بندی" کے نفاذ کا اعلان کیا تو کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں کو اپنے اپنے علاقے میں دوسری سیاسی اور سماجی تنظیموں کے ساتھ مل کر محلہ خوراک کمیٹیاں تشکیل کرنے کو کہا گیا تو مختلف شہروں میں خواتین نے مختلف محلوں اور گندم کے ڈپوؤں کے سامنے جلسے کیے۔ محکمہ خوراک کے کئی افسروں سے گندم اور آٹے کی قیمتوں میں کمی کرائی۔ ان دنوں عائشہ نے عملی طور پر سماجی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شادی سے پہلے میری شدید دلی خواہش تھی کہ میری بیوی بھی دوسری کمیونسٹ خواتین کی طرح سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ میری شادی میں بھی چند کمیونسٹ خواتین بارات کے ساتھ امرتسر گئیں ان میں سوریا سنہا' کرملادیوی اور سپلا پران کا نام قابل ذکر ہے۔

شادی کے بعد میں عائشہ کو گھر سے سیر و تفریح کے بہانے اکثر پارٹی کے دفتر میں لے جاتا اور ان سے اس کا تعارف کرواتا تاکہ اس کے اندر بھی سیاسی عمل کی خواہش پیدا ہو۔

عائشہ کو سب سے پہلا موقعہ پنجاب میں محلہ وار راشن کمیٹیوں کی تشکیل کے وقت فراہم ہوا۔ اس نے گھر گھر جا کر خواتین خانہ کو محکمہ خوراک کی نئی پالیسیوں سے آگاہ کیا اور انہیں منظم کرنے کے لیے کافی بھاگ دوڑ کی۔

جولائی 1944ء میں جب میں دانیال لطیفی اور عطا اللہ جہانیاں مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو پنجاب مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری ممتاز دولتانہ نے دانیال لطیفی کو پنجاب مسلم لیگ کا آفس سیکریٹری بنا دیا اور مجھے پنجاب کی سطح پر مسلم لیگ کی عوامی تنظیم بنانے کی ذمہ داری سونپی' اور میرا پہلا دورہ منٹگمری کا تھا۔

"ممتاز ہاؤس" ان دنوں پنجاب مسلم لیگ کی تمام سیاست کا مرکز تھا۔ ان کے ہاں میرا آنا جانا روز کا معمول بن گیا۔ وہاں میں نے سیاست کے ساتھ ساتھ جب علم و ادب

کی محفلیں بھی دیکھیں تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ممتاز دولتانہ اپنی لائبریری میں باقاعدگی سے بیٹھتے تھے۔ دولتانہ کے ساتھ ان کی بیوی الماس سیاست میں براہ راست تو دخل نہیں دیتی تھی لیکن بالواسطہ اس میں برابر کی شریک تھی۔ میں نے عائشہ کو الماس سے اسی لیے ملوایا کہ 1946ء کے انتخابات میں وہ اسے انتخابی مہم میں شریک رکھے۔

"سیلف ڈیفنس لیگ برائے خواتین کی ارکان" خوراک کمیٹیوں' بنگال کے قحط زدگان کی امداد کے لیے فنڈ جمع کرنے' فرقہ وارانہ اتحاد کی مہم کے دوران اسلامیہ کالج اور سکول میں گئیں تو اسکول اور کالج کی طالبات سیلف ڈیفنس لیگ میں شامل ہو گئیں۔ لاہور میں WSDL کے اثر کے تحت خواتین کی ٹیچرز یونین پر بھی کمیونسٹوں کا اثر رسوخ بڑھا۔ خدیجہ منہاج اسلامیہ کالج کوپر روڈ میں میتھ کی لیکچرار تھیں۔ انہوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ خدیجہ منہاج' آمنہ سلطانہ' طاہرہ اور عائشہ پانچ بہنیں تھیں۔ خدیجہ نے عمر سے سلطانہ کی سردار جعفری سے اور عائشہ کی کرتار سنگھ دگل سے شادی ہوئی۔ ویمن سیلف ڈیفنس لیگ نے قحط بنگال اور "غذائی بحران" کے علاوہ پنجاب میں ترقی پسند مصنفین ایسی ادبی تحریک کے علاوہ انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کی ایسی ثقافتی تحریک میں بھی اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔

نسوانی دنیا

آل انڈیا ویمن کانفرنس نے بمبئی سے ایک انگریزی رسالہ ویمن "(Women" کے نام سے شائع کیا تو میرے ذہن میں پنجاب میں ترقی پسند خواتین کی ترجمانی کے لیے ایک ایسے جریدے کا خیال پیدا ہوا جس میں تمام خواتین ہی حصہ لیں۔ اس کی ایڈیٹر بھی خاتون یعنی میری بیوی عائشہ ہو۔ جب میں نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالرؤف سے اس سلسلے میں رائے چاہی تو اس نے بڑے جوش اور جذبے سے چٹکی بجا کر انگریزی میں کہا' "It is fantastic reality" اس طرح اس نے رسالے کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے کر ایک نئے انداز میں میرے خیال کو حقیقت میں بدل دیا۔ یہ تمام تر اُس کی ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ لاہور سے پہلا ترقی پسند خواتین کا نمائندہ رسالہ "نسوانی دنیا" شائع ہوا جس کی ایڈیٹر عائشہ صدیقہ اور جنرل منیجر ریحانہ بانو (عبدالرؤف کا قلمی

نام) تھی۔ کوچہ چابکسواراں سے شائع ہونے والے اس رسالے کا ٹائٹل شمزا نے بنایا۔ شمزا (انور جلال) ہمارے محلے میں پیر گیلانیاں والی گلی میں رہتے تھے۔

"نسوانی دنیا" میں خواتین کی سماجی اور سیاسی زندگی کی باقاعدہ رپورٹیں شائع ہوتی تھیں جنہیں عائشہ ترتیب دیتی تھیں۔ "نسوانی دنیا" نے بہت جلد ہندوستان کے ترقی پسند حلقوں میں اپنا نام اور مقام بنانا شروع کر دیا۔

بمبئی کے مشہور روزنامے بمبئے کرانیکل Bomby Chronicle کے کالم نگار اور ترقی پسند ادیب خواجہ احمد عباس نے اپنے کالم Last Page میں "نسوانی دنیا" اور ایڈیٹر عائشہ صدیقہ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ تین چار شماروں سے تمام علمی ادبی اور سیاسی حلقوں میں "نسوانی دنیا" کو وہ پذیرائی حاصل ہوئی کہ سرکاری سطح پر اس کی ساکھ جمنے لگی۔ میر نور احمد پبلک ریلیشن کے ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر ملک یوسف نے "نسوانی دنیا" کے لیے نیوز پیپر کا کوٹہ منظور کرا دیا۔ تو ہم نے ماہنامہ "نسوانی دنیا" بہو ساس نمبر' شائع کر کے اعلان کیا کہ ساس اور بہو سماجی ادارے کے دو ایسے کردار ہیں جسے انسانی معاشرہ کی بہتری کے لیے نہ صرف سمجھنا بلکہ سمجھانا بہت ضروری ہے۔ ان کرداروں پر صرف خواتین ہی قلم اٹھا سکتی تھیں۔ چنانچہ بہت سی گھریلو خواتین سے اپنے تجربات اور مشاہدات لکھنے کے لیے کہا گیا۔ لیکن گھریلو زندگی پر سماجی پابندیوں کے پیش نظر انہوں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ اس کے بعد مشہور خواتین اہل قلم کو اس مسئلہ پر اظہار خیال کرنے کو کہا تو انہوں نے اس مسئلے پر قلم اٹھانے کی ہامی بھری۔

لیکن ملک کے سیاسی حالات نے یکدم پلٹا کھایا کیونکہ 3 جون 1947ء کو کانگرس اکالی دل اور مسلم لیگ تقسیم ہند پر متفق ہوگئے تھے اور برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلے نے ہندوستان میں انتقال اقتدار کے طریق کار کا بھی اعلان کر دیا۔ اس کے اعلان کے مطابق پنجاب اور بنگال کی صوبائی اسمبلیوں کے دو علیحدہ اجلاس ہونے تھے جس میں ہندو اور مسلم اکثریت کے اضلاع کے ارکان اسمبلی شامل ہونے اور انہیں علیحدہ علیحدہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان صوبوں کو بھی تقسیم ہونا ہے یا نہیں۔ پنجاب اور بنگال کے ہندو اکثریت والے اضلاع کے ارکان اسمبلی نے ان صوبوں کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مشرقی پنجاب ہندو اور سکھوں کا مغربی پنجاب مسلمانوں کا' ہر ایک کے لیے نقل مکانی یا

ہجرت' ہر ایک کے لیے شرنارتھی یا مہاجر ہونا ضروری ٹھہرا۔

فسادات کی آگ

لاہور میں فسادات شروع ہوتے ہی ہمارے محلہ کے نہ صرف غنڈوں ہی نے بلکہ معزز شہریوں نے بھی لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کی کوششیں تیز سے تیز کر دیں۔ چابکسواراں کے متوازی گلی وان وٹا اور کسیرا بازار جہاں سے ہمارا روزانہ گزر ہوتا تھا۔ (وان وٹاں کی گلی خالصتاً ہندو سکھ آبادی پر مشتمل تھی اور کسیرا بازار میں برتن سازی کا کام صرف سکھ ہی کمال ہنرمندی سے کرتے تھے) میں نے وان وٹاں کے سکھ اور ہندوؤں کو مل کر "امن کمیٹی" قائم کرنے کو کہا لیکن پوری فضا اس قدر امن دشمن تھی کہ محلہ کے شرفا نے بھی غنڈوں کو نہ صرف فسادات بلکہ لوٹ مار کے لیے اکسانا شروع کر دیا۔ میں ایسے کئی مسلمان پولیس آفیسروں کو جانتا ہوں جو آتش زنی کے لیے خود غنڈوں کو پٹرول مہیا کرتے تھے۔ غنڈے صرف لوٹ مار کا سامان اِدھر سے اُدھر کرتے تھے۔ انہیں محفوظ جگہ میں سمیٹنے کا کام شرفا اور نیک نام لوگوں کا تھا۔ املاک کی لوٹ مار ہی نہیں بلکہ عورتوں کی عزت اور مجبوری و بے بسی کو میں نے نیزے کی اَنی پر اٹھتے دیکھا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے آج بھی وہ داڑھی والا پولیس آفیسر آ کھڑا ہوتا ہے جس نے نوجوان غنڈوں کو آتش زنی کے لیے پٹرول کا ڈبہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ "تم یہ کرو باقی سب میں دیکھ لوں گا اور جب میں نے اس غنڈے سے پٹرول کا ڈبہ چھیننے کی کوشش کی تو پولیس آفیسر نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "ملکا توں ہٹ جا نہیں تے ایہہ پٹرول تیرے تے تروٹک دیاں گے" یہ سن کر میں کانپ اٹھا اس لیے کہ میں نے شاہ عالمی اور رنگ محل میں ایسے کئی لوگوں کو جلتے دیکھا تھا۔

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ

مرکزی اسمبلی کے انتخابات دسمبر 1945ء اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات جنوری تا اپریل 1946ء تک منعقد ہوئے تو مسلم لیگ اور کانگرس ہی نے اپنے آپ کو

مسلمانوں اور ہندوؤں کی نمائندہ جماعتیں ثابت کیا۔

اس طرح 1946ء کے انتخابات کے نتیجہ میں سندھ اور بنگال میں مسلم لیگ کی حکومتیں قائم ہوئیں لیکن پنجاب میں جہاں مسلم لیگ نے 86 مسلم نشستوں میں سے 75 نشستوں پر کامیابی حاصل کی تھی اور یونینسٹ پارٹی صرف دس نشستیں حاصل کر سکی۔ پنجاب کے گورنر نے پنجاب میں مسلم لیگ کی بجائے کولیشن پارٹی (یونینسٹ' کانگرس اور اکالی دل) کو حکومت بنانے کی دعوت دی اور اس طرح پنجاب کی وزارت عظمیٰ خضر حیات ٹوانہ کے حصے میں آئی۔ اور پنجاب مسلم لیگ اسمبلی کے لیڈر نواب افتخار حسین ممدوٹ کی پنجاب اسمبلی میں ہنگامہ خیز تنقید کے باوجود رواں دواں رہی۔

دسمبر 1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے بھی مرکزی اسمبلیوں میں مسلم نشستوں کو جیت کر ثابت کیا کہ وہ مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔

مئی 1946ء میں کیبنٹ مشن اور وائسرائے ہند لارڈ ویول نے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے شملہ میں طویل مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا۔

مئی 1946ء تک پنجاب میں مسلم لیگ کا صحیح ترجمان ایک بھی اخبار نہیں تھا۔ جو ایک دو اردو اخبار مسلم لیگ کی ہمدردی کے دعویدار تھے وہ بھی مسلم لیگ کی نظری اور فکری اساس کو اجاگر کرنے اور پنجاب کی مسلم لیگ کے موقف کو حکومت کے ایوانوں تک پہنچانے کے لیے کوئی موثر کردار ادا نہیں کر رہے تھے۔ خصوصاً حکومتی زبان کا کوئی اخبار نہیں تھا۔ چنانچہ پنجاب کے بڑے مسلم لیگی سیاسی رہنماؤں جن کا تعلق جاگیردار طبقے سے تھا اور مسلم لیگ کے ہمدرد صنعت کار اور زمینداروں نے مل کر ایک ایسی پرائیویٹ کمپنی بنانے کا فیصلہ کیا جس کے تحت انگریزی زبان میں مسلم لیگ کی نظری اور فکری اساس کو پرنٹ میڈیا کے ذریعے اُجاگر کیا جائے۔

مئی 1946ء میں پروگریسو پیپر لمیٹڈ کے نام سے ایک پرائیویٹ کمپنی قائم کی گئی جس کے سات ڈائریکٹر تھے جن کے نام درج ذیل ہیں۔

1 نواب افتخار حسین ممدوٹ (صدر پنجاب مسلم لیگ لیڈر آف پنجاب مسلم

		لیگ اسمبلی پارٹی)
2	میاں ممتاز محمد خان دولتانہ	جنرل سیکریٹری پنجاب مسلم لیگ ممبر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی
3	سردار شوکت حیات	ممبر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی
4	مسٹر محمد رفیع بٹ	صنعت کار اور بینکر
5	مسٹر سی ایم لطیف	صنعت کار چیئرمین بٹالہ انجینئرنگ کمپنی
6	سید امیر حسین شاہ	زمیندار گجرات
7	میاں افتخار الدین	ممبر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی

اکتوبر 1946ء میں میاں افتخار الدین کو اتفاق رائے سے کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر منتخب کر لیا گیا کیونکہ ان کے پاس کمپنی کے سب سے زیادہ حصص تھے۔

اکتوبر ہی میں مرکزی عبوری کابینہ کی از سر نو تشکیل کی گئی اور مخلوط حکومت میں کانگرس اور لیگ کے مابین محاذ آرائی شروع ہوئی۔ دسمبر تک پنجاب حکومت کے خلاف مسلم لیگ اور کانگرس کے اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ پنجاب حکومت نے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈز اور راشٹریہ سیوک سنگھ پر پابندی عائد کر دی۔ اس کے خلاف مسلم لیگ نے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ تو ایس ایس پی کی قیادت میں 28، 29 جنوری 1947ء کو مسلم لیگی لیڈروں کو مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے گرفتار کر لیا گیا۔ چنانچہ پروگریسیو پیپر لمیٹڈ کی طرف سے ڈیلی انگریزی "پاکستان ٹائمز" کا ضمیمہ شائع کیا گیا۔ اس ضمیمہ کو نہ صرف عوامی سطح پر بلکہ مرکزی اور صوبائی ایوانی سطح پر بھی بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس ضمیمہ نے مسلم لیگ کے کارکنوں، طالب علموں اور خواتین کو اس قدر متحرک کیا جس کی مثال اس سے پہلے شروع ہونے والی تحریکوں میں نہیں دیکھی گئی۔

انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز"

انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کا باقاعدہ اجراء 4 فروری 1947ء سے ہوا۔

اس کے آٹھ صفحات تھے اور قیمت 2 آنے رکھی گئی۔ اخبار کی پیشانی پر قائداعظم محمد علی جناح کا نام بطور فاؤنڈر کے شائع ہوا۔ اخبار کی پرنٹ لائن پر میاں افتخار الدین (ممبر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی) بطور پبلشر اور پرنٹر کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لمیٹڈ پریس کا نام دیا گیا جبکہ فیض احمد فیض کا نام بحیثیت ایکٹنگ ایڈیٹر سامنے آیا۔

انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" نے صحافتی زندگی کا آغاز جن سیاسی حالات اور واقعات کے پیش نظر کیا اس کے ثمرات بڑی تیزی سے سامنے آنے لگے تھے کیونکہ انگریز افسر شاہی کو صرف انگریزی اخبارات کے ذریعے ہی متاثر کیا جا سکتا تھا۔

"پاکستان ٹائمز" کی روز اول کی اشاعت ہی میں قائداعظم محمد جناح نے اس انگریزی روزنامہ کو نہ صرف پنجاب کے مسلمانوں بلکہ تمام ہندوؤں کی خدمت پر مامور کرنے کی اُمید ظاہر کی جبکہ مسلم لیگ کے رہنما راجہ غضنفر علی خان نے کہا کہ "پاکستان ٹائمز" ایک ایسے وقت میں شائع ہو رہا ہے جبکہ مسلمان آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ تمام شمال مغربی پاکستان کی قومی آواز ہو گا جو مسلم لیگ کی پالیسی ہے۔

روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کی اشاعت نے مسلمان صحافتی حلقوں میں مختلف پہلوؤں سے خاصی ہلچل مچائی۔ مختلف قسم کی چہ میگوئیاں ادبی اور صحافتی حلقوں میں سننے میں آ رہی تھیں۔ لاہور کے ادبی حلقوں میں پہلی خبر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری کی تھی جو ریڈیو سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی سنبھالنے کی تھی کہ پطرس بخاری کے لاہور میں آ جانے سے ادبی حلقوں میں ایک نئی طرح کی ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی دوسری خبر فیض احمد فیض کی تھی جو فوج میں کیپٹن بن کے گئے اور کرنل بن کر لوٹے بلکہ لوٹنے سے پہلے "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر بن گئے۔ ادبی حلقوں میں خاص کر ترقی پسند اہل قلم نے تو اس بات پہ خوشی کا اظہار کیا لیکن صحافتی حلقوں میں یہ خبر خاصی تشویش کا باعث بنی کہ فیض احمد فیض ایسے شاعر کو جنہیں صحافت کا معمولی تجربہ نہیں ایک انگریزی روزنامے کا ایڈیٹر کیسے بنا دیا گیا۔ ان کی تان اس پر ٹوٹتی تھی کہ فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر ہے اور کمیونسٹ پارٹی کا خاصا چہیتا ہے اور کمیونسٹ پارٹی 1942ء سے جس طرح مسلم لیگ میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ 1945ء میں جب مشہور کمیونسٹ دانیال لطیفی مسلم لیگ میں شامل ہوا تو پنجاب مسلم لیگ

کے جنرل سیکریٹری ممتاز دولتانہ نے انہیں پنجاب لیگ کے مرکزی دفتر میں آفس سیکریٹری بنادیا تھا۔

پروگریسو پیپر لیمٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر میاں افتخار الدین خود کمیونسٹوں کے بہت بڑے ہمدرد سمجھے جاتے تھے۔ میاں افتخارالدین کی کمیونسٹوں کے لیے بے جا حمایت کے نتیجے ہی میں کانگرس سے علیحدگی ہوئی۔ "پاکستان ٹائمز" کی ایڈیٹری کے لیے فیض احمد فیض کا نام کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "نیازمانہ" کے ایڈیٹر سجاد ظہیر نے دیا ہوگا۔ کمیونسٹوں سے فیض احمد فیض کا رابطہ امرتسر میں مشہور کمیونسٹ پرنسپل صاحبزادہ محمودالظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشیدہ جہاں کے توسط سے ہوا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں فیض احمد فیض انگریزی کے لیکچرار تھے اور اردو شاعری کرتے تھے یہاں ان کی ملاقات سجاد ظہیر سے ہوئی جو پنجاب میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سازی کے لیے آئے تھے۔ لیکن بعد میں بہت جلد یہ ثابت ہوگیا کہ فیض احمد فیض نے یہ ایڈیٹری کسی کی سفارش سے نہیں بلکہ اپنی خداداد صلاحیت سے حاصل کی۔

فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز

فیض احمد فیض اس وقت فوج کے شعبہ اطلاعات میں تھے اور کارواں ہوٹل کناٹ پلیس نئی دہلی میں رہ رہے تھے۔ وہاں سے ہی انہوں نے باقاعدہ میاں افتخار الدین کے نام ایڈیٹر کی آسامی کے لیے درخواست بھیجی۔ اس درخواست کے ساتھ نمونے کے طور پر انگریزی میں ایک اداریہ "Future of ICS" بھی بھجوایا۔

"پاکستان ٹائمز" کی ایڈیٹری کے لیے خواہش مند دوسرے امیدواروں میں کرنل مجید ملک اور آغا عبدالحمید کے نام سننے میں آرہے تھے۔ کرنل مجید ملک کا تعلق فوج کے شعبہ اطلاعات سے تھا اور آغا عبدالحمید آئی سی ایس تھے۔ کرنل مجید ملک لاہور سے شائع ہونے والے پہلے مسلم انگریزی اخبار "مسلم آوٹ لک" کے ایڈیٹر تھے اس اخبار کے مالک مولوی عبدالحق اور پرنٹر پبلشر سید دلاور علی شاہ تھے جو ہمارے محلّہ میں ہماری گلی کے پچھواڑے والی گلی میں رہتے تھے۔ یہ سب مرزائی تھے' لاہور میں جب ہندو پبلشر راج گوپال کے "رنگیلا رسول" شائع کرنے کے خلاف مسلمانوں نے تحریک شروع

کی، تو سید دلاور کو راج گوپال کے خلاف مضمون شائع کرنے پر ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق کرنل مجید ملک کے والد بھی مرزائی تھے۔ اسی بنا پر وہ "مسلم آؤٹ لک" کے ایڈیٹر بنے تھے۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں فوج کے شعبہ اطلاعات میں چلے گئے۔ کیمونسٹ پارٹی نے جب دوسری عالمی جنگ کو "قومی جنگ" قرار دیا تو حکومت برطانیہ نے کیمونسٹ پارٹی پر عائد پابندی اٹھالی تو کرنل مجید ہی کی کوششوں سے فیض احمد فیض فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں پہلے کیپٹن اور پھر کرنل بنے۔

روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کے اجرا سے پہلے میاں افتخار الدین نے اخبار کے عملہ کے سلسلے میں اشتہار دیا۔ اس کے تحت ہی انگریز بریگیڈیئر ڈسمنڈ ینگ (Desmond Young) کا بطور مشیر تقرر کیا گیا۔ بریگیڈیئر ڈسمنڈ ینگ لاہور میں فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرے وہ اپنے ساتھ ایک انگریز خاتون کو بطور سیکریٹری بھی لائے اور یہاں پر ابتدائی عملے کا تقرر کیا کیونکہ وہ خود فوج کے ایک موقر اخبار (Forces Times) فورسز ٹائمز کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اور انہوں نے ہی فیض احمد فیض کی درخواست پر انہیں "پاکستان ٹائمز" کے ادارتی شعبے میں شامل کرنے کی سفارش کی۔ "پاکستان ٹائمز" سول اینڈ ملٹری گزٹ لمیٹڈ پریس سے شائع ہوا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی بلڈنگ مال روڈ پر تھی۔ یہ انگریزی اخبار ایک انگریز کمپنی کا تھا جو انہوں نے سیٹھ ڈالمیا کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ بعد میں سردار بلدیو سنگھ جو مرکزی حکومت میں ڈیفنس منسٹر تھے انہوں نے خرید لیا۔

"پاکستان ٹائمز" جب شائع ہونا شروع ہوا اس وقت مسلم لیگ نے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا آغاز کر دیا تھا اور تمام مسلم لیگی رہنما گرفتار ہو کر جیلوں میں جا چکے تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ کارکنوں طالب علموں اور خواتین کی ایک ایسی سیاسی طاقت تھی جس نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

"پاکستان ٹائمز" نے جس طریقہ سے سول نافرمانی کی تحریک میں خواتین کے کردار کو ابھارا اس نے مسلم حلقوں میں خاص گرمی پیدا کر دی جس کے نتیجے میں متوسط طبقہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے اپنی بہو بیٹیوں کو بے دھڑک پاکستان کے لیے اس سیاسی عمل میں شرکت کی اجازت دے دی۔ بے شک اس کے پیچھے کیمونسٹ پارٹی کی سیلف

ڈیفنس لیگ برائے خواتین کا ہاتھ تھا۔ لیکن بالکل نئی صورتحال سے نمٹنے کے لیے مسلم لیگ کی خواتین نے جس جوش اور جذبے سے عملی سیاست کا مظاہرہ کیا یہ اس دور کی خواتین کے سماجی اور سیاسی شعور کی پیداوار تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستان میں جس طرح ایک نئی عورت نے جنم لیا تھا یہ اس کی بھی ایک نشاندہی تھی۔ اس نئی عورت کے لیے ہی میرے ذہن میں ایسی عورت کے ترجمان رسالے کا خاکہ ابھرا تو میرے بھائی رؤف ملک نے اس میں ایسے رنگ بھرے کہ "نسوانی دنیا" کے نام سے ادبی اور سیاسی حلقوں میں یہ رسالہ ترقی پسند خواتین کا نمائندہ رسالہ بن گیا۔

"پاکستان ٹائمز" 4 فروری 1947ء کو شائع ہوا تو اس کے صرف آٹھ صفحے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں اخباری کاغذ جنگ کی وجہ سے بڑا کمیاب تھا۔ دوسرا پنجاب حکومت کسی بھی مسلم لیگ کے اخبار کے لیے کاغذ کے کوٹہ کی منظوری کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن میاں افتخار الدین نے مرکزی حکومت میں اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر بارہ صفحات کے اخبار کا اخباری کاغذ کا کوٹہ منظور کرا لیا۔ اس کے باوجود پنجاب حکومت نے پورا کاغذ سپلائی نہیں کیا۔ چنانچہ مجبوراً پاکستان ٹائمز کو بارہ صفحات کی بجائے آٹھ صفحات پر شائع کیا گیا۔

"پاکستان ٹائمز" کی اشاعت کے ساتھ چھوٹے بڑے صنعت کار مسلمانوں نے اپنے اشتہارات دینے شروع کیے اس کے ساتھ ساتھ چھوٹے دکانداروں نے بھی اپنے اشتہار دیئے یہ سب انگریزی زبان میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن ہم (میں اور عبدالرؤف) نے "نسوانی دنیا" کا اشتہار اردو میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ 5 فروری 1947ء کی اشاعت میں جو اشتہار دیا اس کی عبارت یوں تھی۔

"اس سے ہندوستان میں ایک نئی عورت جنم لے رہی ہے اس کی آسوں' پیاسوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایک ماہنامہ کی اشد ضرورت تھی یہ ماہنامہ اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔" اس اشتہار میں بیگم شاہ نواز (ایم ایل اے) اور بیگم تصدق حسین (ایم ایل اے) کی آراء بھی دی گئیں کہ خواتین کا یہ رسالہ ہر پڑھے لکھے گھر میں ضرور پڑھا جائے گا۔

"نسوانی دنیا کا اشتہار 5 فروری سے 20 فروری تک پانچ بار شائع کیا گیا۔ فروری میں خواتین نے لارڈ لارنس کے بت پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا اور اسی روز خواتین نے جیل کے سامنے احتجاج کیا۔ چونکہ اس جلوس کا آغاز موچی دروازہ سے ہوا جس کی قیادت بیگم شاہنواز نے کی' مارچ میں اندرون شہر کے تنگ بازاروں میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے دکانیں تباہ ہونا شروع ہوئیں تو ان کی تصاویر اور خبریں اخباروں میں شائع ہونا شروع ہوئیں تو بہت جلد لاہور کے گلی کوچوں میں فرقہ وارانہ فسادات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس آگ نے تمام شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔



اشاریہ

نام : عبداللہ ملک

پیدائش : 10 اکتوبر 1920 کوچہ چابکسواراں لاہور

تصانیف

تاریخ

1۔ سرمایہ داری
2۔ جاگیرداری
3۔ مستقبل ہمارا ہے (پاکستان ترقی پسند مصنفین 1949 کانفرنس)
4۔ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی (1757ء سے 1857ء)
5۔ داستان دارورسن (پاک و ہند کمیونسٹ تاریخ)
6۔ پنجاب کی سیاسی تحریکیں
7۔ قوم پرستی کی تحریکیں
8۔ انقلابی تحریکیں

فوج اور تاریخ

9۔ فوج اور اقتدار اعلیٰ (ابتدائی بحثیں)
10۔ پاکستانی فوج کی ابتداء (بنیادی حقیقتیں)
11۔ فوج اور پاکستان I
12۔ فوج اور پاکستان II ہندو مسلم سکھ فسادات اور فوج کی نفسیات
13۔ فوج اور فوجی شب خون (کمیونسٹ پارٹیاں)

خطوط اور سفر نامے

14۔ شورش بنام عبداللہ ملک
15۔ کیوبا سے چند خطوط
16۔ صوفیہ سے چند خطوط
17۔ پولینڈ سے چند خطوط
18۔ پراگ سے چند خطوط

19۔ ارضِ جنت (سوویت یونین کا سفرنامہ)
20۔ سمرقند و بخارا
21۔ حدیثِ دل (ایک کمیونسٹ کا روزنامچہ)

سوانح نگاری

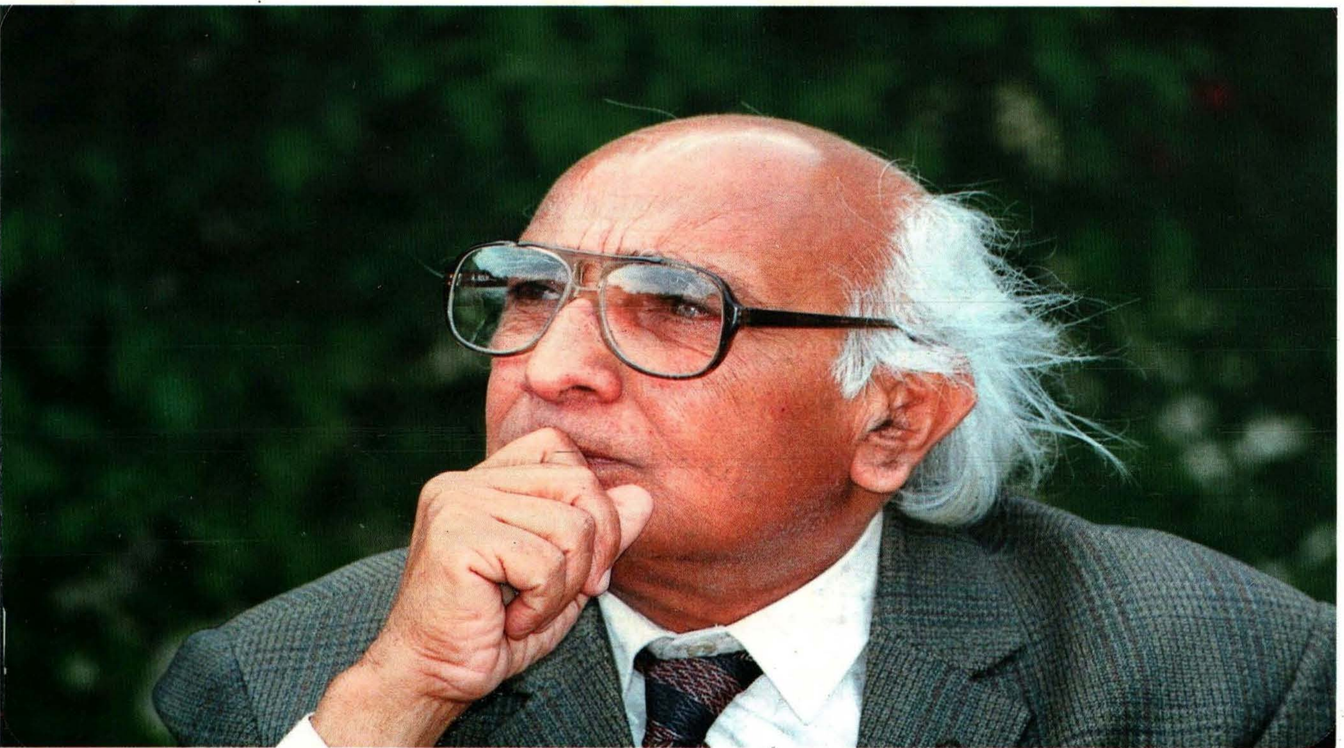
22۔ میاں افتخار الدین (عالمی کمیونسٹ تحریک کے پس منظر میں)
23۔ داستان خانوادہ مولانا احمد علی لاہوری
24۔ مسعود کھدر پوش
25۔ میاں محمد علی قصوری
26۔ جھوٹا مقدمہ سچا ملزم (دیمروف)
27۔ لاؤ تو قتل نامہ میرا (فیض احمد فیض)

سیاسی وادی تجزیئے، تبصرے اور ترجمے

28۔ بے نظیر تین وراثتیں
29۔ بھٹو سے بے نظیر تک
30۔ یہ مفتی یہ مشائخ اور انقلاب افغانستان
31۔ تلخ و شیریں (علمی ادبی تحریریں)
32۔ یورپ امیر کیسے بنا؟ لیو ہوبرمین
33۔ SELECTED SPEECHES AND STATEMENTS Mian Iftikhar-Ud-Din
34۔ امریکہ، فوج اور سیاستدان (منتخب کالم)

ایڈیٹر

ماہنامہ "احتساب" لاہور



عبداللہ ملک　　　فوٹو: اختر مرزا







عبداللہ ملک ، نصیر اے۔ شیخ اور مجید نظامی



عبداللہ ملک کی 65 ویں سالگرہ کے موقع پر ایلس فیض کے ہمراہ



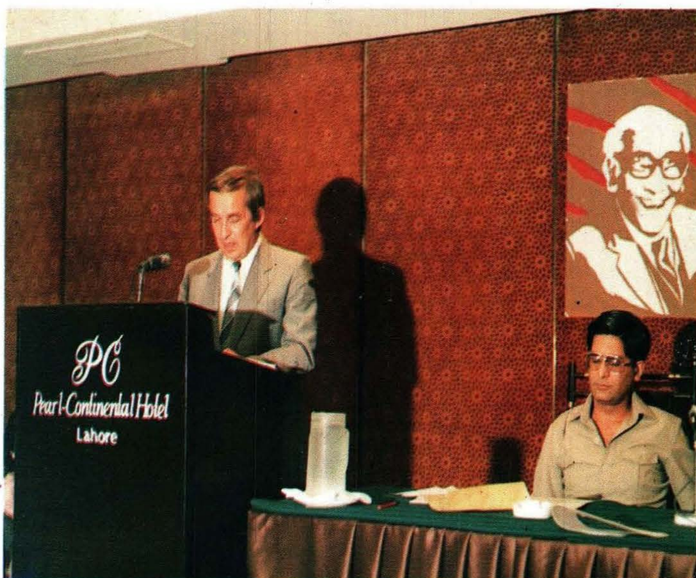
ملک غلام نبی، پروفیسر رضی واسطی، عبداللہ ملک



ملک معراج خالد، عبداللہ ملک، میاں محمد اظہر



عبداللہ ملک، ایلس فیض اور نوابزادہ نصراللہ



65 ویں سالگرہ اعتزاز حسن

سوشلسٹ بلغاریہ کا اتاشی



عبداللہ ملک، احمد راہی، احمد ندیم قاسمی، اے حمید



خالد حسن، عبداللہ ملک



عبداللہ ملک، شورش کاشمیری، سعادت خیالی



عبداللہ ملک اپنی بیگم عائشہ صدیقہ اور دونوں بیٹوں سرمد ملک اور کوثر ملک کے ساتھ



افتخار عارف' عبداللہ ملک' الطاف گوہر' زہرہ نگاہ (لندن)



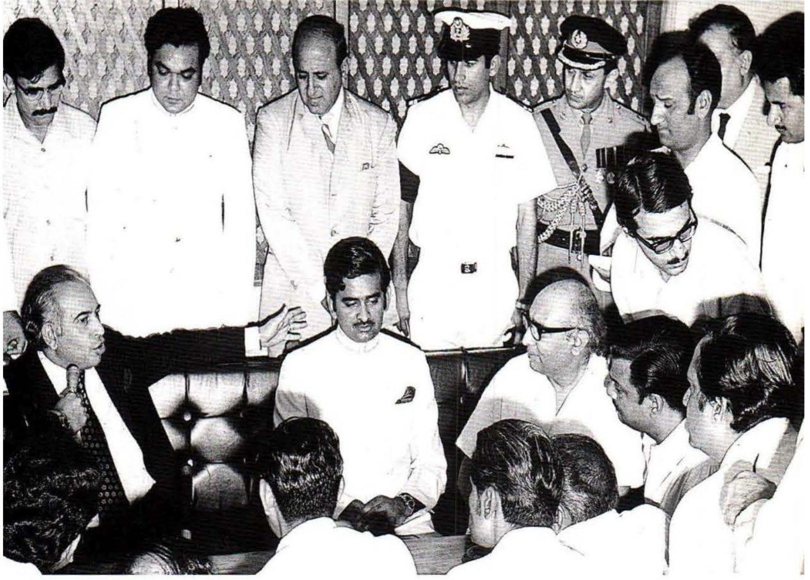
ایوب خان، امیر محمد خان نواب آف کالا باغ



فیض احمد فیض، عبداللہ ملک اور حمید اختر ، آئی اے رحمان



پکنگ ریلوے اسٹیشن 1952 عبداللہ ملک، سیّد مطلبی اور افضل بنگش



ذوالفقار علی بھٹو، غلام مصطفیٰ کھر: 1972ء



ملک معراج خالد چیف منسٹر پنجاب ڈاکٹر مبشر حسن وزیر خزانہ پاکستان حنیف رامے



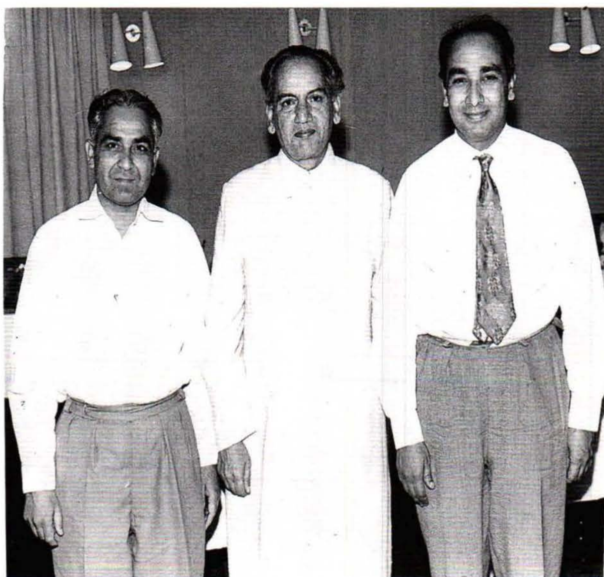
عبداللہ ملک اپنے پوتے عمر ملک کے ساتھ



ڈاکٹر کوثر عبداللہ ملک کی شادی پر سرمد ملک، فیض احمد فیض، ڈاکٹر کوثر ملک، عبداللہ ملک
آفتاب ظفر ملک اور شورش کاشمیری سہرا پڑھتے ہوئے



ائیر کموڈر جنجوعہ، سجاد ظہیر اور ان کی بیٹی نسیم سیّد، عبداللہ ملک اور باقر مہدی لنڈن ائیر پورٹ پر



تین دوست

عبداللہ ملک، فیض احمد فیض اور امجد حسین



کیمونسٹ پارٹی ہیڈ آفس (اجے بھون) دہلی 1988ء



آل پاکستان ترقی پسند کانفرنس 1949ء کے موقع پر عبداللہ ملک بیگم کے ساتھ

عبداللہ ملک اتنے معروف ہیں کہ ان کا "تعارف" کرانا آسان بات نہیں۔ انہوں نے بھرپور زندگی گزاری ہے' ایک صحافی' تاریخ نویس' سماجی کارکن اور پھر ایک سیاسی مدبر —— مگر عبداللہ ملک کی اصل شناخت' اس تحریک سے وابستگی ہے جو ازل سے جاری ہے۔ یہ تحریک لاوارث' لاچار' زیردست اور محروم لوگوں کی آقاؤں' ظالموں اور بالادستوں سے نجات کی طویل جدوجہد کی تحریک ہے۔

عبداللہ ملک نے ساری زندگی لکھا ہے۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک کا کوئی رکن ایسا نہیں جس نے ملک صاحب کو نہ پڑھا ہو۔ زیرِ نظر کتاب ان کی زندگی کی ہی نہیں بلکہ برصغیر اور خصوصاً لاہور شہر کی بھی کہانی ہے۔

میں ملک صاحب کی کتابوں کا زمانۂ طالب علمی سے قاری ہوں اُن کی کتابوں "سرمایہ داری' جاگیرداری اور پنجاب کی سیاسی تحریکیں" سے میں نے سیاسی شعور حاصل کیا اور آج خوش قسمتی سے میں اُن کی خودنوشت شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ خودنوشت اُن کی ابتدائی 27 سال کی ہنگامی زندگی پر محیط ہے۔

یہ کتاب ایک ایسی داستان ہے جسے ایک ایکٹوسٹ نے لکھا —— اس میں تحریک آزادی کے ایسے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں' جنہوں نے بیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ اس کتاب میں 1947ء یعنی تقسیم ہند تک کے واقعات ہیں۔ دوسری جلد تقسیم کے بعد کے عہد کی کہانی ہوگی —— ہماری خواہش ہے کہ ملک صاحب اسے جلد از جلد مکمل کریں۔

لیاقت علی